انعام یافتہ

ادھوری عورت

(ناول)

منزّہ سلیم

ادھوری عورت

منزّہ سلیم

مثال

منزّہ سلیم ۱۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۷۳ء میں زرعی یونیورسٹی لائل پور سے رورل سوشیالوجی میں ایم۔ایس۔سی کی۔ زمانۂ طالب علمی میں یونیورسٹی کے مجلّہ کشتِ نو کے اُردو حصہ کی ایڈیٹر رہیں۔ ۷۲-۱۹۷۱ء میں یونیورسٹی سے بہترین نثر نگار کا انعام حاصل کیا۔ انھیں حلقہ اربابِ ذوق لائل پور کی پہلی خاتون رُکن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ حلقہ کی مختلف نشستوں میں افسانے اور مزاحیہ مضامین پڑھتی رہیں۔

گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین فیصل آباد میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ہیڈ آف سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے طور پر کام کرتی رہی ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں ان کی پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' منظرِ عام پر آئی جسے ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی اور تعلیمی بورڈ سے انعامِ سوم کی حق دار ٹھہری۔

۲۰۱۰ء میں ان کے ناول 'ادھوری عورت' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اسے بھی تعلیمی بورڈ سے انعامِ اوّل حاصل ہوا۔

۲۰۱۱ء میں ان کی تیسری کتاب 'میرا قبلہ تے کعبہ' شائع ہوئی جو انھوں نے اپنے مرحوم منجھلے بھائی ڈاکٹر مقبول اختر کی یاد میں تحریر کی ہے۔

۔ادارہ۔

زیرِ تصنیف

۱۔ دراوڑ تہذیب

زیرِ طبع

۱۔ نہیں ۔۔یں۔۔یں
(افسانے اور فکاہیہ مضامین)

ISBN:978-969-581-063-7
ISBN: 978-969-581-104-7
9789695811047

Misaal PUBLISHERS
misaalpb@gmail.com
Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284

ادھوری عورت

(ناول)

فرخ منظور صاحب کیلئے

منزّہ سلیم

اگست ۲۰۱۶

منزّہ سلیم

ادھوری عورت

(ناول)

منزّہ سلیم

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اشاعت اوّل : 2010

اشاعت دوم : 2011

کتاب : ادھوری عورت (ناول)

مصنفہ : منزّہ سلیم
ہاؤس نمبر 76، سٹریٹ نمبر 2، شادمان ٹاؤن،
سرگودھا روڈ، فیصل آباد، فون: 041-8789494

ناشر : محمد عابد

قیمت : 450 روپے

سرورق : اصبح عاصم

تزئین : عبدالحفیظ

Adhori Aurat

by

Munazza Salem

Edition - 2011

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

انتساب

اپنی نواسیوں 'اصبح اور احلی' کے نام

یہ ننھی ننھی مہتابیاں، جن کی چھوٹ سے

میرے دِل کی دُنیا روشن ہے۔

ناول ایک آئینہ ہے، جو شاہراہ پر چلتے
ہوئے کبھی آسمان کی نیلاہٹیں منعکس کرتا ہے تو کبھی
پاؤں کے نیچے آنے والے کیچڑ کو۔

سٹنڈہال☆

☆'The RED and the BLACK'

Stendhal

یہ اصولی بات ہے کہ ناول کے سبھی
کردار فرضی ہی ہوتے ہیں پھر بھی قارئینِ کرام سے
التماس ہے کہ وہ 'زبردستی' کسی بھی قسم کی مطابقت
تلاش کرنے سے گریز کریں۔

شکریہ

مصنفہ

ع گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں

(فیض)

ماں جایا

('دُکھ بستی' کا دُکھیا باسی)

''ہنستی رہنا، کتاب مکمل کرنا اور سب کا خیال رکھنا۔'' میں نے مسکراتے چہرے اور روتے دِل کے ساتھ، اُن کے سینے سے سر اُٹھایا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کی گئی، اس نصیحت (یا وصیت) کا جواب اِشاروں کی زبان میں دیتے ہوئے، ان کی فکرمندی کو وقتی طور پر دُور کرنے کی ناکام کوشش کی۔ (برین ہیمرج کی وجہ سے ان کی سماعت جاتی رہی تھی۔)

کیا میں یہ سب کچھ کر پاؤں گی؟ ان کی محبت، رہنمائی اور سہارے کے بغیر۔۔۔ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے، جس کا فیصلہ مستقبل کرے گا، ہر اس کام کی طرح، جو ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن، مجھے یہ سب کرنا ہے۔۔۔ اس ساٹھ سالہ 'بچّی' کو۔۔۔ وہ 'بچّی' جوان کے رُخصت ہوتے ہی، یکدم ایک نحیف، تنہا اور عمر رسیدہ بڑھیا میں تبدیل ہو گئی ہے۔۔۔ لمحاتی کرشمہ۔۔۔

میں ذِکر کر رہی ہوں ڈاکٹر بھائی☆ کا (میرے منجھلے اور آخری حیات بھائی) جو

☆ ڈاکٹر مقبول اختر، ماہرِ نفسیات اور دانش ور

میرے لیے باپ، بھائی، دوست، معالج، صلاح کار اور بہترین ساتھی تھے۔ جن کے سہارے میں اپنی زندگی کے دُکھوں، پریشانیوں اور محرومیوں کو برداشت کرتی رہی۔ ناقابلِ برداشت ترین صورتِ حال میں بھی انھوں نے اس انداز سے میری دِل جوئی کی کہ زندگی کے بے پایاں لق و دق صحرا میں، مَیں راستہ نہیں بھولی اور میرے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جمے رہے۔ (دِل جوئی ایک فن ہے، لیکن کتنے ہیں، جو اس سے واقف ہیں؟)

ان سے میرا تعلّق ایسا تھا، جس میں خاموشی بھی زبان بن جاتی ہے۔۔۔ بنا کچھ کہے۔۔۔ بنا کچھ سنے، ہم ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اب کوئی ہم سخن، کوئی ہم زبان مجھے میسّر نہیں آ سکے گا۔ ان کا جانا نوشتۂ دیوار ہے، لیکن اسے پڑھنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں؟

ے تمھی کیوں اُٹھ کے چل دیئے
کہ دیدنی تھا دِن ابھی
اور دیدنی تھی شام بھی

ماضی انمول ہے اور واپسی کا سفر ناممکن۔۔۔

ہم دونوں میں صرف یادوں اور دُکھوں کی سانجھ ہی نہیں تھی، ہم بہت مزے مزے کی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ لطیفہ گوئی، سیاست، انسان دوستی، ادب، شاعری، موسیقی۔۔۔ وہ علم کا خزینہ تھے۔ وہ کیا تھے؟ میرے احساسات کو الفاظ میں مقیّد کرنا ناممکن ہے۔

ے مر گئے ہم، تو یہ کتبے پہ لکھا جائے گا
سو گئے آپ، زمانے کو جگانے والے

میں اپنی پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' ان کی motivation کی وجہ سے لکھ پائی اور کچھ یوں کہ میری اس کاوش کو تمام قارئین نے اپنا دُکھ جانا۔۔۔ اور اب یہ

ناول۔۔۔ میں کہاں لکھ پاتی؟ ان کے دیئے ہوئے حوصلے کے بغیر۔۔۔ یہ طے تھا کہ میری گزشتہ کتاب کی طرح، اس کتاب کا 'فلیپ' بھی وہی لکھیں گے۔ لیکن اس کے مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ چلے گئے۔

یہ کتاب میں نے اپنی نواسیوں کے نام کی ہے اور پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آ جانے کے مصداق مجھے اُمید ہے کہ دِل جوئی کا فن، جو انھوں نے اپنے ڈاکٹر نانا سے وراثت میں پایا ہے، پروان چڑھے گا۔۔۔ اور یہ دُنیا اُمید پر ہی تو قائم ہے۔

میری دس سالہ بڑی نواسی، اصبح عاصم نے اپنے ڈاکٹر نانا کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور مجھ سے بہتر انداز اور بہتر الفاظ میں انھیں portray کیا ہے:

A Tribute to Dr. Nana

His voice was like music in my head,
His smile was like a healing medicine on the heart,
But this world never let him hold on tight,
In other words this is life,
He did'nt get a second chance to hold everyones hand;
Kiss their head and hug them once again,
Now he is the past that we can't forget,
For he is in our heart, like the first ray of light in the morning,
The first drop of rain, the first flower of spring and the last of autumn.
He was like the kiss of a mother on a child's head when he

حصّہ اوّل

can't sleep.

The hug of a father when a daughter is scared;

He was like warm love.

If anyone asks me what I would wish, if, I had one.

I would wish him to be happy.

And ask Allah to give him a place in heaven, for he deserved it.

منزّہ سلیم

اکتوبر ۲۰۱۰ء، فیصل آباد

رات بھر رِم جھم ہوتی رہی تھی۔ اب بھی بادل جُھکے پڑے تھے۔ ہَوا میں نمی اور سبزے کی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں چھپی ہوئی کوئل کُوک رہی تھی۔

شہر کی طرف سے آنے والی سنگل روڈ، آگے جا کر دوشاخے میں بٹ گئی تھی۔ ایک سڑک، کچہری کی طرف جاتی تھی اور دوسری گرڈ سٹیشن کو۔ ان کے سنگم کے بائیں طرف بڑے بڑے گھر تھے، جن میں زیادہ تر سرکاری افسران رہائش پذیر تھے۔

یہیں پر D.S.P صاحب کے گھر کے ساتھ، انگریز کے وقت کے بنگلوں کے انداز پر بنی ہوئی بڑی سی کوٹھی کے مدّور اور مضبوط ستونوں پر اُونچی چھت والے پورٹیکو میں، ابا میاں کی بھاری بھرکم Norton موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ محرابوں والے برآمدے میں چمڑا چڑھے مونڈھے رکھے تھے۔ شدید موسموں کے علاوہ ابا میاں کے دوستوں کی محفل یہیں جمتی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر بڑے بڑے گملوں میں پام کے پودے لگے تھے۔ برآمدے سے نکلتی ہوئی نیم تاریک اور ٹھنڈی گیلری کے دونوں طرف ہال نما کمرے تھے۔ گیلری کے دوسرے سرے پر Pantry اور بڑا سا باورچی خانہ تھا، جس کی انگریزی حرف 'L' کی شکل

میں تعمیر، اس بات کو یقینی بناتی تھی کہ دھواں کمروں کا رُخ نہ کرے۔

اللہ رکھی، باورچی خانے کے درمیان میں لکڑی کی پیڑی پر بیٹھی کیریاں چھیل رہی تھی اور ساتھ ساتھ 'نغمہ سرا' تھی۔

ے بول میرے انمول کھجانے

مول کوئی دِل والا جانے

اماں ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

''اللہ رکھی، اگر تمہارے لیے گانا 'اسی قدر' ضروری ہے تو خدارا احتیاط برتا کرو۔ الفاظ کی اس درجہ 'بے حرمتی' ٹھیک نہیں۔''

لیکن اللہ رکھی شرمندہ ہونے والی چیز نہیں تھی، اس نے فوراً بات کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔

''بی بی جی، سرمد اور شیما کے لیے 'امبیوں' کی چاٹ تیار کر رہی ہوں۔''

اس نے اپنے منہ میں آئے ہوئے پانی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ایک تو میں تمہاری اس چاٹ سے بہت عاجز ہوں اور دوسرے یہ کہ کتنی بار تم سے کہا ہے کہ مجھے بی بی جی نہ کہا کرو، میں تمہاری اماں ہوں۔۔۔ اور یہ تم چٹخارے کیسے بھر رہی ہو؟''

''اماں، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ جب امبیوں کو چھوٹا چھوٹا کاٹ کر ان میں، نمک اور چینی ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے ڈھک دیں اور پھر ایک ٹکڑا نکال کر منہ میں رکھیں تو لگتا ہے آسمان کی سیر کر رہے ہیں۔''

''بھئی آسمان کی سیر سے تو میں منع نہیں کرتی، لیکن یہ چاٹ اِتنی زیادہ کیوں بناتی ہو؟ بچّوں کے گلے خراب ہو جائیں گے۔''

''کہاں زیادہ ہے جی؟ میں خود بھی تو کھاؤں گی جی بھر کے۔ رُت کی سوغات

ہے۔۔۔ پھر اگلی گرمیوں میں۔۔۔ اور ویسے بھی بچّوں کی چھٹیاں ہیں، جب سکول جانے لگیں گے تو میں خود ہی ایسی چیزوں سے منع کر دوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔''

اللہ رکھی نے انھیں اعتماد میں لیتے ہوئے کہا اور پھر سے کیریوں پر متوجّہ ہو گئی۔

پروفیسر ظلِ رحمان، روہی کے اُس پار شہر کے گورنمنٹ کالج میں ریاضی پڑھا رہے تھے۔ نہایت علم دوست اور بذلہ سنج، طلبہ کے درمیان ہوں، دوستوں کی محفل میں یا گھر پر محبّت کا ایک سیلِ رواں تھے۔ بچّوں کے ساتھ گاڑھی چھنتی، سرمد اور شیما باپ کے دیوانے تھے۔ پروفیسر صاحب بچّوں کو پڑھاتے، ان کے ساتھ کھیلتے اور گپ شپ لگاتے تو اماں، انھیں دیکھ کر زیرِلب شکرانہ ادا کرتیں۔ نرم خُو اور سُگھڑ خاتون۔۔۔ پروفیسر صاحب، ایسے ہم سفر کے لیے سراپا سپاس تھے۔

اللہ رکھی، چاٹ بنانے سے فارغ ہوئی تو باورچی خانے کے باہری دروازے پر مخصوص دستک ہوئی۔

''صاحب کے دوست آ چکے ہیں۔ شربت تیار کر کے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹا دینا، برآمدے میں آ کر چلاّنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

چاچا فیروز، جب اللہ رکھی سے بات کرتے تو ان کے لہجے کا کھردرا پن، اسے تپا دیتا۔

''میں کبھی چلاّئی بھی ہوں؟۔۔۔ جو روز مجھے یہ وعظ سننا پڑتا ہے۔ یہ اپنے کام سے کام نہیں رکھ سکتے؟'' اللہ رکھی بڑبڑائی۔

چاچا فیروز کا دِل تو چاہا کہ اللہ رکھی کی کس کر بنائی ہوئی، بالشت بھر کی، ہوا میں لہراتی ہوئی چٹیا کھینچ کر اسے مزا چکھا دیں لیکن جانتے تھے کہ پروفیسر صاحب اسے ہرگز پسند نہیں کریں گے۔

''بس۔۔۔ بس۔۔۔ زیادہ بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کام کرو جا کر۔''

جب رحمان صاحب کے والد کا اِنتقال ہوا تو اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد ان

کے بڑے بھائی کاروبار کے سلسلہ میں سندھ منتقل ہو گئے۔ ان دنوں ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کا توڑا تھا۔ اس لیے ابھی ایم۔اے کا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا کہ انھیں لکچرر شپ کی پیشکش ہوئی، یوں انھیں بھی آبائی گھر چھوڑنا پڑا۔ فیروز چاچا ان کے ساتھ ہی چلے آئے۔ بڑے صاحب کے نمک خوار تھے، اس لیے ان کا دِل نہیں مانا کہ پروفیسر صاحب کو اکیلا چھوڑ دیں۔ بڑے بھائی تو گھر بار والے تھے، یہ اکیلے کیا کریں گے؟ سو، تب سے وہ یہیں تھے۔ یوں بھی اکیلی جان تھی، نہ کوئی بوجھ، نہ ذمّہ داری۔ جب پروفیسر صاحب کی شادی ہوئی تو انھیں ڈر تھا کہ کہیں ان کی بیگم کے ساتھ نہ بن پائی تو رحمان صاحب کو چھوڑنا ان کے لیے مشکل ہوگا، لیکن بیگم صاحبہ نے انھیں وہ مان دیا، جو گھر کے بڑوں کو دیا جاتا ہے تو وہ مطمئن ہو گئے۔ اب تو ان کی 'خدمات' کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ گھر داری نام کو نہیں تھی۔ ٹرے میں سج کر کھانا آتا، جو اماں اپنی نگرانی میں، اللہ رکھی کے ہاتھ بھجواتیں۔ وہ شیما کو سکول چھوڑنے اور لینے جاتے۔ بازار سے سودا سلف لا دیتے۔ دھوبی کو دُھلائی کے لیے کپڑے دینے کا ذمّہ بھی انھی کا تھا۔ پروفیسر صاحب کا حکم تھا کہ اُن کے اپنے کپڑے بھی دھوبی سے ہی دُھلیں گے۔ سو وہ کلف سے کڑکڑاتا، سفید کُرتا شلوار پہن کر نہایت شائستہ انداز میں گفتگو کرتے تو اللہ رکھی جل کر کباب ہو جاتی۔

''اب کسی دِن صاحب کی بیٹھک میں نہ بیٹھنا شروع کر دیں، بڑے میاں۔''

اللہ رکھی تیرہ سال کی عمر میں بیاہی گئی اور پندرہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جب پروفیسر صاحب کی شادی ہوئی تو انھوں نے اپنے چپراسی سے کہا کہ اگر کوئی بچّی مِل جائے تو بیگم صاحبہ کو اُوپر کے کام میں آسانی ہو جائے گی اور دوسراہٹ بھی رہے گی۔ اس پر حسن دین نے فوراً اپنی بیٹی کا دُکھڑا رو دیا۔

''بے نصیب سال بھر سے گھر پر پڑی ہے۔ بڑی ضدّن ہے، دوسرے نکاح کے لیے مانتی ہی نہیں۔ اب چھ مہینے ہو گئے، میری گھر والی بھی چل بسی ہے۔ تب سے مجھے کالج

میں ڈیوٹی دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرا بیٹا بیاہا ہوا ہے لیکن اُس کی بیوی سے ایک پل نہیں بنتی اس کی۔ آپ کہیں تو میں، اسے آپ کے گھر چھوڑ دوں مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں بیگم صاحبہ کو تنگ نہ کرے۔''

لیکن اس نے بیگم صاحبہ کو تنگ تو کیا کرنا تھا، ایسی ان کی ہو کر رہی کہ آج دس سال ہونے کو آئے تھے، باپ کے گھر جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ باپ بے چارہ، محبت کا مارا، اتوار کو آ کر اس سے مِل جاتا۔ یوں بھی وہ مطمئن تھا، جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ بہت نیک دِل خاتون ہیں۔

چاچا فیروز اور اللہ رکھی میں برابر چخ چلتی رہتی تھی۔ کیونکہ دونوں ہی اپنی اپنی 'راجدھانی' میں ایک دوسرے کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب کے سامنے بات کرتے تو دونوں کا ہی دم نکلتا تھا، حالانکہ وہ کبھی بھی سخت سست نہیں کہتے تھے۔ البتہ اماں کبھی کبھار جھنجھلا جاتی تھیں۔ عام حالات میں تو وہ اللہ رکھی کے سر پر پیار کرتیں اور ہنستے ہنستے گلابی پڑ جاتیں اور کبھی سمجھاتیں۔

''دیکھو، اللہ رکھی، چاچا فیروز بڑے ہیں، ان کا ادب کیا کرو۔ میں اور صاحب بھی ان سے ایسے لہجے میں بات نہیں کرتے۔''

''اماں، تبھی تو وہ بلاوجہ رُعب جھاڑتے رہتے ہیں۔''

اللہ رکھی بھی اپنی قسم کی ایک ہی تھی۔ کبھی جو چاچا فیروز کے معاملے میں کوئی بات مان کر دی ہو اور دوسری بات اس کی شادی کی تھی۔

اماں کہتیں:

''اللہ رکھی، بیٹیوں کو یوں گھر پر بٹھا کر نہیں رکھا جاتا۔ شادی کے لیے مان جاؤ، تمہارے والد اس سلسلہ میں بہت پریشان ہیں۔''

''وہ کیوں پریشان ہیں؟ ہیں؟۔۔۔ شادی کروائی تو تھی میں نے۔''

اللہ رکھی ہتھے سے اُکھڑ جاتی۔

''وہ تو نہیں رہی نا!''

''اب امّاں، شادیاں ہی کرواتی جاؤں کیا؟ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے کرنے کا۔ آپ خود ہی بتائیں، جو بندہ خاوند بن جائے، اس کے علاوہ بھی کوئی اچھا لگتا ہے کبھی۔''

''وہ تو صحیح ہے اللہ رکھی۔۔۔ لیکن تم اِتنی چھوٹی تھیں، تمہیں تو اچھی طرح سے یاد بھی نہیں ہوگا۔''

''سب یاد ہے امّاں۔۔۔ سب یاد ہے۔ آپ سے وعدہ کرتی ہوں، جس دِن کوئی اس جیسا نظر آ گیا۔ مَیں آپ سے کہہ دوں گی، آپ جھٹ سے میرا نکاح اس سے پڑھوا دینا۔''

پھر وہ جذباتی ہو جاتی۔

''میں ماں، باپ کے گھر بیٹھی ہوں۔ اللہ آپ کو زندگی دے۔ میری طرف سے آپ بے فکر ہو جائیں۔ کبھی دُنیا کو باتیں کرنے کا موقعہ نہیں دوں گی۔ اللہ نے مجھے اولاد بھی دے رکھی ہے۔ سرمد اور شیما میرے بچّے ہی تو ہیں اور مجھے کیا چاہیے؟''

اور یہ سچ بھی تھا۔ سرمد اور شیما کی پیدائش کے بعد ڈاکٹر صاحبہ چلی جاتیں تو روشنے دایہ اور اللہ رکھی مِل کر گھر سنبھالتیں اور امّاں ہر طرح سے بے فکر ہو جاتیں۔ اللہ رکھی کے تو مانو، پاؤں میں پہیے لگ جاتے، سارے گھر میں بھاگی پھرتی۔ روزمرّہ کا کھانا بنانے کے علاوہ امّاں کے لیے یخنی بناتی، روشنے بوا سے پوچھ پاچھ کر بادام، پستے اور اخروٹ ڈال کر ایسے مزے کی 'پنجیری' بناتی کہ امّاں سے زیادہ پروفیسر صاحب اس سے 'اِستفادہ' کرتے۔ دودھ میں ہلدی اور چھوہارے پکا کر 'چھوہانی' بناتی تو پروفیسر صاحب کہتے:

''بیٹی، فیروز کو بھی ایک پیالی بھجوا دو۔''

اللہ رکھی یوں ہونٹ بھینچ لیتی جیسے اس کے 'دِلی جذبات' ابھی باہر نکل کر پروفیسر

صاحب تک پہنچ جائیں گے۔

''بڑے میاں بھی کیا 'چھلّے' میں ہیں؟''

سرمد دس دِن کا تھا جب اسے اور امّاں دونوں کو بخار آ گیا۔ اللہ رکھی رات بھر سرمد کو لے کر بیٹھی رہتی، جوانی کی نیند بے حال کر دیتی تو امّاں کو اس پر بڑا پیار آتا۔ وہ اُٹھ کر اس کا کمبل ٹھیک کرتیں۔ بچے کو دیکھ کر جو ممتا ان کے چہرے سے جھلکتی، اس میں اللہ رکھی کا بھی حصّہ ہوتا۔

سرمد بڑا بھی ہو گیا تو اللہ رکھی کا جب دِل چاہتا، اسے کھینچ کر گود میں بٹھا لیتی اور آنکھیں بند کر کے، جھوم جھوم کر دِن کے کسی بھی وقت لوری سناتی:

کا کا پٹا کا (چھوٹا لڑکا، پٹاخہ ہے)

چھلّیاں دا را کھا (بھٹّوں کا رکھوالا)

چھلّیاں نوں پے گئے چور (چور، بھٹّوں کو چوری کرنے آ گئے)

کا کا نستا زوروزور (چھوٹا لڑکا، تیزی سے بھاگنے لگا)

OO

گھر کے باہر والے برآمدے کے دائیں کونے میں ایک نسبتاً درمیانہ کمرہ پروفیسر صاحب کی 'بیٹھک' کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں دوپہر اور سردیوں کی راتوں میں، ان کے دوستوں کی محفل یہیں جمتی۔ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر چڑھی ہوئی بیل سے سرخ، سفید اور گلابی پھولوں کے گچھّے، چینی فانوسوں کی طرح لٹکتے رہتے۔ دوسری کھڑکی دائیں طرف کی راہداری میں کھلتی۔ جس میں 'شرینہہ' کا درخت تھا۔ گرمیوں میں اس میں ہلکے پیلے رنگ کے باریک ریشوں والے پھول آتے تو ان کی خوشبو سے کمرہ بھر جاتا۔ خوشبو بھی ایسی خمار آلود کہ نیند طاری ہونے لگتی۔ چاچا فیروز کے نزدیک یہ درخت بڑا کارآمد تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر باری کا بخار آ رہا ہو تو صبح 'منہ اندھیرے' اس کے گلے مِل کر اُلٹے

پاؤں واپس آ جائیں تو بخار اُتر جاتا ہے۔ یہ الگ بات کہ پروفیسر صاحب کو ان کے اس 'فلسفے' سے اتفاق نہیں تھا۔ نتیجتاً، چاچا فیروز کو، کونین کی گولی ہفتہ وار کھانا ہی پڑتی۔ وہ پروفیسر صاحب کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے، اِس لیے ان کے چہرے پر پھیلی بے چارگی کو دیکھ کر پروفیسر صاحب زیرِلب مسکراتے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ صرف گولی بھجوا کر فارغ ہو گئے ہوں۔ وہ اپنی موجودگی میں اسے حلق سے اُترتا ہوا دیکھ کر واپس اپنے کمرے کی طرف ہو لیتے۔

اس کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ دیوان پڑا تھا۔ جس پر ہلکے بھورے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی اور قرمزی رنگ کے مخمل کے دو گاؤ تکیے رکھے تھے۔ فرش کے درمیان میں، قیمتی مگر پرانا غالیچہ تھا، جس پر بنے ہوئے شیر اور چیتے اب مٹتے جا رہے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ بید سے بنی ہوئی چار آرام کرسیاں تھیں۔ جن کی پشت پر لٹھے کے سفید بُرّاق، کلف دار غلاف ہفتہ وار بدلے جاتے۔ ایک کونے میں کتابوں کی الماری تھی۔ پروفیسر صاحب، صوفی شعرا کے کلام، انگریزی ادب اور سیاسی مضامین کے دِلدادہ تھے۔

پروفیسر صاحب کے دوستوں میں سبھی باذوق اشخاص تھے۔ اس لیے ان کی محفلیں جب رنگ پر آتیں تو وقت کا احساس ختم ہو جاتا۔

سبھی دوست 'کافی' (Coffee) کے شوقین تھے۔ اماں جب کافی پھینٹتیں اور پیالیوں میں اُنڈیل کر بالائی ڈالتیں تو پیالی میں، بقول اللہ رکھی 'چک پھیریاں' لیتا بادامی اور سفید جھاگ Coffee lovers کو مسحور کر دیتا لیکن ساتھ ہی ساتھ، گرمیوں میں بادام کا شربت اور ٹھنڈائی اور سردیوں میں بادام کا حریرہ بنانا اماں کبھی نہ بھولتیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں پروفیسر صاحب اِتنا 'خشک' مضمون پڑھاتے تھے کہ کافی سے دماغ کی خشکی مزید بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔

سلیمی صاحب سیاسیات پڑھاتے تھے اور یہی ان کا دِل پسند موضوعِ گفتگو تھا۔

ان کی موجودگی میں تیزی سے بدلتے ہوئے ملکی حالات اور سیاسی اَبتری زیرِ بحث رہتی۔

تارڑ صاحب، اُردو ادب کے اُستاد تھے۔ وہ کہتے:

''رحمان صاحب، خدا کا شکر ہے کہ آپ اُردو ادب سے شغف رکھتے ہیں ورنہ ہم آپ کے ساتھ، ریاضی کے موضوع پر کیا بات کرتے؟''

رفیق انور صاحب، انگریزی ادب کے استاد تھے۔ ان کی بیوی کافی سخت مزاج خاتون تھیں۔ تمام عمر دونوں میں سبھاؤ کا معاملہ نہیں رہا تھا۔ تین سال پہلے وہ انھیں داغِ مفارقت دے چکی تھیں۔ ایک بیٹا تھا، جو اپنی پھوپھی کے ساتھ رہتا تھا۔ رفیق صاحب، کافی کا کپ ہاتھ میں پکڑے پکڑے، کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے اور پھر بڑی سنجیدگی سے کہتے:

''حالات تو میرے بھی ملٹن (Milton) والے ہی ہیں لیکن افسوس میں Paradise Lost اور Paradise regain (ملٹن کی دو کتابیں، جو انھوں نے، ایک بیوی کی زندگی میں اور دوسری اس کی وفات کے بعد لکھی) نہ لکھ پایا۔

تاہم میں 'یارانِ نکتہ داں' کو ایک مشورہ ضرور دینا چاہوں گا کہ ایسے حالات کا سدِّباب بروقت ہونا ضروری ہے، جو کہ عام طور پر لوگ نہیں کرتے۔ دُلہا کو چاہیے کہ شادی کے تھری پیس سوٹ کے ساتھ لیدر شوز کی بجائے کینوس شوز لیا کرے تاکہ جب بیوی گھورے تو شوہر انھیں پہن کر باآسانی گھر کے پچھلے دروازے سے فرار ہو سکے۔ اس طرح سے سیر بھی ہو جائے گی، جو صحت کے لیے بہت ضروری ہے اور ممکنہ حد تک حالات بھی قابو میں رہیں گے اور واپسی تب ہو، جب معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا ہو۔''

پروفیسر صاحب، تھری پیس سوٹ کے ساتھ کینوس شوز پہنے دُلہا کا تصور کر کے زور سے ہنسے اور کہنے لگے۔

''نہیں، رفیق صاحب، اب ایسی بھی کیا بات ہے؟''

''ایسی ہی بات ہے رحمان صاحب، آپ کو اندازہ نہیں ہے کیونکہ امن کی یہ فاختہ،

جو ہماری بھابھی صاحبہ اور آپ کی بیگم ہیں، آپ کو میسّر ہیں تو پھر آپ کیسے اسے سمجھ پائیں گے؟"

کوٹھی کے عقبی احاطے میں نیم، شیشم، جامن اور آم کے پیڑ تھے۔ آم پر بُور آتا، کوئل کوکتی، بوندیں گرتیں تو مٹی کی خوشبو، شیما کو پاگل کر دیتی۔ ایک کونے میں لیموں کے پھل دار پودے تھے۔ باورچی خانے کے کونے سے ملتا نیم کا پیڑ، ایسے پھیلا ہوا تھا کہ اس کا تنا اُوپر جا کر دو شاخوں میں بٹ جاتا تھا۔ ایک شاخ یوں خم کھائے ہوئے تھی کہ اس کا جھکاؤ باورچی خانے کی طرف تھا۔ سرمد اور شیما اس پر باآسانی چلتے ہوئے باورچی خانے کی چھت پر چلے جاتے۔ اللہ رکھی چھت پر ان کے قدموں کی چاپ سن کر پچھلے دروازے سے باہر نکل آتی اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھے، سرزنش کے انداز میں کڑی نظروں سے ان کی طرف دیکھتی لیکن وہ دونوں سمجھتے ہوئے بھی انجان بن جاتے۔ اتوار کو شیما تو ناشتہ بھی اسی دوشاخے پر بیٹھ کر کرتی۔ کاسنی اور سفید مہکتے پھول اس کے بالوں میں ٹپ ٹپ گرتے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پراٹھے کا رول ہوتا اور دوسرے میں کوئی رسالہ۔ کہانی کسی نازک موڑ پر پہنچ جاتی تو نوالوں کے درمیان وقفہ بڑھ جاتا۔

اللہ رکھی چلاّتی۔

"شیما نیچے اُترو۔۔۔ ایسے بے خبر بیٹھی ہو۔ کوا تمہارا 'گھوگا' (گھونگھا، پراٹھے کا رول) لے جائے گا۔"

لیموں کے پودوں پر چھوٹی چھوٹی سفید کلیاں مہکتیں تو سارا گھر خوشبو سے بھر جاتا۔ نک سک سے درست مغرور حسیناؤں جیسی گل دم ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکتی رہتیں۔ رات بھر چلتی رہنے والی ہوا میں خنکی کے ساتھ خوشبو کا بوجھل پن ہوتا۔ اتوار کو ابا میاں پچھلے برآمدے میں ناشتہ کرتے۔ دوپہر کا کھانا ڈائننگ روم میں کھانے کی میز پر کھایا جاتا۔ گرمیوں میں رات کا کھانا اماں صحن میں تخت پر چنتیں۔ چاچا فیروز، سرِ شام صحن میں اِتنا

چھڑکاؤ کرتے کہ گرمی بہت حد تک زائل ہو جاتی، پھر تخت سے تھوڑے فاصلے پر چار پائیاں ڈال دیتے۔ اللہ رکھی ان پر بستر لگا دیتی۔ سرمد اور شیما ان پر کودتے اور اللہ رکھی سے ڈانٹ کھاتے رہتے۔ ٹھنڈی چاندنی، اُجلے بستر، بھیگی بھیگی راتیں اور جگنوؤں کی ٹمٹماہٹ۔۔۔ شیما کا سونے کو دِل نہیں چاہتا تھا، تاکہ یہ منظر آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔

OO

گھر کے باہر، کچہری روڈ کی دوسری جانب مشن مڈل گرلز سکول کا بہت بڑا کمپاؤنڈ تھا۔ شیما اسی سکول میں پڑھ رہی تھی۔ اگرچہ اماں، شیما کو اس 'غیر مذہب' والوں کے سکول میں بھیجنے کے خلاف تھیں، لیکن پروفیسر صاحب نے انھیں قائل کر ہی لیا۔

اماں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے کہا تھا۔

"سکول کا صرف گھر کے نزدیک ہونا ہی تو کافی نہیں ہے، آپ یہ بھی تو سوچیے کہ غیر مذہب والوں کا سکول ہماری بچّی کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"آپ، بالکل پریشان نہ ہوں، پہلی بات تو یہ کہ مشنری سکول کا تعلیمی معیار، یقیناً ہمارے گورنمنٹ سکولوں سے بہتر ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نے معلومات کروالی ہیں، سکول میں مسلم بچیوں پر بائبل پڑھنے کی پابندی نہیں ہے۔ وہ چاہیں تو اس کی جگہ، اخلاقیات کا مضمون پڑھ سکتی ہیں لیکن میرا خیال ہے، شیما بائبل ہی پڑھے گی۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ دوسرے مذاہب میں کیا ہے؟"

"لیکن شیما ابھی بچّی ہے۔ مذاہب کا موازنہ تو کیا، وہ تو ان کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔"

اماں مصر تھیں۔

"مسلم عقائد سے متعارف کروانا ہمارا کام ہے۔ اس کے لیے، ان شاء اللہ، میں اور آپ محنت کریں گے۔ یوں بھی، کوئی مذہب، بری باتیں تو نہیں سکھاتا! آپ بے فکر رہیں، وہ کسی اُلجھن کا شکار نہیں ہوگی بلکہ وسیع النظری ملے گی اسے۔ میں نے D.S.P صاحب سے

بات کی ہے وہ بھی ندرت کو اسی سکول میں داخل کروا رہے ہیں۔“

امّاں لاجواب ہو گئیں۔

لیکن سرمد کو گورنمنٹ سکول میں بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کیونکہ چھوٹا شہر ہونے کی بنا پر کوئی اور اچھا سکول تھا ہی نہیں۔ یہ سکول بھی روہی کے اس پار تھا۔ پروفیسر صاحب صبح کالج جاتے ہوئے اسے سکول چھوڑ دیتے اور واپسی پر لیتے ہوئے گھر آتے۔

OO

گرلز سکول کے بے حد بڑے احاطے کی قدِ آدم چار دیواری میں داخلے کے لیے دو بڑے گیٹ تھے۔ ایک گیٹ پروفیسر صاحب کے گھر سے تھوڑا سا آگے جا کر سڑک کے دوسری طرف تھا۔ گیٹ میں داخل ہوں تو دائیں ہاتھ گرجا تھا۔ جس کی سرخ اینٹوں کی بائیں دیوار مکمّل طور پر گلاب کی بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بہار کے بے کنار موسم میں اس پر کھلنے والے گلابی پھولوں کا حسن دیدنی ہوتا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر پادری صاحب کا گھر تھا۔ کبھی کبھی پادری صاحب کی بیٹی لانگ سکرٹ پہنے، گلے میں سکارف ڈالے، اپنے سفید Pixy کُتّے کی زنجیر تھامے باہر نکلتی اور شیما کو دُور سے ہاتھ ہلاتی تو اسے یوں لگتا کہ انگریزی کہانیوں کی کوئی کتاب، اس کے سامنے مجسّم ہو گئی ہے۔

ایک لمبا کچا راستہ طے کرنے کے بعد سکول کی مرکزی عمارت تھی۔ اس کے داخلی دروازے کے بائیں طرف طالبات کے لیے ہاسٹل تھا۔ سکول کی زیادہ تر بچیاں، یہیں رہائش پذیر تھیں۔ بہت کم لڑکیاں روزانہ گھروں سے سکول آتی تھیں جن میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد اور بھی کم تھی۔

ہاسٹل میں الگ الگ کمرے نہیں تھے۔ صرف ڈارمیٹریز تھیں۔ صبح جب شیما سکول جاتی تو ان میں تالے لگ چکے ہوتے۔ بچّیاں تیار ہو کر ناشتے کے لیے جانے سے پہلے اپنے بستر بناتیں۔۔۔ بستر تو ان بے چاریوں کے جیسے بھی ہوتے ان پر بیڈ کور کے طور پر سکول

سے مہیّا کی جانے والی سادہ آسمانی رنگ کی چادریں استعمال کی جاتیں۔ قطار اندر قطار پڑی چارپائیوں پر ایک ہی رنگ کی چادروں سے اُونچی چھت والی ڈارمیٹری اور بھی وسیع و عریض لگتی۔ شیما کھڑکیوں سے اندر جھانکتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔

مس چرن ہاسٹل وارڈن تھیں۔ وہ ہاسٹل کے برآمدے کے کونے والے بڑے کمرے میں رہتی تھیں۔ ان کے کمرے کے دروازے اور پچھلے حصّے کو ایک سکرین سے علیحدہ کیا گیا تھا، جس کے بے داغ سفید پردے کبھی میلے نظر نہیں آتے تھے۔ دروازے کے پاس پڑی ہوئی کرسیوں پر مس چرن ’کھلی کچہری‘ لگاتیں۔ بچّیوں کے مسائل، باورچی، مالی، چوکیدار، آیائیں۔۔۔ ان کی سرکار میں پہنچتے تو ’سبھی‘ ایک ہو جاتے۔ بے بہا ڈانٹ کھاتے، لیکن مس چرن سے بے حد محبت کرتے۔ جانتے تھے کہ یہ ماں کی ڈانٹ ہے جو دیتی سونے کا نوالہ اور دیکھتی شیر کی آنکھ سے ہیں۔

مس چرن، چوڑے روشن چہرے والی، بااصول اور شفیق خاتون تھیں۔ عمر پچپن سال کے لگ بھگ، درمیانہ قد اور بھاری جسم، ہمیشہ سفید سوتی ساڑھی پہنتیں، جو ان کی کھلتی ہوئی سفید رنگت پر بہت اچھی لگتی۔ جب کبھی شیما، شام میں چاچا فیروز کو ساتھ لے کر ہاسٹل جا نکلتی تو وہ پیٹی کوٹ اور بلاؤز پر گاؤن پہنے برآمدوں میں چلتی پھرتی نظر آتیں۔ ان کی ٹھوڑی پر ایک نیلا تل تھا۔ جب وہ شیما کو پیار کرتیں تو اسے لگتا کہ اس میں سے ویسی ہی روشنی پھوٹ رہی ہے، جیسی امّاں کے لاکٹ سے نکلتی ہے۔ وہ جب امّاں کے گلے سے چمٹی، انھیں پیار کر رہی ہوتی تو یہ ٹھنڈی نیلی روشنی اسے اپنے حصار میں لے لیتی۔۔۔ یہ روشنی صرف شیما کو نظر آتی تھی کیونکہ لاکٹ کا نگ سفید تھا۔

ہفتہ کی شام اور اتوار کی صبح میں والدین بچّیوں سے ملاقات کے لیے آتے۔ سائیکلوسٹائل کی ہوئی درخواستوں پر چوکیدار ان کے دستخط لیتا۔ اکثر والدین انگوٹھا لگاتے، اور جو دستخط کرتے، وہ بھی، وہ خود ہی سمجھ سکتے تھے کہ انھوں نے کیا لکھا ہے؟ ان درخواستوں

پر مس چرن کے دستخط ہونے کے بعد، ملاقات کی اجازت ملتی۔ اکثر بچیاں ملاقات کے لیے مخصوص کمرے میں آ جاتیں۔ کچھ باہر صحن میں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھنے کو ترجیح دیتیں۔ بہت سی بچیاں، روتی، شکوے شکایت کرتی یا بدتمیزی کی حد تک جھگڑا کرتی نظر آتیں اور والدین انھیں سمجھاتے اور پیار کرتے ہوئے اور کبھی ڈانٹتے ہوئے۔ آخر میں وہ جوار کے بھنے ہوئے دانے، گنّے اور گڑ کا تحفہ دے کر رُخصت ہو جاتے۔

جن بچیوں کے والدین اس ہفتہ ملاقات کے لیے نہیں آ پاتے تھے وہ انھیں گھر پر خط لکھتیں، جنھیں مس چرن 'سنسر' کرتیں اور چوکیدار داخلی گیٹ کے پاس لگے لیٹر بکس میں ڈال آتا اور جب گھر سے خط آتا تو لڑکیاں آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو صاف کرتے ہوئے، اسے بار بار پڑھتیں۔

اتوار کی شام کو ہاسٹل کی بچیاں پچھلے چبوترے پر بیٹھتیں۔ ان کے سامنے، ان کے جستی ٹرنک رکھے ہوتے۔ مس چرن اور آیا ان کی چیکنگ کرتیں۔ اگرچہ ان میں ہوتا ہی کیا تھا چیکنگ کے لیے؟ ایک آدھ جوڑا، سوئی دھاگہ، پوٹلی میں بندھے جوار کے دانے اور گڑ، ڈاک کا لفافہ، سستی چوڑیاں، نہانے کا گھٹیا صابن اور چند سکّے۔۔۔ اور ہاں بوا یا پیاری کے دیئے ہوئے ٹوٹی چوڑیوں کے ہار، سوکھے ہوئے پھول یا ایک آدھ ٹافی۔۔۔

بچیوں کو ان کا پھٹا یا اُدھڑا ہوا کپڑا سینے کے لیے کہا جاتا۔

دوپہر کا کھانا آیا لوگ اور رات کا کھانا، باری باری بچیاں تقسیم کرتیں۔ صفوں پر قطار میں بیٹھی ہر بچی اپنے سامنے تام چینی کی پلیٹ اور مگ رکھ کر بیٹھ جاتی، جس کا رنگ نیم زرد ہوتا تھا اور ہلکے سبز رنگ کا کنارا اور جہاں سے یہ پرت اُکھڑ چکی ہوتی وہاں سے سیاہ، زنگ آلود لوہا جھانک رہا ہوتا۔ زیادہ استعمال شدہ برتن تو باقاعدہ چتکبرے ہو گئے تھے۔

کھانا تقسیم کرنے والی بچیاں، بالٹی میں سالن لے کر صفوں کے درمیان چکّر لگاتیں۔ پانی کے لیے تام چینی کے جگ، جگہ جگہ رکھے جاتے اور روٹیاں چنگیروں میں،

جب تک سب بچیوں کو کھانا نہیں مل جاتا، کوئی بچّی بھی کھانا شروع نہیں کر سکتی تھی۔ مس چرن بلند آواز میں دُعائے ربانی پڑھتیں اور بچیاں کھانا شروع کرتیں۔ مکمل خاموشی میں کھانا ختم کر کے بچیاں قطار بنا کر باری باری ہاتھ دھوتیں اور ڈائننگ ہال سے نکل جاتیں۔

آیا لوگ برتن سمیٹتیں، صفوں کو لپیٹ کر کھڑا کرتیں اور جھاڑو لگانے کے بعد باورچی خانے کو تالا لگا دیتیں لیکن اس سارے کام کے دوران انھیں بڑبڑانے کی 'اجازت' مس چرن ہرگز نہیں دیتی تھیں۔

سکول کے صحن کے ایک کونے میں ایک گڑیا گھر بنا ہوا تھا۔ ایک بڑی سی ملتانی مٹی، کپڑے اور روئی سے بنی ہوئی گڑیا اس میں دھری تھی۔ گڑیا کے چھوٹے سے کمرے (ویسے اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا، شیما با آسانی اس کے اندر جا سکتی تھی۔) میں اس کا پلنگ، ایک میز اور کرسی تھی۔ کھڑکی پر پردے لگے ہوئے تھے۔ باہر ایک محراب دار برآمدہ تھا جس میں ایک تخت پڑا تھا اس پر گلابی رنگ کی فرل والی چادر تھی اور ایک گاؤ تکیہ۔ اس گڑیا سے کھیلنے کی اجازت تو نہیں تھی البتہ کبھی کبھار کسی کلاس کو اس گھر کا 'دورہ' کروایا جاتا اور جب شیما کی باری آتی تو اس کے بعد کئی روز تک وہ خواب میں اس گڑیا گھر میں پہنچ جاتی۔

صحن کا دوسرا کونا ایک کھیت کا منظر پیش کرتا جہاں ایک چھوٹے سے رہٹ کا ماڈل تھا۔ جو باقاعدہ کام بھی کرتا تھا۔ سیمنٹ کے بَیل کے نیچے پہیے لگے تھے۔ جب بچیوں کو اس کی کارکردگی کا 'نظارہ' کروانا ہوتا تو بہشتی اس میں چار مشک پانی بھر دیتا اور بَیل پہیوں پر چلتا ہوا چکر لگاتا تو پانی 'ٹنڈوں' (مٹی کے برتن) سے باہر نکلتا۔ رہٹ کی روں روں، چھل چھل گرتا پانی اور اردگرد کا سبزہ، بورڈرز کو اپنے گاؤں کی یاد دِلاتا اور شہر کی لڑکیاں اسے دِل چسپی سے دیکھتیں۔

چھوٹی کلاسوں سے ہی بچیوں کو سلائی کڑھائی سکھانے کا انتظام کیا جاتا۔ اس کے لیے مخصوص کمرے میں چھوٹی چھوٹی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں سلائی کا سامان رکھ

کر طالبات تالا لگا دیتیں۔ ہفتہ میں ایک بار، دو لگاتار پیریڈ اس کام کے لیے مختص کیے جاتے۔ سلائی شروع کرنے سے پہلے بچیاں نل چلا کر صابن سے ہاتھ دھوتیں اور اپنا کام الماری سے نکال کر وہیں سے شروع کر دیتیں جہاں سے پچھلی بار چھوڑا ہوتا۔ دوسرے سکولوں کی طرح گھر سے چیزیں تیار کر کے نہ لائی جاتیں۔ اماں اس عام سے سکول کا موازنہ دوسرے سکولوں سے کر کے حیران اور خوش ہوتیں۔

بڑی کلاسوں کی بچّیوں کو کھانا پکانا اور کپڑے دھو کر انھیں نیل اور کلف لگانے کے علاوہ رنگنا بھی سکھایا جاتا۔ Cooking and laundry کی کلاس میں استعمال ہونے والی سبھی اشیاء سکول سے ہی ملتیں۔ کیونکہ ہوسٹل میں رہنے والی بچیاں نہ تو اس کی استطاعت رکھتی تھیں اور نہ ہی بازار سے منگوا سکتی تھیں اس لیے ڈے سکالر بچّیوں کو بھی منع کر دیا جاتا۔ جس کلاس کی پکانے کی باری ہوتی، وہ بریک میں گراؤنڈ میں بیٹھ کر اپنا پکا ہوا کھانا کھاتیں۔

ہاسٹل میں پکنے والی سبزیاں، سکول کے کمپاؤنڈ میں ہی اُگائی جاتیں۔ بچّیوں کی بھی gardening اور Vegetable growing کی کلاس ہوتی۔ مالی لڑکیوں کو کھیتی کے بارے میں بتاتا تو لڑکیاں سوال کر کر کے 'مالی صاحب' کا بھیجا چاٹ جاتیں۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو جاتی جب لڑکیاں گاجر، مولی حتیٰ کہ گوبھی تک اُکھاڑ کر چر جاتیں۔ 'مالی صاحب' بے چارہ 'ہیں۔۔۔ ہیں' ہی کرتا رہ جاتا۔

سکول کے بڑے گراؤنڈ کے پچھواڑے میں ایک طرف، ایک چھوٹا سا دھوبی گھاٹ تھا۔ جس میں ہاسٹل کی بچّیوں کے کپڑے دُھلتے۔ جب کبھی شام کے وقت، شیما اور ندرت سکول جاتیں تو دھوبی گھاٹ کی الگنیوں پر رنگ برنگی شلواروں کی قوسِ قزح نظر آتی۔

ہاسٹل کے بالمقابل، اساتذہ کی رہائش گاہ تھی۔ مس شیلا، مس ہزارہ، مس سنت مسیح، مس شکنتلا، مس پال، مس وزیر اور مس اقبال۔۔۔ زیادہ تر ٹیچرز ہاسٹل میں ہی رہائش پذیر تھیں۔ مسز ڈیوڈ سکول کے پچھواڑے میں سکول کی دی ہوئی رہائش گاہ میں رہتی تھیں۔

مرکزی عمارت کا سامنے کا حصّہ پھول پھلواری کے لیے مخصوص تھا۔ رتن جوت، گلاب، موتیا اور گیندا۔۔۔ اور گرمیوں کی کڑکتی دھوپ میں گلِ دوپہری کے چیختے چلاتے، آتشیں گلابی رنگ کے پھولوں سے ڈھکی کیاریاں۔ مالی روزانہ تین گلدستے بناتا، درمیان میں گلاب کے گلابی یا ارغوانی پھول اور اردگرد سرو کے پتوں کا حاشیہ۔۔۔ یہ گلدستے پرنسپل مس ایسل کے دفتر، مس چرن کے کمرے اور کلرک مسٹر ڈیوڈ کے میز پر رکھے جاتے۔ کلیاں مس چرن اپنے کانوں میں پہنتیں اور مس پال بازو میں گجرے کی صورت میں اور جب کبھی مس پال پر 'جن' آتا تو سارا الزام ان معصوم اَدھ کھلی کلیوں کے سر آتا جن کی خوشبو 'جن' کو بہکا کر مس پال کے پاس لے آتی اور وہ اول فول بکنے لگتیں، ان کے منہ سے جھاگ نکلتی اور وہ پچھاڑ کھا کر گرتیں۔ شیما کے لیے یہ سب سنی سنائی تھی کیونکہ کبھی بھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کلاس میں پڑھاتے ہوئے، مس پال کے پاس جن کی تشریف آوری ہوئی ہو۔ ہاں البتہ سرد راتوں میں جب تیز ہوا، درختوں اور بجلی کی تاروں میں سے سیٹیاں بجاتی گزرتی، سیاہ بادلوں میں چمکنے والی بجلی سے سارا صحن چکا چوند ہو جاتا، اور نیم کا درخت ہوا کے زور سے اِدھر اُدھر جھکتا تو مس پال کے کمرے کی بتی بار بار جلتی بجھتی اور ان کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دیتیں اور صبح ہاسٹل کی لڑکیاں پُراسرار سرگوشیاں کرتیں۔ مس پال کے بے رونق چہرے اور زرد رنگت پر آنکھوں کے حلقے نمایاں نظر آتے۔ تھکاوٹ ان کی پور پور میں رچی ہوتی۔ شیما کا دل ان کو دیکھ کر بیٹھ جاتا۔

"یہ جن ہوتے ہی ظالم ہیں۔" کہانیوں کی کتابوں کی گواہی اسے سمجھانے کے لیے کافی تھی۔ اس نے ابا میاں سے اس کا ذِکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ سب کسی جن کی کارستانی نہیں ہے۔ بلکہ مس پال بیمار ہیں۔

"ہوں۔۔۔ جبھی تو وہ اتنی بجھی بجھی سی رہتی ہیں۔۔۔ ورنہ جن کا ان سے کیا لینا دینا۔ وہ تو اِتنی اچھی ہیں۔"

مس وزیر، شیما اور ندرت کی پسندیدہ ٹیچر تھیں اور وہ دونوں ہی، ان سے بہت

مرعوب رہتی تھیں۔ وجہ ان کا نام تھا۔

''مس وزیر کے ابا میاں کونسے وزیر ہیں؟'' شیما نے ندرت سے پوچھا۔

''وزیرِ باتدبیر۔'' ندرت نے پورے اعتماد سے کہا۔

''تمھیں کیسے پتا ہے؟'' شیما نے حیرانی سے پوچھا۔

''وزیر، باتدبیر ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی ہوں گے۔'' ندرت اپنی معلومات پر مغرور ہوئی جا رہی تھی۔

''تو پھر یہ وزیر صاحب کے ساتھ محل میں کیوں نہیں رہتیں؟ یہاں تو ان کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔'' شیما، ندرت سے بھی بے حد مرعوب نظر آ رہی تھی۔

''میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر بادشاہ، وزیر صاحب سے کوئی سوال کرے اور وہ جواب نہ دے پائیں، تو کہیں، بادشاہ انھیں اندھے کنوئیں میں نہ پھنکوا دے۔ پھر مس وزیر کیا کریں گی؟''

دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ وزیر باتدبیر کی ایک عقلمند بیٹی بھی تو ہوتی ہے، جو ہر سوال کا جواب جانتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ مس وزیر، Maths کے سوال کیسے دو منٹوں میں حل کر دیتی ہیں۔''

''لیکن ندرت، ایک بار میں نے 'وزیر صاحب' کو دیکھا تھا وہ اپنی 'عقلمند بیٹی' سے ملنے آئے تھے۔ انھوں نے نیلے رنگ کا تہبند باندھ رکھا تھا، میلی سی سفید رنگ کی قمیص تھی اور پرانا براؤن سویٹر۔ وہ مس وزیر کے لیے گنے لے کر آئے تھے۔۔۔ نہ تو انھوں نے کلغی والی پگڑی باندھ رکھی تھی جس میں ہیرا لگا ہوتا ہے، اور نہ ہی سرخ رنگ کا لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ تو بالکل بھی 'وزیر صاحب' نہیں لگ رہے تھے۔''

شیما، ان کے حلیے سے مایوس نظر آ رہی تھی۔

''بیوقوف، وہ بھیس بدل کر آئے ہوں گے۔ اچھے وزیر، ایسے ہی کرتے ہیں۔''

ندرت، شیما کی معلومات میں 'کمی' پر بے حد ناراض تھی۔

''ندرت ایک بات اور بتا دو پلیز۔۔۔ مس ہزارہ کے بال کتنے لمبے اور خوبصورت ہیں۔ کہیں وہ Rapunzel (بچّوں کی کہانیوں کا ایک کردار، جس کے بال بہت لمبے ہیں) کی بہن تو نہیں ہیں؟''

شیما نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نہیں، بہن نہیں ہیں۔'' ندرت نے بڑے وثوق سے کہا۔

''ان کی دُور پار کی رشتہ دار ہیں۔''

OO

پیانو بج رہا تھا۔ مس ایسل کی خوبصورت آواز اور دھیما لہجہ فضا میں تیر رہا تھا۔

؎ ''ونڈر فل ورڈز بیوٹی فل ورڈز
بیوٹی فل ورڈز آف لا۔۔۔ا۔۔۔ا۔۔۔ا۔۔۔ئف''

بچیاں، چٹائی پر بیٹھی، محویت سے نظم سن رہی تھیں۔ کمرے کے باہر سکوت تھا۔۔۔ سوائے پرندوں کی چہچہاہٹ کے۔ روشن دِن اور ہوا میں خوشگواریت کا احساس۔ شیما کا دِل خوشی سے بھر گیا۔

''زندگی کتنی خوبصورت ہے۔''

اِس عمر میں شاید، وہ اس کا تجزیہ تو نہیں کر پا رہی تھی، لیکن جب موسم اچھا ہو۔۔۔ گیتوں سے دِل خوش ہو جائے۔۔۔ جب سب ساتھ ہوں۔۔۔ ابا میاں، امّاں، بھائی بہت سی دوست اور کتابیں۔۔۔ Mother Goose۔۔۔ ایلس ان ونڈر لینڈ۔۔۔ پنوکیو کے کارنامے۔۔۔ چمکتے جگنو۔۔۔ بیر بہوٹیاں۔۔۔ تارے، پھول اور بارش کی آواز۔۔۔ چاندنی کی پھواروں میں بھیگی ہوئی راتیں۔۔۔ اور بھرپور محبت کا نیم گرم اور سکون بخش

احساس۔۔۔تو پھر زندگی یقیناً خوبصورت ہے۔

سنہرے اور سفید بالوں، اور سنہرے فریم کی عینک میں مس ایسل کا بشّاش اور شفیق چہرہ۔۔۔ ہلکے ہلکے رنگوں کے گھیر دار سکرٹ، آرام دہ سینڈلز میں جکڑے گورے چٹّے پاؤں۔۔۔ وہ بے آواز چلتی پھرتی سکول میں نظر آتیں تو تحفظ محبّت اور آشتی کا احساس، شیما کے دِل میں اُتر جاتا۔ دُور دیس سے آئی ہوئی یہ خاتون، سکول کی پرنسپل تھیں۔ جس جذبے کے تحت وہ یہاں آئی تھیں۔ وہ ہمیشہ، ان کے ہر کام میں کارفرما نظر آتا تھا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ ان کی اُونچی آواز، سکول کے کسی کونے سے سنائی دی ہو۔ دھیرج، سکون، دھیمے پن اور محبت کا دوسرا نام مِس ایسل تھا۔

OO

گوندنی کے درخت جوگیا رنگ کے پھل سے جھکے پڑے تھے۔ مئی کی ہَوا میں خلافِ معمول خنکی تھی۔ آوارہ بادلوں کی ٹکڑیاں آسمان پر گھوم رہی تھیں۔

بازار میں گہما گہمی تھی۔ دُکانوں پر چینی اور بیسن سے تیار کردہ شیرینی، بتاشے اور موتی موتی، ہلکے پیلے رنگ کی جلیبیاں بِک رہی تھیں۔ مکّھیاں ان پر بھنبھنا رہی تھیں۔ مٹی کے چراغ تھے اور سبز رنگ کی چادریں، جن پر گوٹا اور کرن لگی ہوئی تھی۔

ایک آدمی اکنیوں کی برسات کر رہا تھا۔ بچّے ان پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ بازار کے درمیان میں نہایت غلیظ نالی تھی۔ اس کے اندر گر جانے والے سکّے نکالنے کی کوشش میں بچّوں کے ہاتھ، سیاہ بدبودار غلاظت سے لتھڑے ہوئے تھے۔

ایک مجذوب، آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر 'حق اللہ' کا نعرہ لگاتا، اس کے پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیر، اس کے ٹخنوں کو زخمی کر رہی تھی۔ اس کے زخموں سے رِستے ہوئے خون پر مکّھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی آواز اِتنی کڑک دار تھی کہ شیما نے ابا میاں کی اُنگلی زور سے تھام لی۔ پروفیسر صاحب احتراماً خاموش کھڑے تھے۔ سرمد بار بار سر اُٹھا کر ان کی طرف

دیکھتا اور پھر انہی کے انداز میں سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا۔

شیما نے اُکتا کر کہا ''ابا میاں، چلیں؟''

پروفیسر صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھنا شروع کیا۔ وہ بابا جی کے صوفیانہ کلام کے شیدائی تھے، اس لیے جب بھی وہ بچّوں کی یا اپنی ضرورت کی اشیاء خرید کرنے کے لیے بازار آتے تو مزار پر فاتحہ خوانی ضرور کرتے۔

سرمد نے کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھا اور انہی کی طرح ہاتھ اُٹھا لیے۔ شیما کو مکّھیوں کی بھنبھناہٹ سے اُلجھن ہو رہی تھی۔

مزار پر قوالی ہو رہی تھی۔

ے میں تیرے قربان
ویڑھے آ وڑ میرے

قوّال، اُونچی آواز میں گا رہا تھا۔ اس کے بالوں میں بہت سا تیل تھپا ہوا تھا اور زیادہ زور سے گانے کی کوشش میں پیک بہہ کر ٹھوڑی کو چھو رہی تھی۔ ہارمونیم بجاتے بجاتے وہ ایک دم چیخا تو ایک بُرقعہ پوش عورت کی گود میں چھوٹا سا بچّہ، ڈر کر رونے لگا۔

عورت کا نقاب آنسوؤں سے گیلا تھا۔

ے ویڑھے آوڑ میرے
میں تیرے قربان، ویڑھے آوڑ میرے
جان، بھانویں نہ تو جان، ویڑھے آوڑ میرے
تیرے جہا مینوں ہور نہ کوئی
ڈھونڈاں میں جنگل، بیلا تے روہی
ڈھونڈاں میں سارا جہاں
ویڑھے آوڑ میرے

واپسی پر چند قدم کے فاصلے پر ایک ہیجڑا، سرمستی کے عالم میں ناچ رہا تھا۔ گھنگھرو اس کی آدھی پنڈلی کو ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اِردگرد سے بے پرواہ ہو کر دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ چھن۔۔۔ چھن۔۔۔ چھن۔ پروفیسر صاحب اس کے والہانہ انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کے چہرے پر شکرگزاری کے تاثرات نمایاں تھے۔ زائرین اور دُکاندار اپنا کام چھوڑ کر اس کا رقص دیکھ رہے تھے۔ اِکا دُکا سکّہ اس سے ٹکراتا ہوا زمین پر گرتا، لیکن اسے کسی بات کی خبر نہ تھی۔ پروفیسر صاحب کی موٹر سائیکل کی گھن گرج بھی اس کی توجہ حاصل نہ کر سکی۔

؎ منم آں قطرۂ شبنم (میں شبنم کا وہ قطرہ ہوں)

بہ نوک خارمی رقصم (جو کانٹے کی نوک پر رقص کر رہا ہے)

سرِ بازاری رقصم (میں سرِ بازار رقص کر رہا ہوں)

یہ ریاض ہیجڑا تھا۔

جب پاکستان بنا تو ریاض بھی 'اُجڑ' کر فیروز پور سے گنڈا سنگھ والا آیا۔ سرحد کے پاس اسے 'ٹینکو' ملا۔ سنہری رنگت، جواب ٹیالی بھوری بن چکی تھی، والا دس سالہ لڑکا۔ مسلسل آنسو گرنے سے اس کے چہرے کی جلد پھٹ گئی تھی۔ پاؤں میں آبلے نہ جانے کتنی بار بن بن کر پھوٹ چکے تھے۔ ہونٹوں پر جمی پپڑیاں، مٹی کی اس پرت سے مشابہ تھیں جو زمین پر ٹھہرے ہوئے پانی کے سوکھ جانے پر نمودار ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی آنکھوں میں خوف جاگزیں تھا۔ جانے والوں کا دُکھ اس کے چہرے سے ہویدا تھا لیکن وہ بتانے سے قاصر تھا کیونکہ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔

ریاض ہیجڑے نے اسے گلے سے لگایا تو محبت کا سوتا، بہہ نکلا۔ ریاض تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ ماماتا ہے یا باپتا۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ وہ اس کا اپنا ہے۔ اسے اپنے چوڑے چکلے سینے میں چھپائے وہ پاکستان میں داخل ہوا اور باباجی کے مزار پر پناہ لی۔ نہ ٹینکو

کو پتا تھا کہ وہ کون ہے اور نہ ہی ریاض ہیجڑے کو بلکہ ریاض کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ خود کیا ہے؟ بہرحال دونوں ایک دوسرے کے سہارے آگے بڑھنے لگے۔ ریاض کی محبت، ٹینکو کے منہ سے الفاظ کی صورت میں ٹپکنے لگی۔ وہ ریاض کو ابا کہتا اور ریاض اسے اپنا ٹینک۔ ریاض نے سرحد پار کرتے ہوئے ایک ٹینک دیکھا تھا۔۔۔ مضبوط اور بے خوف، اسے یہ بچّہ بھی اپنی طاقت لگا۔۔۔ مضبوط اور بے خوف، اس کے بڑھاپے کی لاٹھی۔ اسے زندگی کا ہر پل اس کی محبت کے حصار میں محفوظ لگنے لگا۔ اس کا بیٹا، اس کا ٹینک۔۔۔ لوگوں نے اسے ٹینکو بنا دیا۔

یوں دونوں مزار پر رہنے لگے۔ مزار پر جو کھانا لوگ بھجواتے، اس میں ان کا حصّہ بھی شامل تھا۔ جب حالات قدرے بہتر ہوئے تو ریاض نے مزدوری شروع کر دی اور ٹینکو کو پرائمری سکول میں داخل کروا دیا۔ ہر جمعرات کو شام ڈھلے ریاض اپنی صندوقچی میں سے گھنگھروؤں کی جوڑی نکالتا اور مزار پر دھمال ڈالتا۔ بے سدھ۔۔۔ مدہوش۔۔۔ سراپا عقیدت۔ اس کے پاس اس ربّ کا شکر ادا کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا، جس نے اسے بیٹا دیا تھا۔ اس کے بڑھاپے کا مضبوط اور بے خوف آسرا۔۔۔ اس کا ٹینکو۔

وقت گزرتا رہا، ٹینکو نے پانچ جماعتیں پاس کر لیں۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ ٹیالی رنگت میں سنہرا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ ریاض نے اپنی جمع پونجی اکٹھی کی اور اسے، پان سگریٹ کا ایک کھوکھا مشن سکول کے نزدیک، سڑکوں کے دوشاخے کے پاس کھول دیا۔ اس دِن اس نے بڑے خشوع وخضوع سے دھمال ڈالی اور محلے کے جو بچّے اس کے اِردگرد اکٹھے ہو گئے تھے ان میں ٹافیاں اور گولیاں تقسیم کیں، اور کھوکھے کے سامنے والی کوٹھیوں میں دو دو لڈّو بھجوائے۔ آج وہ بہت خوش تھا۔

پھر جس دِن ٹینکو کو گیارہ آنے کمائی ہوئی، اسی دِن ریاض نے مزدوری چھوڑ دی اور ٹینکو کی دُکانداری میں اس کی مدد کرنے لگا۔ اس کا بیٹا اب کماؤ ہو گیا تھا۔

OO

شرمانا۔۔۔ لجانا۔۔۔گھبرانا۔۔۔ دروازے کی اوٹ سے تانک
جھانک، بیٹھے بٹھائے اچانک ٹھنڈی آہیں بھرنے لگنا۔۔۔اور کبھی جی بھر کے رونا، کسی بڑی
کلاس کی لڑکی کو دوسروں کے ہاتھ پیغام بھیجنا، کسی کو دیکھتے ہی کانوں کی لوؤں کا سرخ ہو
جانا۔۔۔اور پھر کبھی کبھار ایسے ہی کسی جوڑے کو، وارڈن کی تنبیہ۔

شیما بہت دِن تک یہ دیکھتی اور حیران ہوتی رہی، لیکن سمجھ نہ پائی کہ یہ سب کیا
ہے؟ پھر کچھ دِنوں کے بعد اسے معلوم ہوا کہ انھیں ایک مخصوص نام سے پکارا جاتا ہے۔۔۔
بوا اور پیاری۔ بڑی کلاس کی لڑکی بوا اور چھوٹی کلاس کی لڑکی پیاری اور جب کبھی کسی ایک کی
توجہ میں کمی پائی جاتی تو ازسرِنو داستانِ عشق دہرائی جاتی۔ بھیگی بھیگی آنکھیں، سرخ سڑسڑاتی
ناک اور ٹھنڈی یخ آہیں۔ چہرے پر ایسی بے چارگی کہ شیما کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ جاتی،
پھر جواب میں اس 'عشق گزیدہ' کی شدید زخمی نگاہیں کہتی دِکھائی دیتیں۔

''تمھیں ان معاملات کی کیا خبر؟۔۔۔کمبخت تو نے پی ہی نہیں۔''

شیما جب اس کے بارے میں سوچ سوچ کر ادھ موئی ہوگئی تو اسے خیال آیا کہ امّاں
کی مدد لینی چاہیے۔

''امّاں یہ بواء کسے کہتے ہیں؟''

''بیٹی، والد کی بہن، پھوپھی کہلاتی ہیں۔ کچھ گھرانوں میں انھیں بواء کہتے ہیں۔
آپ کی چونکہ کوئی پھوپھی نہیں ہیں، اس لیے آپ کو معلوم نہیں۔''

شیما کا ہنستے ہنستے دم اُلٹ گیا۔

''میرے سکول کی بہت سی لڑکیوں کی پھوپھیاں بھی اسی سکول میں پڑھتی ہیں۔
لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ کسی کی خالہ نہیں ہیں، سبھی کی پھوپھیاں ہیں، امّاں آخر یہ سب
کی پھوپھیاں ہی، یہاں کیوں پڑھ رہی ہیں؟''

امّاں کچھ سمجھ نہ پائیں اور جب سپورٹس ڈے پر مس چرن سے ان کی ملاقات
ہوئی تو انھوں نے پوچھا:

''آپ کے ہاں بواء کس کو کہتے ہیں؟''

جواب میں مس چرن کچھ نہیں بولیں لیکن شیما کو محسوس ہوا کہ وہ دھک سے رہ
گئیں۔

(اس میں اس قدر گھبرا جانے والی کیا بات ہے؟؟؟)

پھر آہستہ آہستہ شیما سمجھنے لگی، بلکہ بڑی کلاس کی بہت سی لڑکیوں نے تو اسے
'پیاری' کا درجہ دینے کی بھی کوشش کی لیکن 'مناسب' جواب نہ ملنے پر باتیں بنائیں، اسے
'مغرور' کا خطاب بھی مِلا، جسے شیما سمجھ نہ پائی کہ یہ 'غرور' کیا چیز ہے اور وہ کیسے اس کی مرتکب
ہو رہی ہے؟

سکول کی دیواروں پر لکھنا سختی سے منع تھا۔ یوں تو غسل خانوں کی دیواریں بھی،
اس حکم سے مستثنیٰ نہیں تھیں لیکن وہاں لکھتے ہوئے کوئی دیکھ نہیں پاتا تھا، اس لیے عجیب وغریب
پیغامات دیواروں پر لکھے ہوئے ملتے۔ شیما حیران تھی کہ اس قدر بدبو میں کون لکھتا ہے اور
کس کے پاس انھیں پڑھنے کا وقت ہوتا ہے؟ پھر ایک دِن جب تجسّس حد سے گزر گیا تو اس
نے ناک پر رومال رکھ کر انھیں پڑھنے کی کوشش کی۔

''فلاں بواء میں تمھیں بہت پیار کرتی ہوں۔''

اور

''فلاں پیاری میں تم پر جان دیتی ہوں۔''

(اس قدر بدبو کہ دماغ اُڑ جائے۔۔۔اور جان دینے کے ارادے توبہ توبہ۔۔۔
توبہ توبہ)

''پیاری رات کو میرے بستر میں آ جانا۔۔۔مس وارڈن سے آنکھ بچا کر۔''

(اور وہاں آ کر کیا کرنا؟؟؟)

یہ ایک بہت بڑا معمہ تھا، جسے شیما کبھی حل نہ کر پائی۔

یہاں ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بیکار نہ سمجھی جاتی تھیں۔ ان سے متعدد مقاصد پورے کیے جاتے۔ اوّل تو اس کے ایک ٹکڑے کو موم بتّی کے شعلے پر رکھ کر اسے بیضوی شکل کے حلقے میں تبدیل کیا جاتا اور پھر دوسری ٹوٹی ہوئی چوڑی کو اس میں سے گزار کر، ایک اور حلقہ بنا لیا جاتا۔ یوں جو زنجیر تیار ہوتی، اسے رات کے اندھیرے میں چپکے سے بواء کے سرہانے رکھ دیا جاتا، پھر منہ سے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور کہا بھی کیسے جا سکتا تھا؟ بے انتہا شرم جو آ رہی ہوتی تھی۔ بس یوں سمجھیے کہ 'ہر حلقۂ زنجیر' میں 'زبان' رکھ دی جاتی۔ بواء صبح سو کر اُٹھتی تو چارپائی پر پڑی اس زنجیر کو دیکھ کر 'محبت' کی 'بوچھاڑ' میں سر تا پا بھیگ جاتی۔

دوسرا استعمال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ٹوٹی ہوئی چوڑی کو ہتھیلی پر رکھ کر منہ میں کچھ بدبدایا جاتا گویا یہ محبت کو 'ناپنے' کی 'نیت' تھی جو زیرِ لب کی جاتی۔ 'آلہ مقیاس المطر' کی طرح کا یہ آلہ، بواء اور پیاری کے درمیان پائی جانے والی محبت کو ناپنے کے لیے اِستعمال کیا جاتا۔ پھر اسے ہتھیلی پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے دبا کر چوڑی کو توڑا جاتا۔ چوڑی ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ اگر ایک بڑی کرچی بھی نظر آتی تو یہ 'پیار' کی مقدار کو ظاہر کرتی کہ 'بہت ہے' اور اگر ایک چھوٹی کرچی نمودار ہوتی تو پاس بیٹھی ہوئی لڑکی یہ 'فلسفہ' بیان کر کے 'ڈھارس' بندھاتی کہ دراصل چھوٹی کرچی کا مطلب 'بہت زیادہ پیار' ہے۔ کیونکہ 'کرچی' اور 'پیار' میں 'معکوس' تعلق پایا جاتا ہے۔ جتنی کرچی چھوٹی، اِتنا زیادہ پیار اور تیسری صورت وہ تھی کہ اس 'عمل' کے دوران میں اگر ہتھیلی لہولہان ہو جاتی تو بواء اور پیاری کے درمیان 'بے محابا' پیار کے بارے میں کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ لہو کی سرخی اس راز کو راز نہیں رہنے دیتی تھی۔

شیما کے لیے یہ 'لاینحل' معاملہ تھا اور وہ اکثر اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

انہی خیالوں میں گُم، شیما نے سکول سے واپس آ کر کھانا کھایا، یونیفارم تبدیل کیا، سویٹر چڑھایا اور اپنی بلّی 'گاشی' کو اس میں اس طرح ڈال لیا کہ بلّی اس کے سینے سے چمٹی، اس کے منہ سے منہ ملائے، مندمند آنکھوں سے دیکھتی، باریک سی آواز میں میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ امّاں نے ٹوکا۔

''شیما، بلّی کا سانس اچھا نہیں ہوتا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں؟ اسے دُور کرو۔''

''امّاں اسے سردی لگ جائے گی۔''

''یہ سردی لگنے کا اندیشہ، تمہارے سکول سے واپس آنے کے بعد ہی کیوں بڑھ جاتا ہے؟ صبح سے تو انہیں کچھ ہوا نہیں۔ آرام سے اپنی ٹوکری میں گدی پر لیٹی، استراحت فرماتی رہی ہیں۔''

امّاں ہنس ہنس کر گلابی ہو رہی تھیں۔

''اور اس کے بالوں سے 'نجیراں☆' ہو جانے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔''

اللہ رکھی نے اپنی 'حکمت' سے مستفید کرتے ہوئے کہا۔

''کیا؟؟ جزیرہ؟؟؟ شیما کو جزیرہ ہو جائے گا؟ مگر کیسے؟'' سرمد حیرانگی سے بولا۔

اللہ رکھی کی آنکھ میں سیاہ تل تھا اور چاچا فیروز نے بتایا تھا کہ جس کی آنکھ میں سیاہ تل ہو، اس کی کہی ہوئی ہر بات پوری ہو جاتی ہے۔ اس لیے سرمد، اس سے خائف ہی رہتا تھا۔

امّاں نے کہا۔

''یک نہ شد دو شد۔۔۔ بھئی یہاں تو سبھی باکمال لوگ ہیں۔'' اور ہنستے ہنستے اُٹھ گئیں۔

اِتنی دیر میں ندرت چلی آئی اور دونوں سہیلیاں تالیاں بجاتی، ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی، گول گول گھوم کر کھیلنے لگیں۔

☆ گلے میں نمودار ہونے والی گلٹیاں جو دراصل ٹی۔بی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

ے چل چل چنبیلی باغ میں

تجھے جھولا جھلاؤں گی

جھولے کی رسّی ٹوٹ گئی

تجھے میوہ کھلاؤں گی

میوے کی ٹہنی ٹوٹ گئی

چادر بچھاؤں گی

چادر کا کونا پھٹ گیا

درزی بلاؤں گی

درزی کی سوئی ٹوٹ گئی

گھوڑے دوڑاؤں گی

گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی

ہلدی لگاؤں گی

ہلدی کا رنگ پھیکا

بلبل کے لال ٹیکا

تھوڑی دیر تک قاری صاحب، انھیں قرآنِ پاک پڑھانے کے لیے آنے والے تھے۔ سرمد اور یہ دونوں، ایک ساتھ ہی ان سے پڑھتی تھیں۔ قاری صاحب کے آنے سے پہلے ندرت دیوار پھاند کر ادھر ہی چلی آتی۔ وہ پہلے قرآنِ پاک پڑھتیں اور اس کے بعد ہوم ورک کرتیں، جس میں امّاں ان کی مدد کرتیں اور پھر دونوں اس وقت تک کھیلتی رہتیں، جب تک ڈی۔ ایس۔ پی صاحب کا اردلی ندرت کو بلانے نہ آجاتا۔ لیکن ندرت اس کے ساتھ جانے کی بجائے، دیوار پھاند کر ہی واپس جاتی۔

قاری صاحب آئے تو سرمد غائب تھا۔ قاری صاحب نے پوچھا تو اللہ رکھی نے

جواب دیا۔

''قاری صاحب وہ 'روس' گیا ہے۔''

قاری صاحب حیران رہ گئے مگر چپ رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد، سرمد بھی منہ پھلائے، سیپارہ اُٹھائے چلا آیا۔

اللہ رکھی چائے لے کر آئی تو قاری صاحب نے کہا۔

''اری تو تو کہہ رہی تھی کہ وہ روس گیا ہے۔۔۔ وہ تو یہاں بیٹھا ہے، میرے پاس۔''

ندرت اور شیما نے کھی کھی، کھی کھی، شروع کر دی کیونکہ انھیں تو معلوم تھا کہ اللہ رکھی نے دراصل 'رُوٹھ' جانے کی پنجابی 'رُس' جانا کو اپنی دانست میں، اُردو جامہ پہنایا تھا۔

قاری صاحب کے جانے، ہوم ورک کر لینے اور ندرت کے واپس جانے کے بعد، شیما امّاں کے پاس بیٹھ گئی۔

''امّاں، مجھے ان قاری صاحب سے نہیں پڑھنا۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔

''کیوں بیٹا؟ وہ تو اتنے اچھے ہیں!''

''نہیں، امّاں آپ کو نہیں معلوم۔۔۔ وہ بہت برے ہیں۔'' شیما کے لہجے سے یاسیت ٹپک رہی تھی۔

امّاں دھک سے رہ گئیں۔ اِن حضرات سے منسلک کئی قصے، ان کے ذہن میں گھوم گئے۔

''آخر ہوا کیا ہے؟'' امّاں کے چہرے پر سرسوں پھولی ہوئی تھی۔

''وہ آج۔۔۔ آج جب آپ نے ان کے لیے چائے بھیجی تو پتا ہے کیا ہوا؟۔۔۔ انھوں نے۔۔۔ انھوں نے۔۔۔'' شیما کی آواز ہچکولے کھا رہی تھی۔

''شیما۔۔۔ کچھ بتاؤ گی بھی یا؟'' امّاں نے بے تابی سے کہا۔

''امّاں، انھوں نے گلاب جامن، چائے میں ڈبو کر کھائی۔'' شیما کے حلق سے

گھٹی گھٹی سی چیخ برآمد ہوئی۔

امّاں نے اطمینان کی لمبی سانس بھری۔

رات کو امّاں نے ابا میاں سے بات کی تو وہ بہت ہنسے۔ کہنے لگے۔

''سرمد صاحب بہادر کو بھی ایسے ہی مسائل درپیش رہتے ہیں۔ صبح مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ طوطا گرنے سے آدمی مرجاتا ہے کیا؟ میں نے کہا نہیں، تو کہنے لگے۔

''لیجیے، وہ تو پانچ آدمی اکٹھے مر گئے۔ میں نے خود ریڈیو کی خبروں میں سنا ہے۔''

پھر مجھے اندازہ ہوا کہ دراصل وہ 'تودہ' کہنا چاہ رہے تھے۔

شیما البتہ اُردو کو بہتر سمجھتی اور سیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کل میں فیض کو پڑھ رہا تھا۔ میرے سامنے کھلے ہوئے صفحے پر شعر تھا:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دِل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

کہنے لگیں ''ابا میاں آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟۔۔۔ اور آپ کو یہ سب سمجھ کیسے آجاتا ہے؟''

میں نے کہا ''بیٹی جب آپ پڑھیں گی تو آپ کو بھی سمجھ آجائے گا۔ آیئے پڑھیے۔''

اب انھوں نے پڑھ تو روانی سے لیا لیکن ظاہر ہے سمجھ نہیں پائیں۔ پوچھنے لگیں۔

''ابا میاں یہ لوح و قلم اور رقم کیا ہے؟''

میں نے کہا ''لوح و قلم کے معنی تختی اور قلم ہیں اور رقم کا مطلب ہے لکھنا۔ اب کافی دیر جوڑ میل کرنے کے بعد، کہنے لگیں۔

''تو۔۔۔ شاعر لوگ بھی تختی لکھتے ہیں کیا؟ یہ کس سکول میں پڑھتے ہیں جہاں بڑے ہو کر بھی تختی لکھنا پڑتی ہے۔ میں تو اس سکول میں نہیں جاؤں گی۔''

OO

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
پیار کیا کوئی چوری نہیں کی
چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا

ٹینکو کے، پان سگریٹ کے کھوکھے پر رکھے ریڈیو پر، گانا پوری آواز سے بج رہا تھا۔

''ابا، اب چپ رہنا۔۔۔ مجھے یہ گانا اچھی طرح سننے دینا۔''

ریاض ہیجڑا بنچ کے کونے پر افسردہ بیٹھا تھا۔ اس نے ایسی نظروں سے ٹینکو کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

''ابا چپ ہی تو ہے۔''

جلتی ہوئی سگریٹ اس کے ہاتھ میں سلگ سلگ کر بس اُنگلیوں کو چھونے ہی والی تھی۔ نہ اس نے کسی سے پیار کیا تھا اور نہ کسی نے اس سے۔ لیکن وہ آج کل ٹینکو کی طرف سے بہت پریشان تھا۔ وہ نہ تو کھوکھے پر ٹک کر بیٹھتا تھا اور نہ ہی اس سے باتیں کرتا تھا۔ کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور کبھی آہیں بھرنے لگتا۔ اسے پانچ نمبر گلی میں بھی بار بار کام پڑنے لگا تھا۔

ریاض انھی خیالوں میں گم بیٹھا تھا کہ فیروز چاچا نے اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں کے سامنے، ایک ڈھکی ہوئی پلیٹ گھمائی تو جیسے اس کی آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی۔ اس نے بے صبری سے چاچا کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی۔ دیسی گھی میں پکے، بادام پستہ سے بھرپور سنہری، گرم، خوشبودار گُڑ کے چاول۔۔۔ اشتہا، ریاض ہیجڑے کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ اس نے پلیٹ چاچا فیروز کے ہاتھ سے لے لی، اسے بنچ پر رکھا اور ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی۔ چہرہ آسمان کی طرف اُٹھایا تو دو آنسو اس کی گالوں پر بہہ نکلے۔

''ابا اگر تمہیں چاول دیکھ کر رونا ہی ہوتا ہے تو میں فیروز چاچا کو منع کر دیتا ہوں کہ آئندہ چاول نہ لائیں۔'' ٹینکو نے بے ڈھنگے پن سے ریاض کی طرف دیکھ کر جلتے ہوئے

لہجے میں کہا۔

ریاض ہیجڑے نے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے کہ رہا ہو، تمہیں ان باتوں کی کیا خبر۔۔۔

ریاض چاول کھاتے کھاتے پرانے زمانے میں کھو گیا۔

''اس بے قدرے نے ایک نوالہ نہیں لیا۔ اللہ پروفیسر صاحب کو ترقی دے، بڑے نیک بندے ہیں، جو ہمارا خیال رکھتے ہیں۔''

چاول ختم کر کے اس نے دیسی گھی میں سنے ہاتھ ملے اور پھر سے دُعا کے لیے اُٹھا دیئے۔

ریاض کبھی بھوکا نہیں رہا تھا۔ لیکن اس محبت سے گھر کے پکے ہوئے کھانے، اس کے نصیب میں نہیں تھے۔ پر اَب وہ سوچنے لگا تھا کہ بہو آئے گی تو وہ بھی گھر کے پکے کھانے کھائے گا۔

چاچا فیروز نے پلیٹ واپس لا کر اللہ رکھی کو دی تو اس نے اسے دھو کر رکھا اور اماں کے پاس چلی آئی۔

''اماں میں نے اپنی سہیلی کو خط لکھوانا ہے۔ جب آپ فارغ ہوں تو لکھ دیں۔'' اللہ رکھی نے کہا۔

''بیٹا، میں فارغ ہوں، ابھی لکھ دیتی ہوں۔ لیکن بات یہ ہے کہ تمہیں خود لکھنا سیکھنا چاہیے اور تم ہو کہ ادھر دھیان ہی نہیں دیتیں۔''

''اماں، میرا سب کام کرنے کو دِل چاہتا ہے۔ نہیں چاہتا تو پڑھنے کو۔۔۔ کیا کروں؟''

''لکھنے پڑھنے کو تو بہت سے لوگوں کا دِل نہیں چاہتا لیکن تمہاری طرح ماننا کوئی، کوئی ہے۔'' اماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اللہ رکھی، پیڈ اور پین لے آئی اور لکھوانا شروع کیا۔

''اُوپر لکھیں جی 786۔''

''اس کا کیا مطلب ہوتا ہے، اللہ رکھی۔''

''مطلب کا تو مجھے پتا نہیں۔ سارے ایسے ہی لکھتے ہیں، کچھ اچھا مطلب ہی ہو گا۔ پھر لکھیں جی۔

'میری پیاری سہیلی شمیم اختر کو میرا اسلام پہنچے۔ خیریت بخیریت کے بعد عرض ہے کہ کئی دِن ہو گئے تمہارا خط نہیں مِلا۔ کیا بات ہے؟ میں بہت پریشان ہوں۔ دوپٹے کے لیے کروشیے کی بیل جو تمہیں بنانے کو کہا تھا، وہ تم نے بنائی کہ نہیں؟ جب پوری ہو جائے تو میرے گھر بھجوا دینا۔ ابا مجھے دے جائے گا۔ اگر میری اماں کو پسند آئی تو انھیں بھی بنا کر دینا۔''

''نہیں اللہ رکھی، کیوں اسے تکلیف دیتی ہو؟ تم خود سیکھو، پھر مجھے بنا کر دینا۔''

''لیں، اسے کیا کام ہے؟ سارا دِن فارغ ہی تو رہتی ہے۔۔۔ ہاں جی اور لکھیں۔

؎ چاندنی چاند سے ہوتی ہے ستاروں سے نہیں
دوستی ایک سے ہوتی ہے ہزاروں سے نہیں

اس بار ابا مجھے ملنے آئے تو اس کے ساتھ ضرور آنا۔

؎ شیشی بھری گلاب کی پتھر پہ چُور ہے
میں رو رہی ہوں، میری سہیلی مجھ سے دُور ہے

اور:

؎ شیشی بھری گلاب کی پتھر پہ توڑ دوں گی
اگر تم نے جواب نہ دیا تو خط لکھنا ہی چھوڑ دوں گی

اب میں ختم کرتی ہوں۔ اپنی امّی کو میرا اسلام دینا۔ میرے تھوڑے لکھے کو زیادہ سمجھو، پگ کو دستار سمجھو، خط کو تار سمجھو۔ جواب جلدی دینا۔

؎ باغ لگے، باغیچہ لگے، بیچ میں لگے انگور
چار پیسے کی فکر نہ کرنا، خط لکھنا ضرور

فقط تمہاری سہیلی اللہ رکھی

سے روٹی ہے گرم، بُرکی توڑی نہیں جاتی

بچپن کی دوستی چھوڑی نہیں جاتی''

امّاں نے ہنستے ہنستے خط ختم کیا اور لفافے میں بند کر دیا۔ تو اللہ رکھی، اسے پوسٹ کرنے کے لیے، چاچا فیروز کو دینے چلی گئی۔

○○

امّاں بہت اچھی سلائی کرتی تھیں۔ شیما نے انھیں Mother Goose (بچّوں کی اِنگلش نظموں کی کتاب) سے Little Bo Peep (نظم کا ایک کردار) کا فراک دِکھایا۔ لمبا، جھالروں والا، اس میں دو تین طرح کا پھول دار کپڑا اِستعمال ہوا تھا۔ امّاں نے بالکل ویسا ہی فراک تیار کر دیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔ حقیقت تصویر سے بہتر تھی۔ ساتھ میں ویسی ہی ایک ٹوپی بھی۔ اب شیما بی بی نے وہ فراک پہنا، ٹوپی لی، فلیٹ بوٹ پہنے اور ابّا میاں کی چھڑی تھام کر باہر نکلی۔ اب اسے ایک بھیڑ کی تلاش تھی۔ گھر میں بھیڑ تو تھی نہیں، البتہ بھینس بندھی تھی لیکن اس کا وہ کیا کرتی؟ ایسے نادرِ روزگار خیالات اسی کے ذہن رسا کی پیداوار تھے۔ اس سے پیشتر کہ مایوسی اسے آن گھیرتی، وہ چاچا فیروز کا سائیکل 'قینچی' چلاتی ہوئی سکول کے ہاسٹل جا پہنچی۔ اگرچہ لمبے اور گھیر دار فراک نے راستے میں اسے بہت تنگ کیا۔ وہ بار بار سائیکل کی چین میں پھنسنے کی کوشش کرتا رہا۔

چاچا فیروز کی ڈیوٹی تھی کہ وہ شیما بی بی کو سکول پہنچا کر آئیں اور شیما بی بی کا انداز یہ ہوتا کہ خود تو قینچی سائیکل چلاتی سکول جاتی اور چاچا فیروز بستہ تھامے پیچھے پیچھے۔ واپسی پر جب چاچا فیروز سائیکل پر بیٹھ کر گھر واپس جاتے تو شیما حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہتی اور سوچتی کہ نجانے کب اس کی ٹانگیں لمبی ہوں گی اور کب وہ قینچی سائیکل چلانا چھوڑے گی؟

اتوار کو سائیکل چلاتے چلاتے، شیما اور ندرت سکول کا چپّہ چپّہ چھان مارتیں۔

کمپاؤنڈ کے عقب میں سکول کے نچلے عملے کے گھر تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھر، ایک کمرہ، اس کے سامنے برآمدہ جس کے ساتھ باورچی خانہ تھا۔ صحن کافی کشادہ تھا جس کے ایک کونے میں غسل خانہ تھا۔ قدِ آدم دیواروں میں گھرے ہوئے صحنوں کو سبھی نے بہت صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ دو مالی، چار آیائیں، صفائی کرنے والوں کے دو گھرانے، کینٹین والے 'انکل' اور 'آنٹی'، باورچی اور چوکیدار وغیرہ، اچھا خاصہ محلّہ آباد تھا۔ شام کے وقت سبھی گھروں میں دوبارہ جھاڑو لگائی جاتی۔ صحنوں میں چھڑکاؤ کیا جاتا۔ بچّوں کے ہاتھ منہ دُھلا کر، سرسوں کے تیل میں پانی کو اچھی طرح مِلا کر ان کی لپائی کی جاتی۔ رات کے کھانے کی تیاری میں چولہوں سے اُٹھتا دھواں اور بچّوں کا شور۔ شیما کو یہ منظر ویسا ہی لگتا، جیسے شام کے دُھندلکے میں بانس کے جھنڈ پر بیٹھنے والی بے شمار چڑیوں کی چہکار۔

یہ سب مس ایسل کی ہدایت پر کیا جاتا اور اس پر سختی سے عمل درآمد اس لیے کیا جاتا کہ مس ایسل کسی بھی وقت آ کر ملاحظہ کر سکتی تھیں۔ کبھی کبھار ہی ہوتا کہ وہ اِدھر کا چکر نہ لگاتیں۔

مائیں ان چپڑے ہوئے طباق 'چاند سے چہروں' کی چٹ چٹ بلائیں لیتیں۔

مالی صاحب کے بچے چلّاتے۔

''ممّا چاکلیٹ۔''

اور 'ممّا' سیاہ گڑ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھالی میں رکھ کر لے آتی۔ بچّوں کو دیتے ہوئے، شیما اور ندرت کو بھی پیشکش کی جاتی جو ندرت بلا جھجک قبول کر لیتی۔

یہ دونوں، ان لوگوں کی باتیں سن کر بہت ہنستیں۔

باورچی صاحب کی بیوی اپنے بیٹے کو دُکان سے کوئی چیز لینے بھیجتی تو اسے پیسے دے کر جلدی آنے کا کہتی اور پیچھے سے آواز لگاتی۔

''وے بنٹو۔۔۔ 'روڈے روڈے' نہ جائیں 'پاتھے پاتھے' جائیں۔'' (Road سے نہ جانا۔۔۔ Path سے جانا)

باورچی صاحب کی بیوی شکایت کرتی۔

"رات بہت سردی تھی اُوپر سے 'ڈوراں دے ہولاں' (Door کے Hole) سے ہوا اندر آتی رہی، مجھے تو نیند ہی نہیں آئی۔"

کینٹین والی آنٹی آواز لگاتیں۔

"نی ریتاں۔۔۔آج 'چرچ' نہیں جانا۔ پچھلے 'سنڈے' بھی تو نہیں گئی تھی۔"

○○

گرمیوں کی چھٹیوں میں سکول کا کام، شیما اور سرمد، عقبی احاطے میں کسی درخت کے نیچے دری بچھائے کیا کرتے۔ صبح ناشتے کے بعد دس بجے، وہ کتابیں لیے یہاں پہنچ جاتے اور پھر ایک بجے تک جم کر پڑھائی ہوتی۔ خیر ایسی جم کر بھی نہیں، درمیان میں کھیل کود، کچی امبیاں اور پکی جامنیں کھانے، کپڑوں پر اودے داغ لگانے، چڑیا اور لگل دم کے بچوں کو ان کے گھونسلوں سے نکالنے اور خدانخواستہ موت کی صورت میں، ان کی شایانِ شان تدفین کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ اس جواں مرگ پرندے کی بے وقت موت پر جھوٹ موٹ کے آنسو بہاتے ہوئے اس کے 'مزار' پر گلاب کے پھولوں کی پتیاں بکھیری جاتیں اور چھڑکاؤ کرنے کے بعد، حتی المقدور اگربتیاں اور چراغ جلانے کا بھی اہتمام کیا جاتا۔

امّاں، باورچی خانے کا پچھلا دروازہ کھول کر، حسبِ ضرورت شاباش یا سرزنش کا فرض نبا ہتیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ابا میاں اور امّاں قیلولہ کے لیے لیٹ جاتے تو سرمد اور شیما دبے پاؤں کمرے سے نکلتے اور اللہ رکھی کی سربراہی میں پھر احاطے میں موجود ہوتے، جہاں مہترانی کا بیٹا چھندا پہلے سے منتظر ہوتا۔ اس کی فنی مہارت کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے انگریزی حرف 'Y' کی شکل کی شاخیں کاٹی جاتیں اور چاچا فیروز کے سائیکل کی پرانی ٹیوب کاٹ کر غلیلیں بنائی جاتیں اور پھر وہ چکنی مٹی، جو ہنڈیا کے نیچے لیپ کرنے کے لیے

اور خاص منگوائی جاتی تھی، اللہ رکھی، بکمال مہربانی مرحمت فرماتی، نہ صرف یہی بلکہ اسے گوندھ کر غلّے بنا دیتی۔ چھندا چھوٹی چھوٹی خشک شاخیں جمع کرتا اور خشک ہو جانے والے غلّوں کو ان پر ترتیب دے کر آگ سلگا دیتا۔ دن ڈھلنے تک سرخ سرخ غلّے پک کر تیار ہو جاتے، جن کے بارے میں چھندا کا خیال تھا کہ بندوق کی گولی سے یقیناً بہتر ہیں۔ اوّل تو ان کی چوٹ کھا کر فاختائیں بچیں گی نہیں اور اگر شومئی قسمت سے بچ بھی گئیں تو اپنے گھر جا کر پانی پیتے ہی پٹ سے جان، جان آفرین کے سپرد کر دیں گی۔

نرم زمین کھود کر چھندا کھائے ہوئے آموں کی گٹھلیاں اس میں دبا دیتا اور باقاعدگی سے ان پر پانی کا چھڑکاؤ کرتا اور جب چند روز کے بعد نرم مٹی کی تہہ ہٹا کر، زمین کا سینہ چیر کر ایک کونپل نمودار ہوتی تو شیما کی مارے خوشی کے چیخ نکل جاتی۔

"چھندا جلدی سے آؤ۔ دیکھو یہ آم کی شاخ پھوٹ رہی ہے۔"

چھندا بڑی سنجیدگی سے صورتِ حال کا جائزہ لیتا، ماہرانہ انداز میں آہستگی سے مٹی ہٹاتا اور ایک ان چھوئی، ملائم سی کونپل سے جڑی ہوئی گٹھلی احتیاط سے نکال لیتا، پھر اسے دھو کر آم کے درخت کے تنے کی چھال پر رگڑ کر سیٹی بناتا، اسے بجا کر دیکھتا اور شیما کے حوالے کر دیتا۔ اس کے چہرے پر عجب طمانیت کی پرچھائیں ہوتی اور انداز 'سپردم بتو مایہ خویش را' والا۔

اور جب وہی سیٹی شیما بجاتی تو اللہ رکھی کا دل چاہتا کہ وہ چھندا کو قتل کر دے۔ اس وقت تو وہ کچھ کہہ نہ پاتی، البتہ اتوار کو اسے نہلاتے ہوئے سارا بدلہ اُتارتی۔

"آج تجھے میں خود نہلاؤں گی۔ تجھ سے چوہڑوں جیسی بُو آتی ہے۔ ایک تو پڑھتی ان کے سکول میں ہے اُوپر سے چھندا کی بنائی ہوئی 'پیپنی' بجاتی ہے۔"

شیما احتجاج کرتی لیکن اللہ رکھی، سوکھی ہوئی توری اور جھانوے کا بے دریغ استعمال کر کے اسے ہفتہ بھر کے لیے 'پاک' کر دیتی۔

چھندا کو کہیں سے گرا پڑا کانچ کا رنگین ٹکڑا مل جاتا تو اس کی زندگی رنگین ہو جاتی۔

پھول کبھی نیلے ہوتے تو کبھی سبز، اس کا انحصار کانچ کے اس ٹکڑے کے رنگ پر ہوتا جو وہ سارا وقت ایک آنکھ بند اور دوسری چندھیا کر اس کے سامنے رکھے رہتا۔

چھندا کے 'جملہ کمالات' میں سے ایک، بھڑ کی ٹانگ پر دھاگہ باندھ کر اسے مائل پرواز کرنا بھی تھا۔ اُڑتی ہوئی بے چاری بھڑ اگر کبھی چھندا کے دائرۂ اختیار میں آ جاتی تو وہ اسے ہوا میں ہی ایک جھانپڑ رسید کرتا اور جب وہ منہ کے بل زمین پر گرتی تو اسے احتیاط سے اپنی قمیض کے دامن میں پکڑ لیتا اور اس کی دُم میں گڑا، اس کا ڈنک کھینچ کر باہر نکال دیتا۔

اسے دیکھ کر شیما کی چیخ نکل جاتی۔

''چھندا، یہ تمہیں کاٹ لے گی۔''

لیکن چھندا ایک فاتح جرنیل کی طرح تفاخر سے سینہ پُھلا لیتا۔ سرمد بھاگ کر جاتا اور اماں کے سلائی والے ڈبّے سے دھاگہ لے آتا جو چھندا بھڑ کی ایک ٹانگ پر باندھ دیتا اور اس کا دوسرا سرا سرمد کے ہاتھ میں تھما دیتا اور یوں وہ بھڑ ساری دوپہر، ان کے اِردگرد منڈلاتی رہتی۔

کبھی کبھار کوئی بلب فیوز ہو جاتا تو چھندا کے ہاتھ تو گویا خزانہ لگ جاتا۔ ندرت بھی اپنے گھر سے فیوز بلب کا تحفہ ضرور لاتی۔ چھندا احتیاط سے اس کا بند سرا کھولتا کہ کہیں وہ پھوٹ نہ جائے۔ پیتل کے گول چکّر میں سوراخ کر کے رسّی پروئی جاتی۔ شیما، باورچی خانے کی الماری میں رکھی، رنگوں کی شیشیوں میں سے کوئی اُٹھا لاتی۔ کبھی گلابی، کبھی پیلا اور کبھی نیلا رنگ۔ ان رنگوں سے اللہ رکھی اپنے ململ کے دوپٹے رنگتی، انہیں کلف لگاتی اور ابرق کا چھڑکاؤ کرتی تو شیما کا دِل چاہتا کہ وہ بھی یہ دھنک رنگ دوپٹے اوڑھنے لگے۔ کبھی کبھار وہ اللہ رکھی سے دوپٹہ مانگ کر اوڑھتی اور سج دھج کر ندرت کے گھر جاتی۔ فراک، بوٹ، جرابیں اور سر پر مکلف دوپٹے کی بُکل۔ ندرت کی امّی خوب ہنستیں اور اسے گلے سے لگا لیتیں۔

ادھر جب اللہ رکھی کو خبر ہوتی کہ اس کا رنگ چرایا جا چکا ہے تو وہ بڑی بطخوں کی طرح

قیں قیں کرتی، چھندا کے پیچھے بھاگتی کہ اس تمام کارروائی کا 'ماسٹر مائنڈ' وہی ہوتا۔

چھندا اور سرمد بلب کی رسّی کو یوں تھامتے کہ بلب ان دونوں کے درمیان لٹک رہا ہوتا اور وہ باقاعدہ پاؤں سے پاؤں ملا کر پریڈ کرتے ہوئے، پچھواڑے کا چکر لگاتے۔ شیما اور ندرت، ایک طرف کھڑی کھلکھلاتی رہتیں۔ پھر سب مِل کر دُعا کرتے کہ اگلے اتوار تک کم از کم ایک بلب اور فیوز ہو جائے اور اگر بڑا والا ہو جائے تو کیا بات ہے۔ اس طرح بلبوں کے ہار میں، کوہِ نور ہیرے کا اضافہ ہو جائے گا۔

چھٹیوں کے بعد سکول دوبارہ کھلا تو شیما کو بہت اچھا لگا۔ یہاں کا ماحول اتنا اچھا تھا کہ اسے سکول جانا کبھی بھی بوجھ نہیں لگا تھا۔ وہ خوش تھی کہ ٹیچرز اور دوستوں سے ملاقات ہو گی۔ پڑھائی ہو گی۔ ڈرامے اور تقریریں ہوں گی۔ سپورٹس ڈے ہو گا۔ شام کو ہاسٹل میں رونق ہو گی اور سائیکل چلانے میں مزا آئے گا۔

اور جب پہلے ہی روز، سائنس کی کلاس شروع ہوئی تو ندرت نے، شیما کو آہستہ سے ٹہوکا دیا۔ سائنس کی نئی ٹیچر آئی تھیں۔ بہت موڈرن سی۔ سلیولیس بلاؤز، اُونچی ایڑی کے جوتے، کٹے ہوئے بال اور کانونٹ کا مخصوص لہجہ۔۔۔ 'تو سن نا! مما لوگ، ٹچ وڈ (Touch Wood)، وہاٹ ایور (What ever) اور سو وہاٹ (So What) وغیرہ'۔

ایسی تو کوئی ٹیچر پہلے سکول میں نہیں تھیں۔

لیکن پریکٹیکل کے دوران میں جب انھوں نے کہا۔

''ایسڈ (تیزاب) کو 'تُبکا تُبکا' (قطرہ قطرہ) کر کے ڈالنا ہے۔''

تو شیما 'دنگ' رہ گئی۔ اسے دھچکا سا لگا۔

''ارے یہ تو 'ریتاں' ہی نکلیں۔''

حالانکہ اس کی دوسری ٹیچرز جو اگرچہ سادہ مزاج تھیں، پھر بھی اُردو بہت اچھی بولتی تھیں۔

OO

چھن، چھن، چھن، اپنے کھوکھے سے چند قدم کے فاصلے پر ریاض ہیجڑا سرمستی میں ناچ رہا تھا۔ گھنگھرو، اس کی آدھی پنڈلی کو ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ ارد گرد سے بے پرواہ ہو کر، دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ چھن، چھن، چھن۔۔۔ بچّے اس کے گرد جمع ہو کر اس کا رقص دیکھ رہے تھے۔ لیکن اسے کسی بات کی خبر نہیں تھی۔

چاچا فیروز نے گھر کا اندرونی دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

''ذرا بیگم صاحبہ کو بلاؤ۔'' انھوں نے اللہ رکھی سے کہا۔

اللہ رکھی نے ان کی پریشانی بھانپ کر، اماں کو جلدی سے بلا دیا۔ ورنہ وہ اتنی آسانی سے ان کی بات ماننے والی نہیں تھی۔

اماں آئیں تو چاچا فیروز نے کہا۔

''بیگم صاحبہ، بری خبر ہے۔ ٹینکو قتل ہو گیا ہے۔''

''اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔۔۔ کس نے کیا بھائی صاحب اور کیوں؟''

''وہ آج رات حسبِ معمول اپنے کھوکھے کے پاس، سڑک کے کنارے سو رہا تھا۔ کسی نے گنڈاسے کے وار کر کے اس کا سر اڑا دیا۔ ریاض تو مسجد میں سوتا ہے۔ صبح وہ آیا تو اس نے دیکھا۔ رات کے کسی پہر، ٹینکو چل بسا تھا۔ اس قتل کا گواہ تو کوئی نہیں ہے، لیکن سب کہتے ہیں کہ پانچ نمبر گلی میں رہنے والے، دو بھائیوں نے کیا ہے۔ لڑکی کا مسئلہ تھا۔'' چاچا فیروز نے دبی زبان میں کہا۔

اِتنی دیر میں چھندا بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹافیاں اور بسکٹ کا ڈبہ تھا۔

''چاچا جی، ریاض نے سارا کھوکھا خالی کر دیا ہے۔ سب چیزیں بچّوں کو دے دی ہیں اور خالی کھوکھا چھوڑ کر، بابے کے مزار پر چلا گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں صرف گھنگھرو تھے۔ پولس کے سپاہی، ٹینکو کو لے گئے ہیں۔''

OO

اتوار کی صبح چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ آج دوپہر کے کھانے، پر ابّا میاں کے کوئی پرانے دوست آنے والے تھے۔ اللہ رکھی نے شور مچا مچا کر، دونوں بچّوں کو نہلایا اور یوں اپنی دانست میں شیما کو 'پاک صاف' اور سرمد کو 'صاف ستھرا' کر دیا۔ اسے دوپہر کا کھانا بنانے میں اماں کی مدد کرنا تھی۔ آج سرمد کی فرمائش پر، ناشتے میں آلو کے پراٹھے بنے تھے اور ساتھ میں 'اندرسے' جو کہ شہر کی سوغات تھی۔ ایک اتوار کو سرمد کی فرمائش پوری ہوتی تھی تو دوسری کو شیما کی۔

اتنی دیر میں ندرت نے دیوار پھاندی۔

''چلو، چلو Sunday Church نہیں جانا کیا؟''

''ہاں، ہاں جاؤ تمھاری عبادت رہی جاتی ہے۔''

اللہ رکھی بڑبڑائی۔

''نہ دِل جلایا کرو اللہ رکھی۔۔۔ بچّیاں ہیں اور پھر کوئی اچھی بات ہی سیکھتی ہیں۔ مذہب کوئی بھی بُرا نہیں ہوتا۔'' پروفیسر صاحب نے آہستگی سے کہا۔

ندرت اور شیما اسے اجازت سمجھتے ہوئے بھاگیں۔ ہارمونیم اور طبلے کی آواز آ رہی تھی۔ دونوں آہستگی سے چلتی ہوئی، سٹیج کے پاس والے دروازے سے اندر جھانکنے لگیں۔ پادری صاحب کے چہرے پر نرم مسکراہٹ اُبھری اور انھوں نے سر کے اِشارے سے، ان ننھے مہمانوں کو اندر آنے کی دعوت دی۔

ان دونوں کو جگہ ڈھونڈنے میں دُشواری نہیں ہوئی۔ ایک سیٹ خالی تھی، دونوں اسی میں سما گئیں۔ پادری صاحب نے دھیمی اور گمبھیر آواز میں دُعائے ربّانی شروع کی۔ ندرت اور شیما نے بھی سر جھکا لیا۔

'اے ہمارے باپ

تو جو آسمان پر ہے

تیرا نام پاک مانا جائے

تیری بادشاہت آئے

تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے۔

زمین پر بھی ہو۔

تو ہماری روز کی روٹی آج ہمیں بخش دے۔

ہمیں آزمائش میں نہ ڈال

بلکہ برائی سے بچا۔'

محفل برخاست ہونے سے پہلے پادری صاحب نے اعلان کیا کہ آج سکول کے کلرک مسٹر ڈیوڈ جارج کی شادی ہاسٹل پرچیزر جیکب صاحب کی بیٹی مس جوزفین جیکب، جو سکول میں ٹیچر ہیں، سے ہونے والی ہے۔''

مارے خوشی اور حیرت کے بچیوں کی چیخ ہی تو نکل گئی۔

''ارے ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔۔۔ہماری ٹیچر کی شادی؟''

ان بن بلائے مہمانوں نے اپنی سیٹ میں دُبک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

جب عبادت کے لیے آنے والے لوگ رُخصت ہوئے تو مہمانوں نے آکر بیٹھنا شروع کیا۔ دُلہا دُلہن کے گھر والوں کے علاوہ بیشتر لوگ سکول سے ہی تھے۔ مس ایسل بھی خاص طور پر تیار ہو کر آئی تھیں۔ بادامی رنگ کا سکرٹ، جس پر دھیمے گلابی رنگ کے چھوٹے چھوٹے گلاب تھے۔ گلے میں سفید موتیوں کی لڑی۔ مس چرن، مس ہزارہ، مس پال، مس ایگنس۔۔۔ سبھی خوب سج بن کر آئی تھیں۔

اور پھر ان لوگوں نے دیکھا کہ مسٹر ڈیوڈ کالا سوٹ پہنے کالی بو لگائے مس جوزفین کا ہاتھ تھامے گرجا کے بڑے دروازے سے دھیرے دھیرے قدم رکھتے، پادری صاحب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شادی کے سفید لباس میں سفید موتیوں کے زیورات پہنے، پھولوں

کا بڑا سا گلدستہ تھامے، چہرے پر جالی کا نقاب گرائے، شرمائی سی لیکن اعتماد سے قدم دھرتی، مس جوزفین آسمان سے اُتری ہوئی حور معلوم پڑتی تھیں۔

پادری صاحب نے کہا:

''مسٹر ڈیوڈ جارج! کیا آپ مس جوزفین جیکب کو اپنی بیوی بنانا چاہتے ہیں؟ کیا آپ ان سے پیار کرنے، انھیں عزیز رکھنے، باقی سب سے دست کش ہو کر ان کی حفاظت کرنے اور ان کی ذمّہ داری اُٹھانے کا وعدہ کرتے ہیں؟''

مسٹر ڈیوڈ نے بہت تیقّن سے باوقار لہجے میں کہا۔

''میں ڈیوڈ جارج، وعدہ کرتا ہوں کہ مس جوزفین جیکب کو اپنا کر ان کی ذمّہ داری اُٹھاؤں گا۔ بیماری میں، صحت مندی میں، خوش حالی میں یا برے وقت میں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنا بھرپور پیار اور عزّت انھیں دوں گا جب تک موت ہمیں جدا نہ کر دے۔''

پھر مسٹر ڈیوڈ نے مس جوزفین کا نقاب اُٹھایا۔ مس جوزفین کی جھکی ہوئی پلکیں اور جذبات کی شدّت سے تمتماتا گلابی چہرہ دیکھ کر، ندرت اور شیما نے ایک دوسرے کا ہاتھ زور سے تھام لیا۔

''کلاس میں تو یہ اتنی پیاری کبھی نہیں لگیں۔''

مسٹر ڈیوڈ نے مس جوزفین کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنائی اور ہاتھ پر بوسہ دیا۔

''یہ انگوٹھی پہنا کر، میں شادی کی رسم پوری کرتا ہوں اور اپنا پیار ان کے حوالے کرتا ہوں۔''

پادری صاحب نے کہا ''خداوند خدا، کے عہد کے مطابق یہ دونوں شادی کے مقدس بندھن میں بندھ گئے ہیں۔''

شیما نے ندرت سے کہا ''چلیں؟''

لیکن ندرت کی للچائی ہوئی نظریں، مٹھائی کی ٹوکری کا طواف کر رہی تھیں۔

○○

آٹھ دس لڑکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گول دائرے میں گھوم رہی تھیں۔

''ہرا سمندر، گوپی چندر، بول میری مچھلی کتنا پانی؟''

ان کے درمیان میں ایک لڑکی اپنے ٹخنوں کو چھو کر لہک لہک کر جواب دے رہی تھی۔

''میرے ٹخنوں تک پانی''

لڑکیاں گھومے چلی جا رہی تھیں۔

''ہرا سمندر، گوپی چندر، بول میری مچھلی کتنا پانی؟''

درمیان والی لڑکی نے جواب دیا:

''میرے گھٹنوں تک پانی۔''

''ہرا سمندر۔۔۔''

''میری کمر تک پانی۔''

''میرے کندھوں تک پانی'' لڑکی کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''میری گردن تک پانی'' لڑکی نے چیخ کر کہا۔

اور لڑکیوں کا حلقہ توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ چلّا رہی تھی۔

''میری گردن تک پانی۔۔۔ میری گردن تک پانی۔''

وہ بے چین تھی، پریشان تھی، بے قرار تھی۔ اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی، ہانپ رہی تھی۔ کبھی بازوؤں کا حلقہ توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی تھی۔ کبھی بازوؤں کے نیچے سے نکلنا چاہتی تھی۔ دائرے میں گھومتی ہوئی لڑکیاں ہنس رہی تھیں، کھلکھلا رہی تھیں اور اس کی ہر کوشش ناکام بنائے دے رہی تھیں۔

شام کے وقت ندرت اور شیما کبھی کبھار سکول چلی جاتی تھیں۔ اس وقت بھی بڑے گراؤنڈ میں بچیاں کھیل رہی تھیں، ان کا Study Period شروع ہونے ہی والا تھا۔

اِتنے میں مس چرن، چبوترے پر آئیں۔ ان کے ساتھ، باورچی اور آیا تھی۔ آیا نے گھنٹی بجائی تو ساری لڑکیاں لائن بنا کر چبوترے کی طرف چلنے لگیں۔ باورچی نے پانی کی بالٹی میں خشک دودھ ڈالا، زور زور سے چمچہ ہلایا اور گلاسوں میں ڈالنے لگا۔ دُودھیا جھاگ سے بھرے ہوئے گلاس تھامے، بچیوں کی آنکھوں میں چمک تھی۔ شیما نے اپنے گھر میں ایسا دودھ نہیں دیکھا تھا۔ باورچی نے کاغذ کی دو قیف سی بنائیں اور ان میں خشک دودھ بھر کر شیما اور ندرت کو تھما دیں۔ ندرت تو اسے منٹوں میں چٹ کر گئی لیکن شیما کو اس میں سے ہیک آئی تو وہ اسی طرح پکڑے پکڑے گھر چلی آئی۔

''یہ کیا ہے؟'' اللہ رکھی نے اس کے ہاتھ سے وہ قیف پکڑتے ہوئے کہا۔

''یہ دُودھ ہے، میں سکول سے لائی ہوں'' اللہ رکھی کے تیور دیکھ کر شیما منمنائی۔

''یہ دودھ ہے؟ دودھ ایسا ہوتا ہے؟ اور یہ تم ان سے لائی ہو۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اب تم ان کے ہاتھ سے لے کر کھاؤ گی بھی۔۔۔ واہ وا۔''

اللہ رکھی رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہو گیا۔۔۔ اللہ رکھی۔۔۔ اور شیما یہ تمہیں کس نے دیا ہے؟''

اماں نے بڑی ملائمت سے شیما سے پوچھا۔

''اماں میں اور ندرت سکول گئی تھیں۔ وہاں اسے پانی میں ملا کر لڑکیوں کو پینے کے لیے دیا گیا تھا۔ باورچی صاحب نے ہمیں ایسے دے دیا۔ مس چرن بھی وہیں تھیں۔ ندرت نے تو سارا کھا لیا لیکن مجھے اس میں سے ہیک آتی ہے۔''

''کھایا تو نہیں نا! اچھا کیا'' اللہ رکھی نے اطمینان کا سانس لیا۔

''اب خود ہی ندرت کے پیٹ میں کیڑے پڑیں گے۔''

اور دودھ اُٹھا کر بھینس کی سانی میں ڈالنے چلی گئی۔

شیما نے سوچا کہ ہاسٹل کی لڑکیوں کے پیٹ میں تو کیڑوں کی پوری فوج ہو گی۔

لیکن اماں کے سمجھانے پر کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا، وہ مطمئن ہوگئی تھی۔

OO

سکول میں گرل گائیڈز اور بلوبرڈز کی jamboree (اجتماع) کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مارچ پاسٹ کی مشق کے لیے، صبح صبح بڑے گراؤنڈ کے اِتنے چکر لگوائے جاتے کہ بچّیاں بے حال ہو جاتیں۔ ندرت اور شیما بھی بلوبرڈز تھیں۔ اکڑی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ، جب وہ رات کو بستر میں لیٹتیں تو بے طرح اُٹھتی ہوئی ٹیسوں کی وجہ سے سو نہ پاتیں۔

''یہ کونسا طریقہ ہے بچّیوں کو پڑھانے کا۔ بیچاریاں ابھی سے بوڑھوں کی طرح کراہتی ہیں۔''

اللہ رکھی، گرم تیل سے شیما کی ٹانگوں اور بازوؤں کی مالش کرتے کرتے بڑبڑاتی۔

ساتھ ساتھ ٹیبلو اور لڈّی کی تیاری بھی ہوتی۔ دوپہر کو تھکی ہاری بچّیوں کو ایک ایک مالٹا اور سموسہ کھانے کے لیے دیا جاتا، جو وہ ایک منٹ میں چٹم کر جاتیں۔

یہ وہ دِن تھے جب سکول میں پڑھائی بھی زوروں پر ہوتی اور ہم نصابی سرگرمیاں بھی۔ دسمبر ٹسٹ کی تیاری اور ساتھ میں کرسمس اور نیوایئر کے سلسلے کے اہتمام۔۔۔

اِن دِنوں جب بادل گِھر کر آتے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوتی، تو ہڈیوں میں گھسنے والی سردی سے کلاس روم، یخ ٹھنڈے ہو جاتے اور گھٹنوں تک لمبی جرابیں ناکافی ہوتیں (ایسے میں شیما کا دِل چاہتا کہ وہ ایک ہی جست میں بڑی کلاس میں چلی جائے تاکہ شلوار پہن سکے۔) بچّیوں کی گڈ مورننگ ٹی۔۔۔ی۔۔۔ی۔۔۔چر۔۔۔ر۔۔۔ر کی صدائیں کمروں میں گونجتیں، پڑھائی کے ساتھ ساتھ کرسمس اور نیوایئر کی تیاریاں کی جاتیں۔ رات کو کمپاؤنڈ سے ہارمونیم بجنے اور کیرول گانے کی آوازیں آتیں۔

سکول کے نچلے عملے کے گھروں میں، طبلے کی تھاپ پر زبور پڑھا جاتا۔

تاج کنڈیاں دا سر اُتے دھریا (کانٹوں کا تاج تمہارے سر پر رکھا تھا)
ماراں کھاون دا دی دُکھ توں جَریا (مار کھانے کا دُکھ بھی تم نے برداشت کیا)
ہو ہوآئے اکٹھے، تینوں کرن ٹھٹھے (وہ اکٹھے ہوکر آتے اور تمہارا مذاق اُڑاتے)
مارن نعرے (نعرے لگاتے) *

ہائے، ہائے؛ تیرے دُکھ نے بھارے (افسوس، تمہارے دُکھ بہت بھاری ہیں)

سکول کے مرکزی دروازے کے باہر، ایک بوڑھا آدمی، کرسمس اور نیوایئر کے استعمال شدہ کارڈ ایک، ایک، پیسے کے بیچتا۔ اسے کمپاؤنڈ کے اندر آنے کی اجازت مس ایسل نے دے رکھی تھی۔

لڑکیاں وہ کارڈ خریدتیں اور ان پر پہلے سے لکھے ہوئے نام کاٹ کر اپنا نام لکھتیں اور ایک دوسرے کو دیتیں۔ 'بوا' لوگ اپنی 'پیاریوں' کو جو کارڈ دیتیں، ان پر بطورِ خاص ایک دِل کی تصویر بناتیں جس کے آر پار ہونے والے تیر سے، تازہ تازہ خون ٹپک رہا ہوتا۔

شیما اور ندرت بھی یہ کارڈ خریدتیں، کیونکہ ان پر پھولوں کی بہت خوبصورت تصویریں بنی ہوتیں، جنھیں کاٹ کر وہ اپنی ہوم ورک کی کاپیوں پر خاکی کاغذ چڑھانے کے بعد چپکاتیں۔ ایسے کارڈ بازار میں نہیں ملتے تھے۔ یہ سات سمندر پار سے آتے تھے۔

کرسمس کے سلسلے کا ایک ڈرامہ سٹیج کیا جاتا۔ 'کرسمس ٹری' سجایا جاتا۔ پرنسپل صاحبہ، بچّیوں کو چھوٹے چھوٹے تحفے دیتیں۔ یہ تمام اہتمام، کرسمس آنے سے پہلے ہی کر لیا جاتا اور پھر سکول میں تین ہفتے کی چھٹیاں ہو جاتیں اور ہاسٹل کی بچّیاں اپنے گھروں کو چلی جاتیں۔

ایسی ہی، ایک سرد شام ڈھل رہی تھی۔ سنہری دھوپ، دھیرے دھیرے پاؤں رکھتی منڈیروں سے اُتر رہی تھی۔ چاچا فیروز برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بھاپیں چھوڑتا، اُبلا ہوا انڈا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی دیوار سے ندرت نے سَر اُبھارا، موٹی موٹی آنکھیں مٹکائیں (اگر آنکھوں کا کوئی نام ہوا کرتا تو یہ 'چلبلی' کہلاتیں) اور پھر ایک جھٹکے

سے وہ دیوار پر بیٹھی تھی۔ وہ اپنے پسندیدہ راستے سے، شیما کو ملنے آ رہی تھی۔

"چاچا جی، آپ انڈا کھا رہے ہیں کیا؟"

ندرت کے لہجے سے ندیدہ پن ٹپک رہا تھا۔

"ھو۔۔۔و۔۔۔و۔۔۔ں" چاچا فیروز نے زور سے ہنکارا بھرا۔

"مزے کا ہے؟"

"ندرت بیٹا۔۔۔ جو انڈا آپ ناشتے میں کھاتی ہیں وہ کیسا ہوتا ہے؟"

"وہ تو بہت مزے کا ہوتا ہے لیکن امّی ایک کے بعد دوسرا کھانے ہی نہیں دیتیں۔ ویسے بھی میں تو اس والے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔"

"یہ تو بس ٹھیک ہے۔ کچھ خاص نہیں۔" چاچا فیروز نے آخری ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ندرت نے دیوار کی سواری چھوڑ دی اور دھم سے لان میں چھلانگ لگائی۔

"چاچا جی شیما کہاں ہے؟"

"پچھلے برآمدے میں۔" گرم گرم چائے پینے کے بعد چاچا فیروز کا بولنے کو بھی دِل نہیں چاہ رہا تھا۔

پچھلے برآمدے میں اللہ رکھی کی بھابی بیٹھی تھی۔ اللہ رکھی، اس کی طرف سے منہ موڑے، اپنی بھتیجی کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ چھ سات ماہ کی صحت مند بچّی، پاس بیٹھی ہوئی شیما کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی اور موٹے موٹے ہاتھ ہلا کر ہمک رہی تھی۔

کاش! ہمارے گھر میں بھی ایک ایسی ہی منّی ہوتی، وہ میری گود میں ایسے ہی بیٹھتی، اس کے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے ہاتھ ہوتے اور موٹی موٹی گالیں۔۔۔ شیما بچّی کی طرف دیکھتے دیکھتے، خیالوں میں کھو گئی۔ اسے بچّے بہت پیارے لگتے تھے لیکن ایسی شدید خواہش اس کے دِل میں پہلے نہیں اُبھری تھی۔ اس نے سوچا وہ ابا میاں اور امّاں سے بات کرے گی۔ یہ بچّے کہاں سے اور کیسے ملتے ہیں؟ وہی بتا سکیں گے۔ وہ آج ہی بات کرے گی ان لوگوں

ے جانے کے بعد۔

○○

شیما کی ساتویں سالگرہ گزرے چند ہی روز ہوئے تھے۔ دسمبر کے یخ بستہ دِن سست روی سے گزر رہے تھے۔ سکول سے چھٹیاں تھیں اور مسلسل بارشوں نے باہر کھیلنے کے سارے راستے مسدود کر رکھے تھے۔ شیما، ندرت اور سرمد کمرے میں بیٹھے لوڈو، تعلیمی تاش اور Scrabble کھیلتے رہتے۔ امّاں ان کے پاس بیٹھی اون اور سلائیوں سے کچھ بنتی رہتیں۔ اللہ رکھی گھر کے زیادہ تر کام نپٹاتی۔ شاید اسی لیے امّاں موٹی اور بھدّی سی ہو گئی تھیں۔ حالانکہ وہ باقاعدگی سے ابا میاں کے ساتھ لان میں چہل قدمی کرتیں اور بارش کی صورت میں برآمدے میں۔ شیما نے سوچا وہ امّاں سے کہے گی کہ مجھے آپ ایسے اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے تو اپنی پہلے جیسی امّاں چاہئیں۔ کمروں میں گھومتی، باورچی خانے میں کام کرتی، مزے مزے کے کھانے بناتی، لیکن آج تو امّاں بہت ہی زیادہ تھکی تھکی سی لگ رہی تھیں۔

شام میں لیڈی ڈاکٹر شاہینہ گھر آئیں۔ شیما ان کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ لمبا قد، بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے، بہت خوبصورت نیلے رنگ کی ساڑھی باندھے اور سفید چھاتا سنبھالے ہوئے۔ ساتھ میں ایک نرس ان کا بڑا سا بیگ اُٹھائے ہوئے تھی۔ شیما کو ڈاکٹر صاحبہ بہت اچھی لگتی تھی۔ روشن چہرہ اور نرم لہجہ۔

"کیسے ہو بچّو۔" وہ انھیں دُور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے امّاں کے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ کچھ جلدی میں دِکھائی دیتی تھیں۔ ورنہ وہ جب بھی آتیں، بچّوں سے ان کی پڑھائی کے بارے میں تفصیل سے پوچھتیں۔ بچّے دوبارہ کھیل کی طرف متوجّہ ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ندرت کی امّی آ گئیں۔ وہ بھی سیدھی امّاں کے کمرے میں چلی گئیں، پھر واپس آئیں اور بچّوں کو اپنے ہاں چلنے کے لیے کہا۔ مغرب کی اذان ہونے والی تھی، اب تو ندرت کو بھی واپس جانا تھا تو وہ کیسے جائیں گے؟ مغرب کے بعد وہ کبھی گھر سے

باہر نہیں نکلتے تھے۔ شیما تذبذب میں تھی۔

''خالہ جان، ہم امّاں سے اجازت لے آئیں۔''

شیما نے ندرت کی امّی سے کہا تو انھوں نے بتایا کہ وہ پہلے ہی امّاں سے اجازت لے چکی ہیں، اس لیے وہ ان کے ساتھ چلے گئے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد، بچّوں نے گھر جانا چاہا تو خالہ جان نے انہیں کہانی سنانا شروع کر دی۔ گرم رضائی میں چھپے، وہ دونوں کہانی سنتے سنتے وہیں سو گئے۔

رات بھر بارش کے بعد، بہت روشن اور چمکیلی صبح میں شیما کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ ندرت کے گھر میں اس کے برابر والے بستر پر سو رہی ہے۔ وہ جلدی سے اُٹھی۔

''خالہ جان۔۔۔ میں گھر جا رہی ہوں۔ بھائی کہاں ہے؟''

''وہ میرے کمرے میں، میرے پاس سویا تھا۔ میں اسے بھی جگاتی ہوں اور ندرت کو بھی۔ تم لوگ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو، پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تمہارے گھر میں ایک بہت پیاری سی مہمان آئی ہے۔ مجھے بھی اس سے ملنا ہے۔''

''وہ کون ہو سکتی ہے؟'' شیما نے سوچا۔

ان لوگوں نے اُلٹا سیدھا ناشتہ کیا اور گھر واپس آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک خوبصورت گڑیا جیسی بچّی، امّاں کے ساتھ رضائی میں لیٹی ہے۔ سفید ٹوپی میں لپٹا گلابی چہرہ، بادام رنگ آنکھوں میں جگنوؤں کی جھمک اور موتیوں کی دمک۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ دیکھ کر شیما حیران رہ گئی۔

''امّاں یہ منّی کہاں سے آئی ہے؟''

''یہ آپ کی بہن ہے بیٹا۔ اللہ میاں نے آپ کو تحفہ میں بھیجی ہے۔''

خواہشیں ایسے بھی پوری ہو جاتی ہیں؟ میں تو ابھی ابا میاں اور امّاں سے بات

کرنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی۔ شیما نے سوچا۔

آئمہ کے آ جانے سے شیما کے شب و روز میں بہت تبدیلی آ گئی۔ اسے ایک ایسا کھلونا مل گیا تھا جس سے دِل ہی نہیں بھرتا تھا۔ ہر کام، ہر بات، ہر کھیل۔۔۔ اسی کے حوالے سے شروع ہوتا۔ آئمہ جب ہنستی تو اس کی گالوں میں ننھے ننھے سے گڑھے نمودار ہو جاتے جیسے چاندنی رات میں، موتیا کے دُودھیا پھول جگمگا اُٹھتے ہیں اور ایسا اکثر ہوتا تھا کیونکہ اسے فرصت ہی فرصت تھی اور کھلکھلانے کے علاوہ، اسے آتا بھی تو کچھ نہیں تھا۔

OO

مارچ گزرنے والا تھا۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ درختوں پر زردی مائل سبز رنگ کے پھلدار شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ صبحیں چمکیلی۔۔۔ اور ہوا میں دِل خوش کُن تازگی تھی۔ ہر طرف بہار کے رنگوں کی پھوار لرزاں تھی۔ سرمد، شیما اور آئمہ نئی کلاس میں جا چکے تھے۔ بچّوں کے پڑھائی کے کمرے میں نئی کتابوں کی باس تھی۔ وہ لوگ اپنی کاپیوں پر کور چڑھانے میں مصروف تھے کہ اللہ رکھی باجی نے پیغام دیا۔

''ابا میاں کالج سے واپس آ گئے ہیں اور آپ لوگوں کو بلا رہے ہیں۔''

ابا میاں کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبّہ تھا اور وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

''ارے! مٹھائی!'' سرمد میٹھے کا بہت شوقین تھا۔

''بچّو، ایک خوش خبری ہے۔ بوجھو تو بھلا کیا ہے؟''

لیکن کوشش کے باوجود امّاں اور بچّے نہ جان سکے تو ابا میاں نے بتایا۔

''میری پروموشن ہو گئی ہے۔ اسسٹنٹ پروفیسر بن گیا ہوں اور ساتھ میں ٹرانسفر بھی ہو گیا ہے۔''

'قصہ چہار درویش' کی شہزادی کی طرح شیما سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ہنسے یا روئے۔ ابا میاں کی پروموشن تو بہت مزے کی بات تھی لیکن اب اسے سکول اور اپنی دوستوں کو چھوڑنا

پڑے گا، پھر وہ ہاتھ میں مٹھائی کے دو ٹکڑے پکڑے بھاگی ندرت کو خبر کرنے۔

ابا میاں، اماں سے بات کر رہے تھے۔

"بچے اب بڑی کلاسوں میں ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ آئندہ تعلیم کے لیے انھیں ہاسٹل میں نہ ڈالنا پڑے۔ لیکن خدا کا شکر ہے اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اب بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بہت مواقع ہوں گے۔ بڑا شہر۔۔۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا شہر! بہت اچھا ہے یہ مسئلہ بھی بروقت حل ہو گیا۔"

شام کو ابا میاں کے دوست مبارک باد کے لیے آ گئے۔ پروفیسر رفیق انور صاحب، شہر کی مشہور دکان سے تھال میں سجی، چاندی کے ورق سے مزین، خوشبودار بالوشاہی لے کر آئے تھے، جو یہاں کی خاص چیز تھی۔ لیکن ان کے جذبات بھی شیما والے ہی تھے۔ وہ پروفیسر رحمان کی پروموشن سے خوش، لیکن ان کے جانے پر بہت اُداس تھے۔ بقول ان کے، ان کا اکلاپا، پروفیسر رحمان کی معیت میں کافی حد تک قابلِ برداشت تھا۔

اللہ رکھی کے بھائی نے خلیج کے ایک ملک میں نوکری کر لی تھی اور اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس نے اپنے خاندان سے ناتا ہی توڑ لیا ہے کیونکہ اس نے اپنے والد کی مالی مدد تو کیا کرنا تھی، اس کی وفات پر بھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس کے بعد اللہ رکھی کے حوالے سے، پروفیسر صاحب سے رابطہ کیا تھا۔ اللہ رکھی کے والد کو بہت تیز بخار چڑھا تھا، جو سرسام میں تبدیل ہو گیا۔ پروفیسر صاحب نے سر توڑ کوشش کی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ وفات سے پہلے، اس نے اللہ رکھی کا ہاتھ، پروفیسر صاحب کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اِلتجا کی تھی کہ:

"اب اللہ کے بعد اسے آپ کے حوالے کر رہا ہوں اس کا بھائی ملک میں ہوتا بھی تو مجھے اس سے کچھ اچھی اُمید نہیں تھی۔ کسی اور رِشتہ دار کے پاس چھوڑنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ بیگم صاحبہ اور آپ کی بیٹی ہے اور اس بات کا مجھے بہت اطمینان ہے،

ہر حال عطا محمد سے رابطہ رکھیے گا آخر کو اس کا بھائی ہے۔"

اس لیے اللہ رکھی بھی پروفیسر صاحب کے ساتھ ہی جانے والی تھی۔ جانے سے پہلے وہ اپنے ابا کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے گئی اور رو رو کر بے حال ہو گئی۔ اماں اس کے ساتھ تھیں، ان سے لپٹ کر وہ ایسی چیخ چیخ کر روئی جیسے اپنے باپ کی میت پر بھی نہیں روئی تھی۔

پھر شمیم اختر سے ملنے گئی اور باقاعدگی سے خط و کتابت کا وعدہ لے کر اُٹھی۔

○○○

حصّہ دوّم

کالج کے بڑے گراؤنڈ کے کونے میں بے تحاشہ پھیلے ہوئے بوڑھے برگد کے زیرِ سایہ طالبات کے لیے کینٹین تھی۔ برگد کی ہوائی جڑیں زمین کو چھوتی تھیں۔اس برگد نے طالبات کی کتنی ہی نسلوں کو یہاں ہنستے، بولتے، چہکتے اور کھلکھلاتے دیکھا تھا۔اس وقت بھی یہاں خوب چہل پہل تھی۔اپریل کی ہوا میں نرمی، لیکن دھوپ میں تمازت تھی۔ برگد کے نیچے کی زمین سیلی اور ٹھنڈی تھی۔ شیما اور اس کی سہیلیاں، صائمہ، سمن اور سفینہ جو کالج میں چہار درویش یا S 4 کے نام سے جانی جاتی تھیں، اس وقت یہاں بیٹھی تھیں۔ پروفیسر صاحبہ کی غیر حاضری کی وجہ سے، ان کے دو لگا تار پیریڈ فری تھے۔

''یہ چھٹی بھی بہت اچھی 'چیز' ہے۔ کبھی کبھی لینی چاہیے۔ دیکھو اب مسز شفیع کے نہ آنے کے فوائد

ع ہم بھی ہیں آرام سے اور وہ بھی ہیں آرام سے''

سمن نے کہا:

''یقیناً آپ صحیح فرما رہی ہیں۔ چھٹی دماغ کو طراوت بخشتی ہے اور مفرحِ قلب

ہے۔ صفرا میں اعتدال لاتی ہے اور پیشاب آور ہے۔" صائمہ نے پیوند لگایا۔

"فضول باتیں بند کرو اور کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو کہ

ع یہ سماں رہے نہ رہے"

شیما نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی لو۔۔۔ میں یوں گئی اور یوں آئی۔"

سفینہ نے حسب عادت برگد کی بڑی سی جڑ کو مضبوطی سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور لہراتی ہوئی، عین کینٹین والی باجی کے سامنے 'لینڈ' کر گئی۔

"لو آ گیا سفینہ، لو آ گیا سفینہ۔"

لڑکیوں نے اونچی آواز میں گاتے ہوئے تالیاں بجا کر اسے داد دی اور لائن میں لگے بغیر ٹوکن حاصل کرنے کی اجازت، انعام کے طور پر۔ سفینہ ٹوکن لے کر اگلی 'فلائیٹ' سے واپس دوستوں میں موجود تھی۔ یوں ان چاروں نے پیپسی لی اور غناغٹ چڑھا گئیں اور پھر خالی بوتلوں میں ٹاٹری اور املی کا 'حسین امتزاج' کھٹائی، لبالب بھروائی اور گرما گرم سموسے ہاتھوں میں پکڑے واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھیں۔

"پڑھائی۔۔۔ پڑھائی۔۔۔ پڑھائی۔۔۔ میں تو زچ ہو گئی ہوں۔۔۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔" سفینہ نے صدائے احتجاج بلند کی۔

"ایں۔۔۔ اس قدر تعلیمی پروگرام۔۔۔ کب سے شروع کی ایسی زوردار پڑھائی؟" صائمہ نے حیرت سے کہا۔

"صبح سے شروع کرنے والی ہوں" لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔

"اسے شاعر نے اس انداز سے کہا ہے۔

ے دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے"

شیما نے کہا۔

"یہ جاناں اُلّو کا پٹھا کون ہے؟" سفینہ کی آواز میں تحیّر کے ساتھ غصہ بھی شامل تھا۔

"ارے وہی ہمارا دودھ والا۔۔۔ صبح صبح آواز لگاتا ہے۔

"آپاں جی۔۔۔ جاناں دودھ والا آیا ہے۔"

"اوں ہوں۔۔۔ یہ وہ ہے

ع قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا۔۔۔ جاناں" سمن نے ڈپٹ کر کہا۔

"نہیں یہ وہ نہیں ہے" دھیمی آواز اور رازدانہ لہجہ۔

"یہ دراصل ہماری کینٹین والی کا بیٹا ہے۔ وہی جس کے ماتھے پر تیل میں ڈوبے ہوئے بالوں کے دو چاند ضوفشاں رہتے ہیں" سفینہ نے سرگوشی کی۔

"ضوفشاں ۔۔۔ اتنے مشکل الفاظ۔۔۔ اور تمہاری زبان سے ۔۔۔ آخر کیسے؟" صائمہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔

"میں آج کل ناول پڑھا کرتی ہوں۔" سفینہ نے گویا 'اعترافِ گناہ' کیا۔

"وہ تو ہم بھی پڑھتی ہیں۔۔۔ ان گھریلو معاشرتی اصلاحی ناولوں میں یہی کچھ تو ہوتا ہے جیسے

اس نے دبیز مخملیں پردے ہٹا کر فرانسیسی دریچے کے اس پار جھانکا۔"

"شفاف پانی کی تہہ میں بیٹھے ہوئے سنگریزے تک نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے مرمریں پاؤں، اس میں ڈالے تو ٹھنڈک روح میں اُترتی چلی گئی۔"

"فرمانہ بیٹی سموسے بہت اچھے بناتی ہے۔ جاؤ بیٹی سموسے تیار رکھے ہیں۔ بس تلنے باقی ہیں۔۔۔ لے آؤ۔"

"اونہوں۔۔۔ یہ فرمانہ کیا نام ہوا؟۔۔۔ اور جب سموسے تیار رکھے ہیں تو فرمانہ بیٹی اس میں کیا کمال دکھائیں گی؟"

''ہر وہ نام جس کے آخر میں 'ہ' آتا ہو، ہیروئن کا نام بننے کے قابل ہے:

ع گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

اور ہیروئن کا 'کمال' ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا تمہیں کبھی کسی ناول کی ہیروئن بننے کا اعزاز حاصل رہا ہے؟ نہیں نا!۔۔۔تو پھر تم کیا سمجھو گی؟''

''چہ داند بوزنہ لذّاتِ ادرک''

''کارخانے کی چمنی سے اُٹھتے ہوئے کاسنی دھوئیں سے فضا آلودہ ہو رہی تھی۔''

''کاسنی دھواں!۔۔۔کیا مصنّفہ کلر بلائینڈ ہے؟''

''رات تاریک اور سرد تھی۔ 'فرنے ٹرمیل' پوری رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔''

''فرنے ٹرمیل؟''

''یہ دراصل 'فرنٹیئر میل' کہنا چاہ رہی ہے۔ اسے کچھ نہ کہو۔'' صائمہ نے سفینہ پر ترس کھاتے ہوئے اپیل کی۔

''فرخانہ کی انگلیاں تیزی سے ستار کی تاروں پر پھسل رہی تھیں۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں اور انگلیاں فگار۔ اچانک کچھ جلنے کی بو آئی۔ اوہ! دودھ تو وہ چولہے پر ہی بھول آئی تھی۔ لکڑیوں کی آنچ تیز ہونے کے باعث وہ ابل کر چولہے میں جل رہا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ رات کے برتن بھی ابھی دھونا باقی ہیں۔۔۔اور اب زخمی اُنگلیوں سے راکھ سے برتن مانجھنا، کارے دارد تھا۔''

''بھئی یہ فرخانہ بھی ہر فن مولا ہیں۔۔۔کبھی ستار بجاتی ہیں تو کبھی راکھ سے برتن مانجھتی ہیں۔'' سمن، فرخانہ سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔

''آتشدان میں آگ دہک رہی تھی۔ شعلوں کا عکس فرغونہ کے چہرے پر رقص کر رہا تھا۔ خشک میوہ کھاتے ہوئے اس کی اُنگلیوں میں سلائیاں کٹکٹا رہی تھیں۔ اون کا گولہ، خوبصورت سی ٹوکری میں اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ زرغام آیا اور لہک کر بولا:

''یہ ہمارا سویٹر بنا جا رہا ہے؟''

اور جب اس کی نظر بُنے ہوئے ایک چھوٹے سے موزے پر پڑی تو وہ بے اختیار چیخ اُٹھا۔

''تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔''

اور بڑھ کر فرغونہ کی جبیں پر اپنے پیار کی مہر ثبت کر دی۔

''حالانکہ وہ تو پہلے ہی ثبت کی جا چکی تھی۔ جب ہی تو موزہ بنا جا رہا تھا۔''

''اونہوں۔۔۔بدتمیزی نہیں۔''

''یارو۔۔۔ہم سب یہ جانتی ہیں تو کالج میگزین کے لیے کیوں نہیں لکھتیں؟''

''ٹھیک ہے، لیکن میں تو اس کے لیے کوئی سنجیدہ سا مضمون لکھوں گی۔'' سمن، جو بہت اچھی مقرّرہ تھی اور مباحثوں میں اوّل انعام کی حق دار ٹھہرائی جاتی تھی، نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''محترمہ۔۔۔آپ کو قلم پر مکمّل دسترس حاصل ہے تو پھر آخر مضمون اور وہ بھی سنجیدہ ہی کیوں؟''

صائمہ کے طنزیہ لہجے کی سمن نے ذرّہ بھر پرواہ نہیں کی اور اِک عالمِ جذب میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں کہ آنکھیں آسمان پر لگی تھیں۔ چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ تھا اور آواز بھرّائی ہوئی۔

''دیکھیے۔۔۔ہماری قوم کو اس ابتلا کے دور میں تعمیری ادب کی بے حد ضرورت ہے۔ ہمیں تو ایسے مضامین لکھنے چاہیں جو قوم کے اخلاق و اطوار کو سنوارنے میں ممد ثابت ہوں۔ جو معاشرہ کی برائیوں کا قلع قمع کرنے میں معاون ہوں اور آئندہ نسلوں کو راہ راست پر لانے کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیں۔''

شیما نے سمن کے ہاتھ سے باقی ماندہ سموسہ لے لیا اور تینوں نے تالیاں بجا کر داد

دی۔ سمن کا جوش ابھی ٹھنڈا نہیں پڑا تھا۔

''پاکستان ہمارا پیارا وطن ہے اس کا ہم سے بڑھ کر ہمدرد اور کون ہوگا؟ اس کی روش روش کو سنوارنے کے لیے ہمیں مل جل کر کوشش کرنا چاہیے اور پھر ایسے دور میں جب ملک غیر ملکی سازشوں اور بیرونی سیاستوں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے تو شمشیر و سناں کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر کے میدان میں بھی مثبت کاوشیں ضروری ہیں۔''

''بس بس میری جان۔۔۔ ہم قائل ہو گئے مضمون لکھے جانے کی ضرورت و اہمیت کے۔۔۔ اب یہ بتایئے آپ اپنی تحریر کو کس عنوان سے قلم بند کریں گی؟''

سمن کمبخت کو ذرا ہنسی نہیں آ رہی تھی وہ اسی لہجے میں گویا ہوئی۔

''عنوان تو کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ 'تعمیر کردار میں اخلاقی اقدار کی بوقلمونیاں' یا 'دورِ ابتلا میں اخلاقی شائستگی کی ضرورت' یا پھر 'پاکستانی جوئندگانِ علم میں مغرب پرستی'، وغیرہ۔ اصل مسئلہ تو مضمون کا ہے۔ باقی تو مختلف لیبل والی بوتلوں میں ایک ہی سیال ہوتا ہے۔ اس لیے پہلے مضمون لکھوں گی عنوان تو بعد میں بھی دیا جا سکتا ہے۔''

احساسِ تفاخر سے تنی ہوئی گردن میں شاید درد شروع ہو گیا تھا اس لیے سمن نے سر نیچا کر کے ناظرین کی طرف دیکھا۔

''آپ اپنی تحریر کا کچھ حصّہ نمونے کے طور پر پیش کریں گی۔'' سفینہ نے بھی اسی سنجیدگی سے کہا۔

''جی ضرور۔۔۔ آپ کو مستفید ہونے کا موقعہ فراہم کیا جائے گا۔

لیجیے پیش خدمت ہے۔

مملکتِ خداداد پاکستان، ایک نوزائیدہ ملک ہے۔ اس کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمیں اس کے نظام میں وہ بنیادی تبدیلیاں لانا ہوں گی، جو ان تماشائیوں کو جو لامعنویت کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں بامعنی کرداروں میں بدل دیں اور وہ تاریخ کی عالیشان روشنی

کی چمک دمک میں نمایاں ہو جائیں۔ اس سے انسانی وجود کا وہ فطری آہنگ پیدا ہوگا جسے نئے لوگ بروئے کار لائیں گے۔''

تقریری مقابلوں میں پانچ سے سات منٹ تک مسلسل بولا جاتا ہے، اس لیے سمن کو ذرّہ بھر دِقّت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''رکو۔۔۔ رکو۔۔۔ خدا کے لیے رکو۔۔۔ تمہارے ایسے ثقیل الفاظ نہ نگلتے بن پڑ رہی ہے اور نہ اگلتے اور ان کی برق پاشی سے میری آنکھیں چکا چوند ہونے لگی ہیں۔ تم یہ مضمون ضرور لکھو۔۔۔ لیکن پلیز یہ چھپوانا تب جب میں اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر لوں گی اور تم ایک گلاس ٹھنڈا پانی اپنے حلق میں انڈیلو یا کہو تو ایک عدد پیپسی دلا دیتی ہوں تاکہ جوشِ جذبات کی آنچ سے تپتے ہوئے تمہارے سراپا کو، کچھ تو سکون ملے اور تمہارے خیالات کا سیل رواں، جو انجانی منزلوں کی جانب بہہ نکلا ہے ٹھکانے پر آئے۔'' شیما نے فریاد کی۔

''یہ تو چند لائنیں ہی سن کر ایسی گاڑھی اردو بولنے لگی ہے۔ جب سارا مضمون پڑھ لے گی تو کیا کرے گی اور پھر ہمارا کیا ہوگا؟ خدا کے لیے سمن کو یہ مضمون لکھنے سے منع کرو۔'' سفینہ نے سرگوشی کی۔

''نہیں اسے مت روکو۔۔۔ اسے مضمون لکھنے دو۔ میں شاعری کروں گی اور تم صحرائے انشا پردازی کی صعوبتوں کو شاعری کے چمن زاروں میں بھلانے کی کوشش کرنا کیونکہ شاعری میں رنگینی ہے، شاعری میں شیرینی ہے اور یہ کہ شاعری میں بلا آفرینی ہے۔ اگرچہ ایک شعر کی تخلیق کے سلسلہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مجھے بخوبی اندازہ ہے لیکن میرے ذہن میں ہے کہ مجھے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے۔ میں کل سارا دن کھوئے کھوئے بلکہ سوئے سوئے رہنے کی کوشش کروں گی۔ اپنے پرائے سبھی سے، بے نیازی کی حد تک علیحدہ رہنے میں اپنی عافیت سمجھوں گی کہ تنہائی شاعری کے فروغ کا باعث بنتی ہے اور بے نیازی شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ پین میں نئے سرے سے سیاہی بھروں گی کہ ہوسکتا ہے عین 'آمد'

کے وقت کمبخت دغا دے جائے اور پھر کاغذات کا پلندہ اُٹھائے 'کنجِ قفس' میں ایک اچھی سی جگہ جا بیٹھوں گی' صائمہ کہہ رہی تھی۔

''بیوقوف کنجِ قفس میں نہیں کنجِ چمن میں'' شیما نے فوری طور پر اصلاح کی۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ٹھیک ہے۔۔۔تم کہتی ہو تو یوں ہی سہی۔۔۔وہاں بیٹھ کر میں انتظار کروں گی کہ کب کوئی شعر غیب سے میرے خیالات میں ٹپکے اور کب میں اسے شرفِ قبولیت بخشوں۔ ایسی صورتِ حال میں تو وہ غزل مکمل لکھی جائے گی کہ بڑے بڑے شاعر پانی بھرتے نظر آئیں گے۔ اخباری نمائندے میرا انٹرویو لیں گے۔ کوئی پوچھے گا کہ پرانے شاعروں کے بارے میں میرا کیا خیال ہے تو میں کہوں گی

''اچھے تھے۔۔۔اب کیا کہوں؟۔۔۔مرے ہوؤں کو کچھ کہنے کی اجازت، میرا اخلاق ہرگز نہیں دیتا۔''

پھر وہ میرے ہم عصروں کے بارے میں پوچھیں گے۔ ہوسکتا ہے وہ پوچھیں کہ فیض احمد فیض کے بارے میں میری کیا رائے ہے؟ تو میں کمال بے نیازی سے کہوں گی۔

''بہتر ہیں۔۔۔لیکن انہیں چاہیے کہ مشقِ سخن جاری رکھیں۔''

''اس کے سر سے انڈوں کی ٹوکری اُتار دو، ورنہ سارے پھوٹ جائیں گے۔'' سمن چلائی۔

''جاگ جاؤ میری بہنا۔۔۔صبح ہوگئی۔'' شیما نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''تم جو دل چاہے کہو۔۔۔لیکن اس جوشِ جنون میں مَیں ایسی معمولی باتوں کی پرواہ کرنے کا کوئی ارداہ نہیں رکھتی کہ اہلِ نظر، ازل سے اہلِ ستم کا شکار ہوتے آئے ہیں اور منصور نے 'انا الحق' کہنے کی سزا، دار پر چڑھ کر پائی اور یہ کہ۔۔۔خیر''

''اور میں کیا لکھوں؟'' سفینہ مسمسی شکل بنا کر منمنائی۔

''تم افسانہ لکھو'' شیما کا انداز تحکمانہ تھا۔

''مگر کیسے؟''

''بس آج ہی سے تیاری شروع کردو۔ ایک عدد قلم دیکھو۔ ایک دو افسانہ نگاروں کے مجموعے دل لگا کر پڑھو۔ خواتین افسانہ نگاروں کے ہوں تو بہتر ہے کیونکہ آج کل گھریلو، معاشرتی، رومانوی افسانے پسند کیے جاتے ہیں۔ ممکن ہو تو صبح صبح شبنم کے موتی رولتی ہوئی گھاس پر، ننگے پاؤں چلو کہ دماغی سکون اور ذہنی طراوت کا باعث ہے اور افسانہ نگاری کے لیے یکسوئی انتہائی لازمی امر ہے۔''

''کچھ اور بتاؤ'' سفینہ نے مزید مدد چاہی۔

''تم رہنے ہی دو۔۔۔میں خود ہی لکھ لوں گی۔'' شیما نے کہا۔

''بہرحال سنو۔۔۔ہر افسانے میں محبت کی ازلی تکون جلوہ فرما ہوتی ہے ہیرو یا تو انجینئر ہوتا ہے یا ڈاکٹر۔ دوسرے پیشوں سے متعلقہ افراد کسی افسانے کا ہیرو بننے کے قابل نہیں سمجھے جاتے۔ ہیروئن، بی۔ اے کر کے، محض ڈرائنگ روم میں پھول سجانے کا کام کرتی ہے۔ لیکن اکثر اوقات ہیرو سے ناراض ہو کر انتقاماً کسی 'قصبے' کے 'انگریزی' سکول میں نوکری کر لیتی ہے لیکن جب آخر میں غلط فہمی دور ہو جاتی ہے تو اچانک بہت سے لوگ کہیں سے آ کر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہیرو ہیروئن کی شادی ہو جاتی ہے اور ازلی تکون کا تیسرا مہرہ، کسی کمرے میں چھپ چھپ کر آنسو بہاتا ہے۔ ہیرو ہیروئن، ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں اور بس''

''اگرچہ شادی کے بعد 'ہنسی خوشی' نصیبے والوں کا ہی حصّہ ہے۔'' سمن نے گرہ لگائی۔

اتنے میں اگلے پیریڈ کی گھنٹی بجی تو انہوں نے اردو ادب کی مزید خدمت کا ارادہ ملتوی کر کے کلاس روم کی راہ لی۔

OO

اُردو اور انگریزی، دونوں ہی مضمون ایسے تھے جن پر سفینہ کو مکمل 'دسترس' حاصل تھی۔ اس لیے وہ ہمیشہ، بڑے اعتماد سے، 'صحیح' لکھتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ 'ناقدریٔ عالم'

پر وہ چپ سی ہو جاتی اور ہر شب گردنِ مینا میں بانہیں ڈال کر سو جاتی۔ مینا، اس کی چھوٹی بہن کا نام تھا۔

بریک میں گراؤنڈ میں بیٹھی، چاروں فروٹ چاٹ کھا رہی تھیں اور باتیں کر رہی تھیں۔

''کل میں Crow پر مضمون یاد کر رہی تھی۔'' سفینہ نے کہا۔

''مضمون یاد کیے جاتے ہیں؟ اور وہ بھی Crow پر، واہ وا۔'' شیما نے داد دی۔

''تو تم کیا سمجھتی ہو میں خود سے لکھوں گی؟''

''نہ۔۔۔نہ۔۔۔ایسا غضب نہ کرنا۔ ورنہ اپنے پرچے کے پیچھے، کہاں ماری ماری پھرو گی۔ Examiner کو اپنا مافی الضمیر واضح کرنے۔'' ثمن نے بے تابی سے کہا۔

''لکھے موسیٰ اور پڑھے خود آ۔'' صائمہ بولی۔

''اللہ۔۔۔سنو تو۔۔۔میں نے پڑھا۔

۔۔۔اس کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ میں بہت حیران ہوئی کہ یہ کیسا کوا ہے؟ آگے لکھا تھا، اس کی دُم بہت لمبی ہوتی ہے۔۔۔خیر یہ تو قابلِ قبول تھا۔ پھر لکھا تھا It gives milk۔ بہر حال اس بات کا مجھے یقین تھا کہ یہ تو قیامت تک ممکن نہیں ہے۔ یہ ٹسٹ پیپر والے تو یونہی خرافات چھاپ دیتے ہیں لیکن جب غور کیا تو پتہ یہ چلا کہ میں تو اس وقت Cow پر مضمون پڑھ رہی تھی۔''

''ڈراپ سین۔''

''یہ بھی اچھا ہے کہ تم نے غور کر لیا ورنہ اس دُودھ دینے والے عجیب الخلقت کوّے کو دیکھنے کے لیے زمانہ اُلٹ پڑتا۔''

ابھی وہ لوگ وہیں بیٹھی تھیں کہ کالج کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا۔

''طالبات متوجہ ہوں۔

کل سے لے کر، اگلے تین روز تک، کالج فوٹو گرافر، کالج میں ہی سب طالبات

کی تصاویر بنائے گا، جو کہ کالج کے شناختی اور بس کارڈ کے لیے استعمال کی جائیں گی۔ لہٰذا کوئی طالبہ، اس دوران چھٹی نہ لے۔ صحیح یونیفارم کی پابندی لازمی ہے۔ شکریہ۔''

''میں تو تصویر ہر گز ہر گز نہیں بنواؤں گی۔'' سفینہ نے قطعیت سے کہا۔

''کیوں؟''

''میری تصویر اچھی نہیں بنتی۔'' اس نے بسورتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کرو! ہم کونسا اسے تمہاری ہونے والی سسرال بھیجنے والے ہیں۔''

''اور ویسے بھی

؎ جو خال و خدِ رُخ ہوتے ہیں
تصویر وہی دِکھلاتی ہے''

شیما نے کہا۔

''اسی بات کا تو رونا ہے یار۔ اب 'خال و خدِ رُخ' تو تبدیل ہونے سے رہے۔''

سفینہ نے جلے دِل سے کہا۔

ع ''کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں''

''ہے۔۔۔بالکل ہے۔۔۔پلاسٹک سرجری۔''

''وہ تو بہت مہنگا کام ہے۔۔۔سفینہ کا جیب خرچ تو چاٹ اور سموسوں پر ہی خرچ ہو جاتا ہے۔''

''اور یوں بھی، یہ ڈاکٹر لوگ تو لوٹتے ہیں۔ تم ایسا کرنا کہ پلاسٹک خود خرید کر دینا۔''

''یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ تمہارے کارڈ پر کسی خوبصورت سی ایکٹرس کی تصویر لگا دی جائے۔''

''تم لوگ تو یونہی بات کا یہ بڑا سارا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔ میں نے تو یونہی برسبیلِ تذکرہ بات کی تھی۔'' سفینہ بات کر کے پچھتا رہی تھی۔

"کیا؟ کیا؟ تم نے صحیح موقعہ پر صحیح لفظ استعمال کیا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"تم لوگ میری 'پوشیدہ صلاحیتوں' سے واقف نہیں ہو۔ بالکل ویسے ہی، جیسے الائچی کے چھلکے میں خوشبو نہیں ہوتی۔"

سفینہ اب ناراض ہونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

"مانو نہ مانو۔ میں نے کل ہی بھائی جان کو خط لکھا ہے کہ میری اُردو، اب دِن بدن، بہتر سے بہتر ہوتی چلی جا رہی ہے، پھر بھی خط لکھنے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو 'سرزد' فرمائیں۔"

سفینہ نے اپنی اُردو کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔

OO

"میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ جوں جوں امتحانات قریب آتے جا رہے ہیں۔ ویسے ویسے میری نیند میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور افسوس اس بات کا ہے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ جیسے ہی پیپر ختم ہوں گے، نیند کہیں اُڑن چھو ہو جائے گی۔"

سفینہ، بہت فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے، اپنا مسئلہ بیان کر رہی تھی۔

"یہ کوئی ایسی غیر معمولی صورتِ حال نہیں ہے۔ سبھی نالائق سٹوڈنٹ، اس قسم کے مسائل سے دوچار رہتے ہیں۔"

شیما نے لاپرواہی سے کہا۔

"کہتی رہو، مَیں بُرا نہیں مانوں گی مجھے پڑھائی مصیبت لگتی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مَیں تو چاہتی ہوں کہ کسی طرح سے بی۔ اے کر لوں، پھر اچھا سا رِشتہ آئے اور میری شادی ہو جائے۔"

"اور تمہارا خاتمہ بالخیر ہو جائے۔"

"سفینہ، جسے تم مصیبت سمجھتی ہو، یہ تمہاری زندگی کے سنہرے دِن ہیں۔ چار، چھ

سال کے بعد جب تم پیچھے مڑ کر دیکھو گی، تب تمہیں اندازہ ہوگا کہ یہ دِن تمہیں کتنے عزیز ہیں اور تم چاہو گی کہ انھیں سینے سے لگائے، اپنی زندگی کو روشن بنائے رکھو۔ کیونکہ دُنیا کی کوئی دولت انھیں خرید کر واپس نہیں لا سکتی۔ اس لیے بیزار ہونے کی بجائے، زندگی کا ہر پل جیو، اس سے پہلے کہ یہ ماضی کا حصّہ بن جائے۔"

شیما نے کہا۔

"ہاں، وقت کا دھارا بہتا چلا جاتا ہے۔ جس پانی نے آج تمہارے پاؤں بھگو دیئے ہیں، وہ دوبارہ انھیں چھُو نہیں پائے گا۔ جیون کا ہر لمحہ اور ہر پل جیو کہ عالم دوبارہ نیست۔"

سمن نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے سمن۔۔۔ تم اچھا بھلا جانتی ہو کہ ایسی 'افلاطونیت' مجھے سمجھ نہیں آتی۔ پھر بھی۔۔۔"

سفینہ نے بے بسی سے کہا۔

"ہاں، پھر بھی۔۔۔ کیونکہ، یہی تو ہے جو مَیں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس عمر میں، دوستوں کی محفل کے 'جملہ فیوض و برکات' میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ ان کے سامنے کھل کر اپنی بے وقوفی کا اظہار کر سکتے ہیں، بغیر کسی احساسِ شرمندگی کے۔۔۔ جیسا کہ تم کر رہی ہو۔"

سمن نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مزا نہیں آتا ہے، رات گئے تک پڑھتے ہوئے، برستی بارش کے نظّارے کا۔۔۔ اور جب بجلی چمکتی ہے تو سارا منظر روشن ہو جاتا ہے اور کتاب کے الفاظ تک لَو دینے لگتے ہیں۔"

صائمہ نے کہا "لعنت ہے تم پر۔۔۔ کون کمبخت پڑھتا ہے رات گئے تک۔ مَیں کہہ رہی ہوں کہ میرا پڑھنے کو ہی دِل نہیں چاہتا اور تم رات گئے تک کی بات کر رہی ہو۔۔۔

پاگل۔۔۔ یہ تم لوگوں کے چونچلے ہیں، فرسٹ آنے والوں کے۔ اچھا رزلٹ آنے پر تمہیں خوشی ہوتی ہے تو ہو، میرا تو یہ اصول ہے کہ کبھی ٹاپ نہ کرو، ورنہ لوگ بلاوجہ تم سے جلنے لگتے ہیں۔''

سفینہ نے اعتماد سے کہا۔

''چلو، پڑھائی نہ سہی اور بھی تو بہت سی باتیں ہیں انجوائے کرنے کی، سٹوڈنٹ لائف میں۔ مثلاً کبھی دوستوں میں نہ ختم ہونے والی گپ شپ اور کبھی انھی دوستوں کے ساتھ دِل و جان سے لڑائیاں لڑنا، کلاسوں سے فرار ہونا، نہایت سنجیدہ باتوں کے درمیان آنے والی بے تحاشہ اور بے اختیار ہنسی۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی ناول پڑھتے یا فلم دیکھتے ہوئے، مضحکہ خیز محبتوں کی راہ میں بہائے جانے والے آنسو۔۔۔ اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مہکتے خطوط، پتھر پر لپٹے ہوئے محبت بھرے پیغامات، ہیرو کے کہے گئے جملوں پر ہیروئن کے کانوں کی سرخ لوئیں، گرتی اُٹھتی پلکوں کی چلمن اور تیز ہوتی ہوئی دِل کی بے ترتیب دھڑکن۔۔۔ اور پھر ہیرو کی بے وفائی پر خون تھوکتی ہوئی ہیروئن اور ظالم سماج کی ریشہ دوانیوں پر مشتمل کہانیاں پڑھنے کا پھر کبھی یوں مزا نہیں آئے گا۔''

شیما نے کہا'' زمانۂ طالب علمی پر بہت سے مشاہیر نے بہت کچھ کہا ہے۔ اِتنا، کہ تم نے قائل نہ ہونے کی قسم نہ کھائی ہو تو بہت کافی ہے۔ لیکن میں تو صرف اپنا تجربہ بتاتی ہوں کہ کتنا مزا آتا ہے جب دسمبر ٹسٹ کی تیاری کرتے ہوئے شدید سردی میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ، گرم گرم بھاپ اُڑاتی، کافی کا مگ سامنے پڑا ہو۔۔۔ اِمتحان کی جان لیوا پریشانی میں، کمرۂ امتحان میں داخل ہونے سے پہلے، خاص موضوعات کو دُہرانا۔۔۔ کلاس روم کے اندر رہ کر، بور اور تھکا دینے والے لیکچر سے لاتعلقی اور اس کے دوران پچھلی سیٹوں پر اُونگھنا۔۔۔ لائبریری میں میز پر رکھی ہوئی کتابوں پر، نیند سے ماتی آنکھوں کے ساتھ سر کا بار بار ٹکرانا۔۔۔ اُف۔۔۔ اُف۔۔۔ یہی تو زندگی ہے، بھلے ہی لوگ اسے کالج کہیں۔''

سمن نے کہا۔

''جذباتی زندگی کا یہ اُجلا سا بانکپن، تو ساری عمر مجھے اپنے حصار میں لیے رکھے گا۔''

شیما نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

''اور پھر کالج میں چھٹی ہو جانے کے بعد، سواری کے انتظار میں، اپنی دوست کے ساتھ کالج کے برآمدوں میں خاموش چہل قدمی اور گھر کے راستے میں، سڑک کنارے کسی دِل پھینک کی پیار بھری مسکراہٹ۔۔۔ اوئے ہوئے۔۔۔ یہ وہ سب ہے جو کبھی واپس نہیں آتا، لیکن دِل کو اُداس کر سکتا ہے۔'' صائمہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیا کہہ بیٹھی ہوں میں اور کیوں مجھے بھی اُداس کرنے پر تلی ہو؟ مجھے قائل کیا بھی تو کب؟ جب ہمارے پاس بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے ساتھ رہنے کا۔ اور اب تو میں نے منہ کھولے بغیر جمائیاں لینا بھی سیکھ لیا تھا اور کھلی آنکھوں سے سونا بھی۔''

سفینہ رو دینے کو تھی۔

''اور پھر یہ 'ترنجن دیاں کڑیاں'

ع شاید کبھی خوابوں میں ملیں''

''نہیں، اب ایسا بھی نہیں ہے۔ اچھے تعلقات کے لیے وعدوں اور شرائط کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے لیے صرف اچھے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے سفینہ۔۔۔ جیسے میں اور 'شاید' تم۔۔۔'' سمن نے کہا۔

''شاید؟۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟ اپنی زبان پر قابو رکھو۔''

سفینہ۔۔۔ وہی پرانی سفینہ بن گئی تھی۔

''کیوں نہیں ملیں گے؟

'It's a small world,
we will meet again.'

شیما نے پُراُمید انداز میں کہا۔

OOO

حصّہ سوم

جھکے ہوئے سُرمئی بادلوں نے نیم پہاڑی علاقے کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ راستہ دشوار گذار نہیں تھا۔ سرسبز وادی کی فضا، شہتوت، لوکاٹ اور سیب کی شیریں مہک سے بوجھل تھی۔ انار کے پودوں میں کلیاں اور چھوٹے چھوٹے انار، ٹھنڈی ہوا میں فانوسوں کی طرح جھول رہے تھے۔ بادلوں کے باوجود، چمکیلی دھوپ میں کٹیلی دھار تھی۔ جس پر خنکی سایہ کیے ہوئے تھی۔ کبھی کبھی، گاڑی کی آواز سن کر تیزی سے بھاگتا ہوا خرگوش، سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیتا۔ اردگرد جھاڑیوں میں چھپے تیتر، چلتے چلتے سڑک پر آ جاتے۔ فضا میں گہرا سکون تھا۔ گاڑی کے ٹائر کے نیچے کوئی چھوٹا پتھر اس طرح دبتا کہ اس کی گونج، کافی دیر تک اطراف میں چکر لگاتی رہتی۔

Hello... Hello... Little Sir Echo Hello... Hello...

شیما دل ہی دل میں سکول میں یاد کی ہوئی نظم دُہرانے لگی۔ ابا میاں سیٹ سے ٹیک لگائے اُونگھ رہے تھے۔ شیما کا دل چاہتا تھا کہ سانس بھی آہستہ سے لے کہ کہیں اس 'کارگہہِ شیشہ گری' کو ٹھیس نہ پہنچ جائے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ وقت کس تیزی سے گزر جاتا ہے۔ سرمد نے جیسے ہی ایم۔ بی۔
اے کیا، اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی اور سوئے اِتفاق اپنے آبائی شہر
میں۔ ابا میاں کا بلڈ پریشر کا عارضہ شدت اختیار کر گیا تھا اس لیے انھوں نے بھاری دِل
سے ریٹائرمنٹ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے وہ خود کو اس طرح سمجھا پائے تھے کہ پڑھانے
کا فریضہ وہ جاری رکھیں گے، بغیر کسی معاوضہ کے۔ اماں، شیما اور آئمہ بہت خوش تھیں کہ
اب وہ اپنے آبائی گھر میں رہیں گی، جسے انھوں نے ایک آدھ بار صرف دیکھا تھا، وہاں
رہنے کا اِتفاق نہیں ہوا تھا۔۔۔ یوں سرمد کو بھی اکیلے نہیں رہنا پڑے گا۔

پرانی طرزِ تعمیر اور وسیع لان والے، سرسبز گھر کو تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ
جدید سہولتوں سے آراستہ کر دیا گیا تھا۔

اس کا ایم۔ ایس۔ سی کا رزلٹ آتے کے ساتھ ہی، لکچرر کی آسامی کے لیے اشتہار
اخبار میں آ گیا تھا۔ ابا میاں نے اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا۔۔۔ اپلائی کر دیجیے اور تیاری شروع کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ امتحان
پاس کر لیں گی اور اس بات کا بھی یقین دلاتا ہوں کہ چراغ سے چراغ جلانے میں آپ بہت
اطمینان محسوس کریں گی۔ اس سے آپ کی ذات کی تشفّی ہو گی۔''

اور آج وہ ابا میاں کے ہمراہ لکچرر شپ جوائن کرنے کے لیے جا رہی تھی۔ تمام
مراحل اتنی آسانی سے طے ہو گئے تھے کہ لگتا تھا یہ سارا سلسلہ، شیما کے لیے ہی ترتیب دیا گیا
تھا۔ گھر سے دور آنے پر اماں پریشان ہوئی تھیں، لیکن اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اور
ابا میاں کی اس یقین دہانی پر کہ سروس کے آغاز میں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے، کچھ
عرصہ کے بعد یہ مسئلہ بھی حل کرنے کی کوشش کریں گے، وہ مطمئن ہو گئی تھیں۔

یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا۔ گھر، سطحِ زمین کے حساب سے ہی تعمیر ہوئے تھے۔
کہیں اُونچے اور کہیں نیچے۔ ایک دو بار راستہ پوچھنے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی گرلز کالج کے

گیٹ سے داخل کی اور چوکیدار کے اشارے پر، پرنسپل آفس سے تھوڑے فاصلے پر روک دی۔

''ہم آپ کے منتظر تھے۔ چھوٹے شہروں میں لوگ آنا نہیں چاہتے۔ اس لیے
آپ کے ابھی تک Join نہ کرنے پر تھوڑی پریشانی تھی۔''

پرنسپل صاحبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شیما نے کاغذی کارروائی مکمل کی۔ طمانیت کا بھرپور احساس اس کے دل میں اُتر
گیا۔ اس کا خواب پورا ہو گیا۔ ابا میاں اس کی آئیڈیل شخصیت تھے اور ان کا پروفیشن بھی۔
وہ بچپن میں گڑیوں سے کھیلتی تو اس میں بھی وہ ان کی استاد بنتی۔ کتابوں سے دوستی بھی
ابا میاں کے زیرِ اثر ہی ہوئی تھی۔

''آپ کے رزلٹ، میرٹ پر تقرری اور پروفیسر صاحب کی تربیت سے یقیناً ہمارا
ساتھ ایک اچھی استاد سے رہے گا۔''

پرنسپل صاحبہ نے کہا۔

پروفیسر صاحب نے پرنسپل صاحبہ سے رہائش کے بارے میں استفسار کیا تو ان
کے جواب پر، شیما نے پریشان ہو کر ابا میاں کی طرف دیکھا۔

''کالج میں تو سٹاف کے لیے کوئی رہائش موجود نہیں ہے۔ یہ چھوٹی جگہ ہے۔
زیادہ تر لکچررز دوسرے شہروں سے تعلّق رکھتی ہیں۔ اس لیے اس کی ضرورت تو بہت ہے،
لیکن مجبوری ہے۔ کالج ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بنا ہے۔ شاید، گورنمنٹ اس سلسلہ میں آئندہ
کچھ کرے۔ اب مس شیما کے ساتھ دو نئی لکچررز کی تقرری ہوئی ہے اور ایک ٹرانسفر کیس
ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ چاروں مل کر کالج کے نزدیک کوئی گھر کرایہ پر لے لیں۔ کل اتوار ہے،
کوشش سے کوئی گھر تلاش کر لیا جائے۔''

''آپ نے کہا کہ زیادہ تر لکچررز دوسرے شہروں سے ہیں تو پھر انہوں نے کیا
بندوبست کر رکھا ہے؟''

''تین لیکچررز تو شہر میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں رہ رہی ہیں اور وہیں رہنا چاہتی ہیں۔ چار لیکچررز کو ایک کمرہ کالج میں دے رکھا ہے اور اب مزید گنجائش نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے پرنسپل صاحبہ ہم بھی کوشش کرتے ہیں آپ بھی براہِ کرم کوشش کیجیے، اگر کوئی کمرہ کالج میں ہی نکل آئے تو۔۔۔ شیما تو پہلی دفعہ گھر سے دور آئی ہے۔ باقی بچیوں کا بھی یہی معاملہ ہوگا۔ اگر کالج میں رہائش مل جائے تو ان کے لیے Job کا پہلا تجربہ آسان ہو جائے گا۔''

''جی ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔ بہر حال آپ بھی کوشش کیجیے اور میں بھی کروں گی۔ میں ہیڈ کلرک صاحب کو بلوا دیتی ہوں۔ وہ اس سلسلے میں آپ کی شاید کوئی مدد کر سکیں۔ کیونکہ وہ یہیں کے رہائشی ہیں۔''

پھر انہوں نے گھنٹی بجا کر مائی کو چائے لانے اور ہیڈ کلرک کو بلانے کے لیے کہا۔

''مس شیما، آپ چائے پی کر باقی سٹاف سے مل لیجیے۔''

شیما پرنسپل صاحبہ سے اجازت لے کر سٹاف روم کی طرف چل دی۔ طالب علمی کے زمانہ میں، اگر کسی ٹیچر سے کام ہوتا تو سٹاف روم کی طرف جانے سے پہلے، سو بار سوچا جاتا۔ گفتگو کے الفاظ کو پہلے سے ترتیب دیا جاتا اور آج وہ ایک مختلف حیثیت، سے اس کالج کے سٹاف روم میں داخل ہو رہی تھی، تو اس کے دِل نے اُوپر تلے، دو تین دھڑکنیں مِس کیں۔

اس نے پردہ اُٹھا کر دیکھا تو لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔

''السلام علیکم! میں شیما رحمان ہوں۔ سائیکالوجی میں میری اپائنٹمنٹ ہوئی ہے۔''

سبھی نے اپنے اپنے کام سے سر اُٹھا کر، مسکراہٹ کا نذرانہ پیش کیا۔

ایک کونے سے چہکار سنائی دی۔

''مجھے تو پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ بڑی 'ڈِنگ ڈونگ' قسم کی نئی لیکچرر آئی ہیں۔''

(ڈِنگ ڈونگ۔۔۔؟؟؟۔۔۔ اِک عالمِ تحیّر!!!)

عذرا نے بعد میں بتایا کہ 'ڈِنگ ڈونگ' اس کی لغت میں اچھی چیز کے مترادف ہے۔

''ادھر ہی آ جایئے اور چائے لیجیے۔ دوسرے نئے ممبر بھی ادھر ہی بیٹھے ہیں۔''

دوسرے کونے سے آواز آئی۔

''جی بہت شکریہ۔۔۔ چائے میں پی چکی ہوں۔''

ساتھ ہی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور اکثر لوگ رجسٹر اُٹھائے باہر جانے لگے۔

''اس وقت کلاس ہے۔ اب تو ساتھ رہے گا۔ پرسوں تفصیلی ملاقات ہوگی۔''

نئی لیکچررز کونے میں بیٹھی تھیں۔ تعارف شروع ہوا۔

''شہلا۔۔۔ پنجابی۔''

''نگار صلاح الدین۔۔۔ سوشیالوجی۔۔۔ اور آپ سائیکالوجی۔۔۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے۔۔۔''

''میں اکنامکس پڑھاتی ہوں۔۔۔ ٹرانسفر کیس ہے۔ یاسمین نام ہے۔''

نگار بولی۔ ''یقیناً ہم سب سے مل کر، آپ کو بہت 'خوشیاں' ہوئی ہوں گی۔ لیکن صاحبو قصہ یہ ہے کہ یہ چہار درویش رہیں گے کہاں؟''

''میرے والد صاحب ساتھ آئے ہیں اور ہیڈ کلرک صاحب کی مدد سے، کسی رہائش گاہ کی تلاش میں گئے ہیں۔ دیکھیے کیا بنتا ہے؟ مسئلہ تو واقعی بہت بڑا ہے۔''

''چائے تو آپ پی چکی ہیں، ایک آدھ بسکٹ ہی لے لیجیے۔'' عذرا نے پلیٹ شیما کی طرف بڑھائی اور بتایا کہ وہ کالج کی D.P.E ہے۔ اس وقت بھی وہ ٹریک سوٹ کے پاجامے کے ساتھ لمبی سی شرٹ پہنے، جوگر چڑھائے چاک و چوبند کھڑی تھی۔

''آپ لوگ مکان کی تلاش ضرور کیجیے لیکن ساتھ ہی پرنسپل صاحبہ پر زور دیجیے، کالج کے اندر ہی رہائش کے لیے، کالج نیا بنا ہے بچیوں کی تعداد کم ہے۔ کوئی نہ کوئی کمرہ خالی کیا جا سکتا ہے۔''

عذرا نے رازدانہ انداز میں، آنکھیں گھماتے ہوئے مشورہ دیا۔

بعد میں عذرا (جو سارے سٹاف میں عجّو کہلاتی تھی) سے تفصیلی ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ ہمہ وقت اپنی خدمات، دوسروں کی مدد کے لیے پیش رکھتی ہے۔ صاف دل، چلبلی، شوخ اور بے تکلّف۔۔۔ زندگی کو بھی کھیل کا میدان سمجھتی تھی۔۔۔ ہنستی کھیلتی، دھکّے دیتی، دھکّے کھاتی۔۔۔ گالیاں بکتی۔۔۔ کالج کے جس کونے میں بھی ہوتی، اپنی موجودگی کا پتا دیتی رہتی۔

تھوڑی دیر کے بعد چوکیدار نے آکر بتایا کہ مس شیما کے والد صاحب ان کا انتظار کررہے ہیں۔

"شیما، انکل کوئی گھر دکھانے کے لیے بلا رہے ہوں گے، ہمیں رہنا تو ساتھ ہی ہے تو کیوں نا، ہم بھی چلیں۔" نگار نے کہا۔

"بالکل۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ یہ تو اور بھی اچھا ہے۔"

وہ چاروں باہر نکلیں اور پروفیسر صاحب سے ملیں۔

عجّو نے پروفیسر صاحب کو بھی چائے کی پیشکش کی لیکن ان کے بتانے پر کہ پرنسپل صاحبہ انہیں چائے پلا چکی ہیں، وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

پروفیسر صاحب نے بتایا کہ کالج سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گھر ہے جو کہ وقتی طور پر لیا جا سکتا ہے، تو سب ان کے ساتھ چل دیں۔

یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ پیچھے ایک کمرہ تھا جس میں مکان مالکن اپنے بارہ سالہ نواسے کے ساتھ رہ رہی تھی۔ صحن اچھا خاصا تھا۔ جس کے ایک کونے میں برآمدہ نما کچن تھا۔ دوسرے کونے میں خاتون خانہ کا غسلخانہ تھا۔ 'بیٹھک' اور اس سے ملحقہ غسلخانہ وہ خاتون کرایہ پر دینا چاہتی تھیں۔ سبھی لوگ اس صورتِ حال سے پریشان ہوگئیں۔ پروفیسر صاحب کو گلستان صاحب ہیڈ کلرک نے مشورہ دیا کہ فی الحال یہاں رہائش رکھ کر کوئی بہتر مکان

ڈھونڈ لیا جائے۔

شہلا کے کوئی عزیز شہر میں رہتے تھے۔ وہ فی الحال وہاں رکنے کا ارادہ رکھتی تھی، ان کی درخواست پر اس نے اسے ایک دن کے لیے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ یاسمین کو واپس جانا تھا۔ شیما لوگوں نے اسے بس کے اڈّے پر چھوڑا اور پھر واپس چل دیے۔

شیما چپ سی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اس کی پریشانی بھانپ کر کہا۔

"پرسوں آتے ہوئے آپ اللہ رکھی کو ساتھ لے آئیے وہ کھانا وانا بنا دے گی اور پھر ایک دو دن میں بہتر گھر تلاش کر لیا جائے گا۔"

اس پر وہ قدرے مطمئن ہوگئی۔

پروفیسر صاحب نے ایک ہفتے کا پیشگی کرایہ خاتون کو دے دیا تھا، جو کہ برائے نام ہی تھا۔

سوموار کو چاچا فیروز، شیما اور اللہ رکھی کو چھوڑنے کے لیے آئے۔ شیما کو کالج اتار کر دونوں مکان پر چلے گئے اور ڈرائیور کو اللہ رکھی کا بتایا ہوا سودا سلف لینے بھیج دیا۔

نگار نے پہلے دن ہی شیما کو، بقول اسی کے 'دفعہ ۳۰' کے اختیارات دے دیے تھے۔

اس کا سامان بھی چاچا فیروز گھر پر لے گئے۔ ڈرائیور، ان کے لیے دو چارپائیاں خرید لایا۔

جب دوپہر کو کالج سے فارغ ہوکر شیما اور نگار پہنچیں تو کمرے کو دیکھ کر مارے حیرت اور خوشی کے ان کی چیخ ہی تو نکل گئی۔ اللہ رکھی نے کمرہ اچھا سا صاف کر کے، ایک دیوار کے ساتھ دونوں چارپائیاں لگا کر ان پر بستر بنا دیے تھے جس سے 'مکان' فوری طور پر 'گھر' میں تبدیل ہوگیا تھا۔ خاتون خانہ سے مستعار لیے گئے چھوٹے سے میز پر کھانا چنا تھا۔ بھنی ہوئی مرغی، سلاد اور تنور کی روٹیاں اور میٹھے میں کھیر تھی۔ یہ کھانا اماں نے بنا کر، ساتھ میں دیا تھا۔ نگار نے کھیر کا پہلا چمچہ ہی منہ میں رکھا اور چلاّئی۔

"آفت۔"

اور بھاگ کر اللہ رکھی کو گلے سے لگالیا۔ اللہ رکھی کا تو اس سے تعارف ہی نہ تھا وہ اس 'یلغارِ محبت' سے حیران سی رہ گئی۔

اللہ رکھی نے بتایا کہ چاچا فیروز اور ڈرائیور بھی کھانا کھا چکے ہیں اور خاتونِ خانہ اور ان کا نواسہ بھی۔

''شیما میں نے سوچا، بوڑھی عورت کیسی مشکل سے کھانا بناتی ہوگی۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ جب تک میں یہاں ہوں، تمہیں کھانا بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں اتنے لوگوں کا پکے گا، تم ڈیڑھ بندے بھی وہاں ہی کھالیا کرنا۔ بے چاری بہت دعائیں دے رہی تھی۔'' اللہ رکھی شیما کو بتانے لگی۔ ''میں سویا بھی اسی کے کمرے میں کروں گی۔''

چاچا فیروز اور ڈرائیور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ گئے۔ وہ باقی ماندہ سامان، پھل، سبزی اور جلانے کے لیے لکڑیاں وغیرہ لے آئے تھے۔ اب انہوں نے جانے کی اجازت چاہی۔ چاچا فیروز نے شیما کے سر پر پیار دیا تو نگار نے بھی ان کے سامنے سر جھکا دیا۔ انھوں نے اللہ رکھی کو، شیما کا خیال رکھنے کے لیے ہدایات دیں تو اللہ رکھی نے کڑوا سا منہ بنالیا جو کہ نگار کو نہایت مناسب لگا۔

''اب اس سے زیادہ وہ اور کیا خیال رکھ سکتی ہے؟''

کھانے کے بعد دونوں تھوڑی دیر کے لیے بستر میں چلی گئیں۔ دونوں کو ہی لگ رہا تھا کہ ان کی برسوں پرانی دوستی ہے۔ اجنبیت کا شائبہ تک نہ تھا۔

اللہ رکھی اس دوران باورچی خانے کو ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ خاتونِ خانہ سے گپ شپ لگاتی رہی۔

شام کو اللہ رکھی کمرے میں آئی تو نگار نے چادر سے منہ نکال کر، زوردار ہانک لگائی۔

''چائے۔''

اللہ رکھی کو ایک بار پھر، حیرت کا سامنا تھا۔

وہ چائے بنانے جا رہی تھی کہ شہلا اور یاسمین بھی آ گئیں۔ آج دوپہر کو یاسمین بھی شہلا کے ساتھ چلی گئی تھی اور اب وہ دونوں بمعہ ساز و سامان آ رہی تھیں۔ شہلا اپنے عزیزوں کے گھر سے چارپائی لے آئی تھی۔ یاسمین کی چارپائی کا بندوبست اللہ رکھی نے 'خالہ مالکن' سے مستعار لے کر، کر دیا۔ ان دونوں کے بستر بھی جم گئے۔ اب کمرے میں بمشکل چلنے پھرنے کی جگہ تھی۔ یاسمین نے ناک بھوں چڑھائی، جو واش روم کا جائزہ لینے کے بعد دو چند ہوگئی۔

اللہ رکھی چائے لے آئی۔ گوالا تازہ دودھ دے کر گیا تھا۔۔۔ بہت عمدہ۔ اس میں خوب چائے کی پتی ڈال کر، اللہ رکھی نے 'کڑک' سی 'دودھ پتی' بنائی تھی اور ساتھ میں بسکٹ۔۔۔

کسی طور لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ لوگ آج ہی اس گھر میں آئی ہیں۔

نگار نے چائے کی چسکی لی اور آنکھیں میچ کر گنگنائی۔

ع ''اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں''

شیما نے اپنی 'ہم پیالہ' کی طرف دیکھا اور خوشی کی لہر اس کے دل کو چھوگئی کہ وہ بھی شعری ذوق رکھتی ہے۔

ادھر نگار، اللہ رکھی کے لیے مسلسل 'تعریف نامہ' جاری کیے جا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ موجودہ صورت احوال سے، اگر اللہ رکھی کو نکال دیا جائے تو کیا ہو۔۔۔؟

چائے سے فارغ ہو کر نگار بستر سے نکلی، تکیہ سیدھا کیا۔ چادر تہہ کر کے پائنتی میں رکھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے شیما کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور اس کا بازو پکڑ کر صحن کے کونے میں چلی آئی۔ اس کے چہرے پر، بلا کی سنجیدگی تھی۔

(یا خدا! یہ سنجیدہ بھی ہو سکتی ہے؟) شیما نے سوچا۔

''دیکھو شیما، میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ اور یہ بہت اہم ہے۔ میں جس سے پیار کرتی ہوں (اتنی رازداری؟ ابھی سے!) اس کے نام کے ساتھ مہ پارہ،

بانو، سلطانہ یا آرا کا سابقہ یا لاحقہ لگا دیتی ہوں۔ تم کیا پسند کرو گی؟ میٹرک میں میری دوست کا نام صفیہ تھا۔ میں اسے 'صف آرا' کہتی تھی صف، صفیہ سے نکلا تھا اور آرا میری محبت سے۔''

شیما ابھی پہلی نظر کی محبت کے، اس انوکھے اظہار سے ہی جانبر نہ ہو پائی تھی کہ اس نے خود ہی جواب دے کر اسے اس آزمائش سے نکال دیا۔

''میرا خیال ہے آرا ہی مناسب رہے گا۔ ہاں تو شیما آرا، میں کہہ رہی تھی کہ انتظامات بہت اچھے ہو گئے ہیں لیکن تم زیادہ ہوا میں اُڑنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ یہ سب میرے انکل اور آنٹی کی بدولت ہیں اور ان کا بوجھ بردوشِ اللہ رکھی باجی ہے اور مزید یہ کہ اب چل کر شہلا سے پوچھتے ہیں کہ وہ کس نام کے حق میں ہے۔ ویسے مجھے تو سلطانہ ہی صحیح لگ رہا ہے۔۔۔ سلطانہ شہلا۔۔۔ واہ وا۔۔۔ اور تم جو چاہے سمجھو، یاسمین سے پوچھنے کا حوصلہ فی الحال میں اپنے میں نہیں پاتی۔۔۔ شاید اس کے لیے بھی آرا ہی مناسب رہے گا۔ وہ دوسرا والا آرا۔۔۔'' اس نے ہاتھ کے اِشارے سے بتایا۔

شیما انتظار میں تھی کہ وہ اسے بھی کچھ کہنے کا موقع دے کہ وہ پھر سے شروع ہو گئی۔

''لیکن میں اپنے نام سے مطمئن نہیں ہوں۔ اگر میرا نام نگار بیگم ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔۔۔ نگار۔۔۔ بیگم۔۔۔ کتنا ٹھسے دار نام ہوتا۔ میرا نام تو والد صاحب نے نگار پروین رکھا تھا، یہ تو میں نے، میٹرک کے داخلہ فارم میں اپنا نام نگار صلاح الدین لکھ دیا تھا اور پھر خود ہی اخبار میں اشتہار دے آئی تھی۔ کتنا مزا آیا تھا اسے اخبار میں پڑھ کر۔ اشتہار کے لیے پیسے، صف آرا سے اُدھار لیے تھے۔ پھر بڑی مشکلوں سے، والد صاحب سے لے کر واپس کیے۔۔۔ خیر۔۔۔ اب میرا نام بارُعب تو بہت لگتا ہے۔۔۔ نگار صلاح الدین۔۔۔ جیسے کسی بڑے ملک میں سفیر بنا کر بھیجی جا رہی ہوں۔۔۔ ہے نا!''

OO

آخر عجّو نے کام دِکھا ہی دیا۔ اس نے ایک بہت اچھا کمرہ ڈھونڈ نکالا۔ کالج میں

B.Sc کی کلاسز شروع کرنے کے لیے، لیبارٹریز موجود تھیں۔ عمارت کی حد تک۔ لیکن سامان اور سٹاف کی عدم موجودگی کی وجہ سے کلاسز شروع نہیں کی جا سکی تھیں۔ یہ کیمسٹری کی لیبارٹری تھی، کافی بڑی۔ اس کے ایک کونے میں ایک چھوٹا کمرہ تھا جس میں شیلف لگے ہوئے تھے، تجربات سے متعلقہ سامان اور کیمیکل رکھنے کے لیے۔ دوسرے کونے میں ایک نسبتاً کھلا کمرہ، متعلقہ لکچرر کے آفس کے لیے تھا، جس سے ملحقہ واش رُوم بھی تھا۔ اس وقت کمرے میں ٹوٹا پھوٹا فرنیچر پڑا تھا، جسے کسی دوسری جگہ پر منتقل کیا جا سکتا تھا۔

کمرے کی 'دریافت' کے بعد اب مرحلہ تھا پرنسپل صاحبہ سے بات کرنے کا، جو اتنی آسانی سے حل ہو گیا کہ ان لوگوں نے اپنے حق میں جو تقریریں تیار کر رکھی تھیں، ان کی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور نگار نے جو حد درجہ مسمسی شکل بنا رکھی تھی، وہ بھی ٹھکانے پر واپس آ گئی۔ کیونکہ مسز ظہیر نے فوراً ان کی تجویز مان لی تھی۔ وہ اس بات کی قائل تھیں کہ اگر سٹاف کے جائز اور ممکنہ مسائل حل کر دیئے جائیں تو ان کی کارکردگی پر، بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

ان لوگوں کی خوشی کی اِنتہا نہیں تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ کالج کے اندر رہنے سے اُنھیں آنے جانے اور سکیورٹی کا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا، کالج میں ہاسٹل کی لڑکیوں کی موجودگی اور دوسری کولیگز کے ہونے کی وجہ سے رات کو رونق ہو گی اور سوئی گیس کی موجودگی میں کھانا بنانے میں آسانی کی وجہ سے، اللہ رکھی کو واپس بھیجنا ممکن ہو گا۔ شیما اور اللہ رکھی کے ساتھ ساتھ، شہلا اور نگار بھی امّاں کے روزمرّہ کام میں مشکل کی وجہ سے فکرمند رہتی تھیں۔ آمنہ کے آئی۔ کام کے اِمتحانات ہونے والے تھے اور وہ مصروف تھی۔

اگلے ہی روز، شیما اور نگار نے کالج کے ملازموں کی مدد سے اپنی نگرانی میں فرنیچر شفٹ کروایا۔ دیواروں کی جھاڑ پونچھ ہوئی تو ایک دم جھکا جھک سفیدی نظر آنے لگی۔ کیونکہ یہ کمرہ کبھی استعمال ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے دُھل کر تیار ہونے کے دوران شہلا اور اللہ رکھی پرانی رہائش گاہ پر جا کر سامان باندھ چکی تھیں۔ مس یاسمین نے، نہ تو اپنا سامان انھیں چھونے

دیا اور نہ ہی ان کی مدد کروائی۔ چوکیدار سردار خان نے سامان منتقل کروادیا۔

کمرے کی تیسری دیوار میں بڑی سی کھڑکی تھی جو کہ لان میں کھلتی تھی۔ نگار بازار گئی اور بڑے بڑے گلابی پھولوں والی بادامی رنگ کی کاٹن، پردے بنانے کے لیے لے آئی۔ بادامی رنگ کے بیڈ کور تو یہ پچھلی رہائش گاہ میں لے ہی چکی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ میز اور چار کرسیاں رکھیں اور میز پر جگ میں گلابی بوگن ویلیا کے ڈھیر سارے پھول، بھر دیے گئے۔ ہوم اکنامکس لیب میں موجود سلائی مشین پر، اللہ رکھی نے انھیں سادہ سے پردے سی دیئے۔ اتنی دیر میں شیما اور شہلا نے کچن ترتیب دے دیا۔ واش رُوم کے ساتھ والے کمرے میں سامان رکھ دیا گیا۔ اسی میں کپڑے بدلنے کی سہولت ہوگئی اور ایک بار پھر ایسے لگ رہا تھا کہ نہ جانے وہ کب سے یہاں رہ رہی ہیں۔ شہلا نے بتایا کہ مکان مالکن انھیں رُخصت کرتے وقت بے طرح رو رہی تھی تو ان سب کا دِل برا ہوگیا اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہفتہ میں ایک بار وہ ضرور اس مہربان خاتون سے ملنے جایا کریں گی اور ہر ماہ کچھ راشن بھی بھجوا دیا کریں گی۔

شام کی چائے، اِرم، راشدہ اور زرّیں لے کر آئیں، بہت پُرتکلّف لوازمات کے ساتھ۔ اس روز مس فضیلہ چھٹی پر تھیں۔ ان لوگوں نے مصروفیت کی وجہ سے، دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس لیے بھوک لگ رہی تھی۔ سب نے زوردار نعرہ لگایا۔

''ایک دانشور نے کہا ہے کہ اچھے ہمسائے کا کوئی نعم البدل نہیں ہے اور آج میں اسے سچ ہوتا دیکھ رہی ہوں۔ اس وقت ایسی ہی چائے کی ضرورت تھی جس سے سر درد بھی دُور ہو اور پیٹ پوجا بھی ہو جائے۔'' نگار نے بزبانِ 'ایک دانشور' اپنے دِلی جذبات کا اظہار کیا۔

''ایسی کی تیسی تمہارے دانشور کی، جو نہ سر درد کی پرواہ کرتا ہے اور نہ تھکاوٹ کی اور آن دھمکتا ہے اپنے فرمودات سمیت۔'' شیما نے سینڈوچ کا نوالہ منہ میں رکھتے

ہوئے کہا۔

''نہ سہی۔۔۔ ایک اور دانش ور نے کہا ہے کہ جو شخص عقل و دانش کو دھکے دیتا ہے اس پر علم و آگہی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔'' نگار باز آنے والی شے نہیں تھی۔

○○

اگلے روز ٹی بریک میں جب سب چائے پی رہی تھیں اور ساتھ میں مٹھائی کھائی جا رہی تھی، جو نگار لوگ کالج میں شفٹ ہونے کی خوشی میں لائی تھیں، تو حاضرینِ محفل نے ہاسٹل کے نئے باسیوں کو مبارک باد دی۔ شیما نے مسز ظہیر کے برتاؤ کی دِل کھول کر تعریف کی، اس پر راشدہ کہنے لگی۔

''مسز ظہیر بہت اچھی ہیں۔ سلجھی ہوئی عادات اور میٹھی زبان۔ مجھے تو یقین ہی نہیں ہوتا کہ یہ ہماری پرنسپل ہیں۔ میں جس کالج سے ٹرانسفر ہو کر آئی ہوں۔ اس کی پرنسپل صاحبہ اونچا سنتیں اور 'بہت اُونچا' بولتی تھیں۔ اُونچا سننے کا علاج تو وہ آلہ سماعت لگا کر کرتیں لیکن ان کے اُونچا بولنے کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ جب وہ اپنے 'متاثرین' کی 'مدح سرائی' با آوازِ بلند کرتیں تو سب لوگ خاموشی سے سنتے رہتے اور جب جواب میں 'ممدوحین' کچھ منمنانے کی کوشش کرتیں تو وہ آلہ سماعت اُتار کر میز پر رکھ دیتیں، ایک فاتحانہ نگاہ سب پر ڈالتیں اور کاغذات کھنگالنے لگتیں۔''

''واقعی مسز ظہیر کا تو جواب نہیں۔ اپنی پچھلی پرنسپل صاحبہ کی نذر ایک شعر کروں گی:

؎ دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی''

صفیہ نے کہا۔

''مسز ظہیر اتنی ہمدرد ہیں کہ اگر انھیں اندازہ ہو جائے کہ ہمارا کوئی مسئلہ ہے یا ڈیوٹی میں تھوڑا ردّ و بدل چاہتی ہیں تو اتنے پیار سے اسے حل کرتی ہیں کہ شرمندگی ہونے لگتی

ہے ورنہ مسز ہاشمی، جوان کے آنے سے پہلے یہاں پرنسپل تھیں۔ انھیں ہماری کارکردگی تو درجہ اوّل کی چاہیے تھی لیکن ہمارے مسائل سے انھیں کوئی غرض نہیں تھی۔ انھیں آگاہ کرنے کے بعد بھی وہ انجان کی انجان، رہتی تھیں۔

صلیحہ تو آتے جاتے ان کے لیے یہ شعر پڑھا کرتی تھی۔

؎ اگر وہ پوچھ لیں ہم سے، ہمیں کس بات کا غم ہے
تو پھر کس بات کا غم ہے، اگر وہ پوچھ لیں ہم سے''

''مسز ظہیر جیسے لوگ انتظامیہ میں ہوں تو ادارے کی کارکردگی، دوگنی ہو جاتی ہے۔ کبھی گھر پر کوئی مصروفیت ہو یا بچّہ ٹھیک نہ ہو تو ان کا ہمدردانہ رویہ بہت ڈھارس بندھاتا ہے۔ خواتین ملازمت کر بھی رہی ہوں تو گھرداری اور بچّوں کی ہر طرح کی ذمہ داری تو انھی کی ہوتی ہے نا! ایسے میں جب وہ ہمارا خیال رکھتی ہیں تو ہم بھی اپنے کام میں کوتاہی نہیں کرتیں۔ جان لڑا دینے کو جی چاہتا ہے۔''

''لیکن سبھی لوگ تو ایسے نہیں کرتے۔ ان کی نرمی سے فائدہ اُٹھانے والے بھی بہت ہیں۔''

''خیر، ایسے ناقدر لوگ تو ہر زمانے میں ہر جگہ ہوتے ہیں۔''

''ہاں ـــ انھی ناقدروں، کے لیے شاعر نے کہا ہے:

؎ نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں''

نگار نے سنجیدگی سے کہا:

''آپ بتا سکتی ہیں آنسہ نگار صلاح الدین، کہ اس شعر کا اس بات سے کیا تعلّق ہے؟''

''تعلّق ہے اگرچہ ناجا ـ ـ'' نگار نے بڑے وثوق سے کہا۔

''بس، بس براہِ کرم آپ خاموشی اختیار کیا کیجیے۔'' فاخرہ نے جل بُھن کر کہا۔

''ہم لوگ تو اپنی پرانی پرنسپل کے سارا وقت کے طعنوں کی زد میں رہتی تھیں۔ کسی دن وہ کالج میں موجود نہ ہوتیں تو لگتا کہ کسی چیز کی کمی ہے۔ زندگی بے رنگ نظر آتی اور ہم باجماعت ان کی ہونے والی بہوؤں پر ترس کھاتے، جوان کے دائرۂ اختیار میں آنے کے بعد ایسے ہی طعنوں کی بوچھاڑ میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزارنے والی تھیں۔ ویسے یہ ہے کہ ساس کے طعنوں کے عادی ہونے کے لیے، وہ ایک تربیت گاہ کا درجہ رکھتی تھیں۔''

''میری تو نئی جاب ہے۔ اس سے پہلے کا تو مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہاں جب زمانۂ طالبِ علمی میں ہم پرنسپل آفس کے پاس سے گزرتے اور پرنسپل صاحبہ کی طبیعت جلالی پر ہوتی، تو ان کی زوردار آواز سے، ان کے آفس کی پچھلی کھڑکی کے پاس والے درخت پر بیٹھے پرندے پُھر سے اُڑ جاتے تھے۔'' نگار نے آنکھیں یوں پھیلا رکھی تھیں جیسے ابھی تک خوفزدہ ہو۔

''کل میں مسز ظہیر کے آفس گئی تھی، جب میں نے کہا کہ میڈم میرا پرس آج کل غربت کی لکیر کے نیچے زندگی بسر کر رہا ہے۔ کیونکہ پانچ ماہ سے تنخواہ رُکی ہوئی ہے، میری میڈیکل Leave ختم ہونے کے بعد سے، تو انھوں نے اسی وقت ہیڈ کلرک صاحب کو بلا کر کہا کہ آپ ذاتی طور پر A.G آفس جائیں اور اس کیس کے سلسلے میں ضروری کارروائی کریں، پھر اُن کے جانے کے بعد میری طرف جھک کر آہستگی سے کہنے لگیں۔

''پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو۔''

پیسے تو میں نے کیا لینے تھے لیکن دل سے آواز آئی۔

''قربانت شوم۔''

''یہی تو یار خاندانی لوگوں کی نشانی ہے۔ ان کے میکے اور سسرال والے بھی بہت پڑھے لکھے اور شریف لوگ ہیں اور یہی باتیں ان کے مزاج کا خاصہ ہیں۔''

''ہماری پرنسپل صاحبہ بہت 'تجریدی' انداز میں گفتگو کرتی تھیں۔ شہلا وہ کیا پنجابی

محاورہ ہے کہ

''گونگے دیاں رمزاں، گونگا جانداا ے یا گونگے دی ماں، کے حساب سے ان کی باتیں ہم ہی سمجھتے تھے۔ ایک غیر متعلقہ شخص تو ان کی گفتگو سن کر حیران ہی ہوتا رہتا تھا کہ انتظامیہ کے لوگ اِتنے نرم خو اور ہمدرد بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جب وہ کسی کام کے بارے میں کہتیں

''میرا خیال ہے یہ کر لیتے ہیں۔''

تو دراصل ان کا مطلب ہوتا۔

''تم لوگ یہ کر لو۔''

اور جب کہتیں۔

''شاباش۔۔۔ بہت اچھا کام کیا ہے۔''

تو مخاطب لکچرر سہم جاتی کہ اب کاموں کا انبار ہوگا، جو اسے کرنا ہوگا۔

اور جب کہتیں۔

''یہ ہمارا کام ہے سب مِل کر کریں گے۔''

تو دراصل وہ یہ کہنا چاہتیں کہ خرابی کی صورت میں، وہ اکیلی ذمہ دار نہ ہوں گی۔

اور جب کہتیں۔

میرے سوالوں کا جواب دیجیے تا کہ مجھے اندازہ ہو جائے کہ آپ اس کام کے بارے میں کتنا سا جانتی ہیں۔

تو اندر کی بات یہ ہوتی کہ وہ خود اس سے قطعاً نابلد ہیں۔

OO

یاسمین اپنے مسائل میں گھری ہوئی، ایک تنہا خاتون تھی۔ بہت پڑھے لکھے خاندان سے تعلق تھا۔ نہایت سلجھی ہوئی عادات کی مالک۔ (شکل وصورت سے اگر چہ ڈارون کی تھیوری

ل گمشدہ کڑی (Missing Link) ہی لگتی تھی۔) شوہر سے علیحدگی، شادی کے دو سال بعد ہی ہوگئی تھی۔ ایک بیٹا تھا، جو اب پانچ سال کا تھا۔ باپ نے بیٹا لینے کے لیے عدالت سے رجوع کر رکھا تھا جن دِنوں مقدمے کی سماعت نزدیک ہوتی، یاسمین کی طبیعت جو یوں بھی حالات کے پیشِ نظر کافی اُلجھی ہوئی تھی، دو چند ہو جاتی۔ (ویسے، لوگ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ وہ حالات کے ہاتھوں ایسی ہوگئی تھیں یا ایسی تھیں تو حالات یہ رُخ اختیار کر گئے تھے۔)

نئی آنے والی چاروں لکچررز ایک ہی واش رُوم اِستعمال کرتی تھیں۔ یاسمین کو ہاتھ دھونے کی بیماری (Washing Mania) تھی۔ اِس لیے چیزوں کو بار بار دھونے کی عادت تھی۔ اس وجہ سے باقی لوگوں کو تیاری میں دیر ہو جاتی۔ شیما اس کے نفسیاتی مسئلے کو سمجھتی تھی اور یوں بھی صلح کُل رہتی تھی، لیکن شہلا جھنجھلاتی اور نگار تو ساتھ ساتھ رواں تبصرہ کرتی۔

''ناظرین۔۔۔ اب لوٹے کی باری ہے اسے دسویں بار دھویا جا رہا ہے۔ چار بار اور دھونا باقی ہے۔ اس کے بعد اگلا نمبر بالٹی کا ہے۔ اس کو دس منٹ تک 'کوچی' سے رگڑا جائے گا اور بچی کھچی بالٹی کو اکیس بار دھونے کی رسم ادا کی جائے گی۔ یاسمین، واش رُوم سے باہر آتے ہی آپ لوگوں کو ذاتی صفائی ستھرائی (Personal Hygiene) پر ایک لکچر دیں گی۔ آپ، اگر چہ ان کے انتظار میں تھک کر چور ہو چکی ہیں پھر بھی ان کی بات غور سے سنیے گا ورنہ ان کی طبیعت پر گراں گزرے گا اور اگر یہ بات انھوں نے شدّت سے محسوس کی تو ان کا دِل ٹوٹ جانے کے قوی امکانات ہیں۔۔۔ اور لیجیے ناظرین، انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں وہ اپنا مگ، لوٹا اور بالٹی اُٹھائے ہوئے باہر آ رہی ہیں۔ اب وہ اسے دھوپ میں رکھیں گی اور کالج کی گھنٹی بجنے تک رکھے رہیں گی تا کہ اس کے باقی ماندہ جراثیم کا قلع قمع ہو سکے۔''

کچھ الفاظ، اگر گزرتے گزرتے، یاسمین کے کانوں میں پڑ جاتے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے والا حساب ہو جاتا۔

یاسمین کو (dieting) کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ ہمہ وقت لوگوں کو ڈائٹنگ

کے سنہری اصولوں سے آگاہ کرتی رہتیں۔ خود تو چوکر کی روٹی (Bran Bread) کو جلا جلا کر اس کے حرارے ختم کرتیں اور چکوترے کے ڈبہ بند کڑوے جوس کے ساتھ نگلتیں اور بغیر شکر اور دودھ کے چائے کا پیالہ پی کر بہت خوش ہوتیں کہ وزن یقیناً کم ہو گیا ہوگا پھر تھوڑی دیر کے بعد بقول شفیق الرحمٰن ''دِکھا تو سہی تو کیا کھا رہی ہے؟'' کے مصداق باقی لوگوں کی پلیٹوں سے ان کا ناشتہ چکھتیں۔ اچار اور پراٹھے کے بے مثال جوڑ میل، پر کچھ تعریفی کلمات ادا کرتے ہوئے ایک بڑا سا نوالہ لیتیں۔ آملیٹ، جیم اور ٹوسٹ کا ناشتہ تو خیر ہے ہی بہت اچھا۔۔۔ سو وہ بھی ایک بھرپور نوالہ اور پھر دودھ پتّی کے آدھے کپ کے ساتھ دو چمچے گاجر کا حلوہ چکھتیں اور ڈائننگ کے سنہری اصولوں سے ایک بار پھر سب کو مستفیض کرتے ہوئے، باہر نکل کر دھوپ میں سے اپنی بالٹی مگ اور لوٹا اُٹھا کر لاتیں اور اس پر نائلون کا بڑا سا لفافہ چڑھا کر اسے اپنی چارپائی کے نیچے، احتیاط سے سینت کر رکھ دیتیں۔

ایک روز نگار واش روم سے واپس آئی تو یاسمین کے خیال میں وہ بہت جلد آ گئی تھی۔ پوچھنے لگیں۔

''تم استنجا نہیں کرتیں؟''

نگار نے کہا۔

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ بالکل کرتی ہوں۔۔۔ صبح میں تو ضرور ہی کرتی ہوں۔۔۔ ویسے کیا ہر بار کرنا ضروری ہوتا ہے؟'' لہجہ رازدارانہ تھا۔

اب یاسمین سارا دِن تڑپتی پھرتی رہیں۔ وہ تو پرنسپل کے پاس جا کر، کمرہ بدلنے کی دَرخواست کرنے والی تھیں کہ ایسی خاتون کے ساتھ رہنے کو وہ ہرگز ہرگز تیار نہیں جسے ذاتی صفائی ستھرائی کی الف بے بھی معلوم نہیں، لیکن پھر باقی لوگوں کے سمجھانے پر باز آئیں کہ نگار اس وقت مذاق کے موڈ میں تھی۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ اور دوسری بات یہ کہ کالج میں اور کوئی فالتو کمرہ نہیں ہے۔ (یہ بات یاسمین کے دِل کو لگی اور معاملہ یوں رفع دفع ہوا۔)

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد مس یاسمین نے اپنی ٹرانسفر کروالی۔ کیونکہ اس سے پہلے، جب وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھیں تو انھیں نفسیاتی طور پر بہت سہارا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب وہ ہاسٹل میں رہنے کی وجہ سے اپنے بیٹے کو ساتھ نہیں رکھ سکتی تھیں۔ یوں بھی انھیں عدالت میں پیش ہونے اور وکیل سے مشورہ کے سلسلہ میں اکثر سفر کرنا پڑتا تھا۔

ان کے جانے سے کمرے میں یکدم سکوت سا طاری ہو گیا۔ اپنی تمام تر پریشانیوں اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کے باوجود، وہ بہت اچھی اور نرم دِل ساتھی تھیں۔

نگار، نے تو ان کی غیر موجودگی کو بہت محسوس کیا۔

''یار بڑی رونق رہتی تھی ان کے ساتھ۔۔۔ اور اب نہ جانے کیا ہوگا؟ ہماری 'پرسنل ہائجین' جو پہلے ہی تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے، لیکچر نہ ملنے کے باعث، مکمل طور پر برباد ہو جائے گی۔''

پھر دو روز کے بعد ہی ایک اور ٹرانسفر کیس، مس سمیعہ لیکچرر اسلامیات کا، ان کے کمرے میں ورود ہوا۔

OO

سہ پہر سے شدید بارش ہو رہی تھی۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ بہتے پرنالے، برستی بارش کا شور اور بڑھتا ہوا اندھیرا، اُداسی پیدا کر رہا تھا۔ رہی سہی کسر، بجلی بند ہونے سے پوری ہو گئی تھی۔ سبھی بستر میں دُبک گئی تھیں۔ اپنی اپنی رضائی سے ناک باہر نکالے، تھوڑی دیر گپ شپ ہوتی رہی اور پھر جیسے ہی بستر گرم ہوئے وہ لوگ سو گئیں۔

آنکھ، دودھ والے کی دستک سے کھلی تھی۔ بے چارہ سر سے پاؤں تک چراپونجی بنا، مارے سردی کے کپکپا رہا تھا۔ نگار نے دُودھ کے لیے برتن اس کے سامنے رکھا تو وہ کہنے لگا۔

''باجی، سمیعہ باجی جی سے بات کرنی تھی۔''

(میں باجی اور وہ باجی جی؟۔۔۔ہائیں)

''وہ تو آج یہاں نہیں ہے۔ آپ نے کیا بات کرنا تھی گلزار بھائی؟ کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔'' نگار نے پوچھا۔

''وہ جی میری بیٹی کو 'ہوائی' کسر ہے۔ دورے پڑتے ہیں۔ جب 'باہر والی چیز کی حاضری' ہوتی ہے تو کھڑے کھڑے گر جاتی ہے لیکن وہ 'چیز' اسے سنبھال بھی لیتی ہے۔ اللہ کی رحمت سے کبھی چوٹ نہیں لگی اسے۔ جسم اکڑ جاتا ہے، منہ سے جھاگ نکلتی ہے۔''

''کتنی دیر رہتا ہے یہ دورہ۔'' شیما نے پوچھا۔

''یہی جی کوئی پندرہ بیس منٹ۔''

''کبھی بے ہوش بھی ہو جاتی ہے؟''

''ہاں جی کبھی کبھی۔۔۔ لیکن عام طور پر تو مردانہ آواز میں زور زور سے بولتی ہے۔ کبھی ہنستی ہے کبھی روتی ہے۔ یہ وہ خود نہیں ہوتی جی، 'حاضر چیز' ایسے کرتی ہے۔''

''پھر آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟''

''کرنا کیا ہے جی، سب زور زور سے کلمہ پڑھتے ہیں۔ اس کی ماں تو بہت ہی گھبرا جاتی ہے۔ 'دھی' کا 'دھن' ہے۔ اس کی خبر برادری میں پہنچ گئی تو رشتہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ؟ لیکن اس ساری بات سے مس سمیعہ کا کیا لینا دینا؟''

''وہ جی بادشاہ ہیں۔ کوئی تعویز دے دیں گی یا پانی دم کر دیں گی تو اللہ بچّی کو شفا دے دے گا۔''

''وہ تو آج یہاں نہیں ہیں اور گلزار بھائی یہ آپ کے پاس کیا ہے لفافے میں؟'' شہلا نے پوچھا۔

''دیسی انڈے ہیں باجی۔''

''اچھا تو آپ یہ بھی لا کر دیتے ہیں۔ ہمارے لیے بھی لا دیا کریں۔''

''نہیں جی، لاتا تو نہیں ہوں۔ ہمارے پاس ایک ہی مرغی ہے۔ یہ اسی کے انڈے ہیں۔ میں باجی جی کے لیے لایا تھا۔ ان سے دُعا کروانی ہے نا!''

''یار میں بھی، نا تعویز لکھنے شروع کر دوں، آج کل رضائی میں بیٹھ کر 'گرم انڈے۔۔۔ے ے۔'' نگار نے سرگوشی کی۔

''انسان بنو!'' شہلا نے آنکھیں نکالیں۔

''گلزار بھائی۔ یہ ہوائی کسر نہیں ہے۔ یہ اور مسئلہ ہے۔ آپ اسے کسی وقت لے کر آیئے گا۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔ دوا کھائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی ان شاءاللہ۔'' شیما نے کہا۔

''اور جن صاحب کی چھٹی ہو جائے گی۔'' شہلا نے کہا۔

''نہ باجی ایسے نہ کہیں۔ 'وہ' ناراض ہو جائیں گے۔''

''گلزار بھائی۔ آپ فکر نہ کریں۔ گناہ ثواب ہمارے سر۔''

نگار نے کھلے دِل سے پیش کش کی۔

''اچھا جی۔'' گلزار بھائی نے بے دِلی سے کہا۔ ''لیکن مہربانی سے اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں۔ میں نے تو اسے کبھی باہر کا دروازہ نہیں دیکھنے دیا۔ نہ ہی کوئی سہیلی ہے اس کی، میں نے بنانے ہی نہیں دی۔ کیونکہ 'سہیل پنے' میں بڑی خرابی ہوتی ہے کبھی سہیلی ملنے آئے گی، کبھی یہ جائے گی۔ کوئی رشتہ دار بی بی آ جائے تو میں تو اس کے پاس بھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ لڑکی کو زیادہ 'کھل' نہیں دینی چاہیے۔''

''پھر کوئی تو ملاقات کے لیے آئے گا نا! جن، پری، چڑیل۔۔۔'' نگار بڑبڑائی۔

''آپ کے باقی بچّوں میں تو کسی کا یہ مسئلہ نہیں ہے؟'' شیما نے پوچھا۔

''نہیں جی اللہ کا شکر ہے۔ میرے پانچ لڑکے ہیں چار اپنے اپنے گھروں اور کام میں set ہیں۔ چھوٹے کی شادی کرنی ہے۔ وہ تانگہ چلاتا ہے۔ دِن رات کام کرتا ہے۔ دو

گھوڑے رکھے ہیں اور دو تانگے۔ ایک پر دِن کو جاتا ہے دوسرے پر رات کو۔ لوگوں نے بہت کہا کہ دو تانگے رکھ کر کیا کرے گا لیکن وہ بڑا سیانا ہے۔ ربّ سے ڈرتا بھی بہت ہے۔ کہتا ہے شام کو گھوڑا بدلوں تو تانگہ نہ بدلوں؟ وہ بھی تو ساتھ ہی 'وگدا' ہے۔ بس جی توبہ ہی بھلی ہے۔ ربّ سوہنے سے ڈرنا ہی چاہیے۔''

گلزار بھائی نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

گلزار چلا گیا تو شہلا نے اسی کی طرح، کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''واقعی ربّ سوہنے سے ڈرنا ہی چاہیے۔ وہ کیسے کیسے 'نمونے' پیدا کرنے پر قادر ہے۔''

''گلزار بھائی کی بیٹی کو تو 'ہوائی کسر' ہے اور اس سمیعہ کی بچّی کو شاید 'بحری کسر' ہے۔ اس کا علاج تو میں کروں گی۔ اِنتہا ہے نا! کالج کے اندر بیٹھ کر جہالت کا پرچار کر رہی ہے اور کمینگی دیکھو کہ ان غریب لوگوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بدلے میں لیتی ہے۔ ایک بے چارے کے پاس مرغی ہے۔ ہفتہ دس دِن کے انتظار کے بعد چھ انڈے جمع ہوئے، گھر میں کسی نے کھائے نہیں اور بے چارہ لے کر آ گیا۔ عالمہ سمیعہ سے دُعا کروانے۔''

نگار تلملا رہی تھی۔

''چلو مِل کر سمیعہ سے بات کریں گے، اسے سمجھائیں گے۔'' شیما نے کہا۔

تمہارا کیا خیال ہے وہ تمہارے سمجھانے سے اپنی 'دکانداری' بند کر دے گی اور جب تحفے آنے بند ہو جائیں گے تو ایتھوپیا کے قحط زدہ لوگوں کی طرح، بھوکی رہ کر موت کا شکار ہونا چاہے گی اور تو اس کا کوئی 'ذریعۂ' ہے نہیں۔ ان لوگوں سے نہ لے تو کیا کرے؟'' شہلا نے جل کر کہا۔

سمیعہ اسلامیات کی لیکچرر تھی۔ اس کا تعلق ایک پیر گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے خاندان کی پہلی پڑھی لکھی خاتون تھی۔ ایک بھائی واپڈا میں اچھے عہدے پر ملازم تھے۔ ان

کی وجہ شہرت، بھی پیر گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کی بنا پر ہی تھی۔ انھوں نے نہ جانے کیسے سمیعہ بی بی کو پبلک سروس کمیشن کے سامنے کامیاب کروایا تھا۔ سمیعہ نے تمام تعلیم پرائیوٹ طور پر حاصل کی تھی۔ ساری عمر پردے کی بوبو بنی رہی۔ کوئی کام کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ اپنی والدہ کی طرح سارا دِن چارپائی پر نیم دراز رہتی اور مریدنیاں اس کے پاؤں دباتی رہتیں جو نہ جانے کس وجہ سے ہر وقت تھکے رہتے تھے۔ لیکن وہ، اچھے اچھوں سے بہتر ماہرِ نفسیات تھی۔ وہ خواتین کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر، اسے سہلانا جانتی تھی۔ ساس، اپنی بہو سے چھپ کر اور بہو، اپنی ساس کو بتائے بغیر، اس سے مدد لینے کے لیے آتیں۔ کبھی 'ہوائی' مخلوق سے بچاؤ کے لیے اور کبھی 'زمینی' مخلوق یعنی عزیز، رِشتہ داروں کے کیے گئے جادُو ٹونے سے محفوظ رہنے کے لیے۔

سمیعہ اپنا دیا ہوا تعویز انھیں دیسی گھی میں تلنے کو کہتی اور پھر اسی گھی میں، بادام پستہ اور چینی مِلا کر، کاغذ سمیت کھا جانے کو۔۔۔ اس انوکھی ترکیب سے، غریب عورتوں کے دِل کی کلیاں کھل جاتیں کیونکہ عام حالات میں ایسی خوراک انھیں کہاں میسّر آتی تھی؟ اب تعویز کا اثر تو نجانے کب اور کیسے ہوتا ہوگا؟ پہلے مریدنی کی صحت اس Boot lace soup سے بہتر ہونے لگتی اور ساس اور بہو کے درمیان جو آگ، سمیعہ سلگاتی، اس پر یہی دیسی گھی، [illegible] کی آگ سے اُٹھنے والے دھوئیں کی طرح مہکتا رہتا اور سمیعہ کے باورچی خانے میں دیسی انڈوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ نظر آتا۔

لیکن اب اسے اپنے کام خود کرنے پڑتے تھے، روزانہ تین پیریڈ پڑھاتی، نہ چاہتے ہوئے بھی شام کو اپنی کولیگز کے ساتھ کام کرنا پڑتا تو سمیعہ کے چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

مریدنیاں یہاں بھی وقت بے وقت آن ٹپکتی تھیں جو حسبِ توفیق 'دامے، درمے، قدمے'، اس کی خدمت تو کرتی ہی تھیں، ساتھ میں پاؤں دبانے کے لیے بھی راضی تھیں لیکن مسز ظہیر، ظالم سماج بن کر آ ٹپکیں۔ انھیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ خواتین کس سلسلے میں آتی ہیں؟ وہ

توصرف ملاقاتی سمجھ کر ہی اِتنی برہم تھیں، کیونکہ لڑکیوں کے کالج میں، عجیب وغریب خواتین
کا اتنی تعداد میں آنا کسی مسئلے کا پیش خیمہ ہوسکتا تھا۔ ادھر سردار خان بھی شاید مس سمیعہ سے
دُعا کرواتا تھا یا انھوں نے اسے کوئی تعویز گھول کر پلا دیا تھا، جو بلا روک ٹوک ان خواتین کو
آنے کی اجازت دیتا تھا۔ ورنہ تو چڑیا بھی بلا اجازتِ سردار خاں، کالج کے احاطے میں پر
نہیں مار سکتی تھی۔

سمیعہ خود اس پھیکے اور بے رونق 'طرزِ زندگی' سے تنگ آ گئی تھی۔ اس لیے اس
نے نگار لوگوں کا چھوڑا ہوا مکان کرائے پر لے لیا، یہاں اس کی مریدنیوں کے آنے پر بھی
کوئی پابندی نہیں تھی اور ساتھ میں ایک ملازمہ بھی موجود تھی جو گھر کے باقی کام کرنے کے
علاوہ اس کے پاؤں بھی دباتی تھی۔

OO

مس مہ جبیں سٹاف روم کے کونے میں بیٹھی تھیں۔ نیم وا آنکھوں سے 'حالات' کا
جائزہ لیتے ہوئے وہ دُنیا کی 'بے ثباتی' پر غور کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ جبھی تو چہرے پر کبیدگی
ٹپک رہی تھی۔ نازؔ تخلص کرتی تھیں۔ اگرچہ یہ معاملہ ابھی تک صیغۂ راز میں ہی تھا کہ وہ اس کا
استعمال کہاں کرتی ہیں؟ کیونکہ ذاتی شعر تو کجا، ان کے منہ سے کبھی کسی شاعر کا شعر بھی 'منظرِ عام'
پر نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں اُردو ادب پڑھانے کے باوصف وہ اس سے گریزاں کیوں کر رہتی
تھیں۔ البتہ اُردو خوب 'مقفّٰی و مسجع' بولتی تھیں۔ وہ بات کر چکتیں تو نگار دبی زبان میں کہتی:

''میں، اُردو اور فارسی میں منشی فاضل کا امتحان دے ہی دوں تو اچھا ہے۔''

ان کو یوں خاموش بیٹھے دیکھ کر، حسبِ سابق مس فضیلہ کی رگِ ظرافت پھڑکی۔

''جبینِ نازؔ تم یوں کیوں بیٹھی ہو، جیسے ڈال پر طوطا مرا پڑا ہو۔''

مس مہ جبیں، دو دِن کی رخصت کے بعد آج کالج آئی تھیں۔ ان دونوں میں
برابر چخ چلتی رہتی تھی۔ مس فضیلہ تنگ کرنے سے باز نہ آتیں اور مس مہ جبیں چڑچڑے پن

کا مظاہرہ کرنے سے۔ مس فضیلہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''تم میری طرف زیادہ دھیان مت دیا کرو۔'' مس مہ جبیں نے رُکھائی سے
جواب دیا۔

''کیسے دھیان نہ دوں؟ ---اور تم یہ کیا پڑھاتی ہو بچیوں کو؟ کل تمہاری غیر موجودگی
میں مَیں نے تمہاری کلاس لی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی پڑھائی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ
گلہریوں نے گھر کے پردوں میں گھونسلے بنا رکھے تھے۔ تمہیں تو کبھی خیال نہیں آیا ہوگا۔ میں
Biology پڑھاتی ہوں، مجھے پتا ہے کہ گلہریاں گھونسلے نہیں بناتیں اور وہ بھی گھر کے
پردوں میں۔ میں نے بچیوں کو کہا، کہ ڈپٹی نذیر احمد کو خط لکھیں اور پوچھیں کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟
اس پر انھوں نے بتایا کہ ڈپٹی نذیر احمد تو وفات پا چکے ہیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ کوئی تو
ہوں گے، ان کے ہوتے سوتے، ان سے بات کرو۔ اب میں نے معاملہ تمہارے واپس
آنے پر اُٹھا رکھا تھا، اب باقی کا کام تم کرو۔''

''تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے میری کلاس لینے کی اور مت میری لڑکیوں کو
پریشان کیا کرو، ایسی خرافات کو لے کر۔''

''نہ سہی ---جب میرا دِل چاہے گا کسی اور کی کلاس لینے کو، تو مَیں نگار کی کلاس
لے لیا کروں گی۔ کیوں نگار؟ ٹھیک ہے نا!''

مس فضیلہ نے، جواب طلب نظروں سے نگار کی طرف دیکھا۔

نگار نے، پُرجوش انداز میں، اثبات میں سَر ہلایا۔

''نگار، بس تم مجھے صرف یہ سمجھا دو کہ آخر بیالوجی اور سوشیالوجی میں فرق کیا ہے؟''

مس فضیلہ چہک رہی تھیں۔

''جی مس فضیلہ، اگر نومولود، اپنے والدین جیسا ہو تو یہ بیالوجی ہے اور اگر ہمسائے
سے مشابہت رکھتا ہو تو یہ سوشیالوجی ہے۔'' نگار نے سنجیدگی سے کہا۔

مس مہ جبیں کا پارہ، خطرے کے نشان کو چھونے لگا۔ ان کی کانوں کی لویں سرخ ہوتے دیکھ کر مس فضیلہ نے امن کی فاختہ اُڑا دی۔

''اچھا چھوڑو ہمیں کیا؟ گناہ برگردنِ ڈپٹی نذیر احمد۔ تم مجھے بس وہ غزل سنا دو۔

ے خط ان کو لکھا کہ دِل مضطرب ہے
جواب ان کا آیا محبت نہ کرتے''

''یہ کونسا وقت ہے غزل سننے کا؟'' مس مہ جبیں نے مزید چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔

مس مہ جبیں اور مس فضیلہ دونوں ہی، اپنی شادی کی عمر کو بیس پچیس برس پیچھے چھوڑ آئی تھیں۔ مزاج میں دونوں یکسر مختلف تھیں۔ ایک مشرق تو دوسری مغرب۔ مس مہ جبیں لیے دِیے رہنے والی، نک چڑھی اور زود رنج۔ مس فضیلہ، اس کے برعکس ہنسنے ہنسانے والی۔

مس فضیلہ ہمیشہ گرے اور براؤن کے شیڈز پہنتیں۔ ان کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے جو ان کی واقعتاً، میدہ شہاب کی سی رنگت پہ، بہت سجتے تھے۔ وہ ہلکے رنگوں کے مردانہ رومال استعمال کرتی تھیں اور کلاس سے واپس آ کر، جب وہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتیں تو وہ دمکنے لگتا۔

مس فضیلہ کو ان تمام کاموں سے، کوئی دِل چسپی نہیں تھی جو خواتین سے متعلق ہوتے ہیں۔ ہوسٹل میں اپنے میس کے کاموں میں صرف اس حد تک حصہ لیتیں کہ بازار سے سودا سلف لا دیتیں۔ بجلی کا چھوٹا موٹا کام، مثلاً شو یا فیوز لگانا بھی ان کے ذمّہ ہوتا۔ کبھی ٹی وی کے انٹینا کی سمت درست کر رہی ہوتیں۔ یومِ پاکستان پر کالج کی چھت پر جھنڈا لہرانے اور برآمدوں کو جھنڈیوں سے سجانے کا کام بھی، وہی، لڑکیوں کی مدد سے کرتیں اور تو اور، شبِ برات پر ہاسٹل کے پچھلے صحن میں بچّیوں کے ساتھ آتش بازی چلا رہی ہوتیں۔ کہتیں:

''میں سدا سے ایسی ہوں، بچپن میں سہیلیوں کے ساتھ گڑیاں کھیلتی تو میں کہتی۔

''میں تانگے والا'' اور جلدی سے اتی کے دوپٹے کو سر پر لپیٹ کر منہ سے ٹخ ٹخ کی آوازیں نکالنے لگتی۔ یا کہتی۔

''میں ڈاکو'' اور کپڑے دھونے کے ڈنڈے کو بندوق کی طرح کندھے پر رکھ کر سب کو للکارتی پھرتی۔''

مس مہ جبیں، لمبے قد اور قدرے فربہ جسم والی گوری چٹی خاتون تھیں۔ خوبصورت اور بارُعب شخصیت۔ لیکن تنہائی پسند، سٹاف روم کے ایک کونے میں خاموش بیٹھی رہتیں۔ ان کے تنک مزاج ہونے کی وجہ سے لوگ ان سے بات کرنے کی کم ہی جرأت کرتے تھے لیکن مس فضیلہ بہت حوصلہ مندی سے، ان سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں۔

OO

سائیکولوجی کو مضمون کے طور پر پہلی بار کالج میں متعارف کروایا گیا تھا۔ طالبات کی بڑی تعداد نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ وجہ، کچھ تو مضمون کا نیا ہونا تھا اور کچھ، بلکہ بہت حد تک شیما کی شخصیت۔ وہ کلاس میں داخل ہوتی تو کھچا کھچ بھری ہوئی کلاس میں، خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ بچّیوں کے کھلے ہوئے چہرے اس کا استقبال کرتے تو شیما کی مسرّت کا بھی ٹھکانا نہ رہتا اور وہ روشن مسکراتے چہرے کے ساتھ، سٹاف روم میں واپس آتی۔ لیکن آج اس کے چہرے پر پھیکا پن تھا۔ گھبرائی ہوئی سی۔۔۔ آتے ہی اس نے ایک لفافہ نگار کے ہاتھ میں دیا اور خود یوں کرسی پر گری جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو۔

''خیر باشد، مزاجِ یار صبح صبح برہم ہے۔''

نگار نے پوچھا اور پھر لفافہ کھولا۔ یہ ایک خط تھا خوشبو میں بسا ہوا، حاشیے پر رنگ برنگے دِل لو دے رہے تھے۔ لکھا تھا۔

''مس، آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت پیاری ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے میری نیندیں اُڑ گئی ہیں۔ تصور میں آپ ہی آپ سمائی ہیں۔۔۔ وغیرہ

وغیرہ۔۔۔ ''میں بہت بے چین ہوں، بے قرار ہوں، آپ کی محبت کی طلب گار ہوں، ورنہ اپنی زندگی سے بیزار ہوں۔'' (یہ جملے نگار نے خود سے شامل کر دیے تھے۔)

اور آخر میں لکھا تھا:

''مِس میں کیا کروں؟''

''ڈوب مرو۔'' نگار بڑبڑائی۔

پھر اس نے خط تہہ کر کے لفافے میں ڈالا اور کہنے لگی۔

''ظالم، تو نے کس ان چھوئی کلی کے دِل کے تار چھیڑے ہیں۔ اگر اسے 'کچھ' ہو جاتا تو کون ذمّہ دار تھا؟ اب تم بتاؤ مری پیاری شیما، مری جان شیما، کیا پیو گی، خونِ دل کے علاوہ؟ چائے، شربت بزوری یا بادام کا حریرہ۔۔۔ کہ مقویٔ دِل و دماغ ہے!''

''مذاق چھوڑو۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟'' شیما منمنائی۔

''کچھ بھی تو نہیں ہو رہا میری ننھی منّی سی بہن۔۔۔ عشق ہو رہا ہے، پھٹیچر قسم کا۔ تم اب اس محبت نامے کے چار ٹکڑے کرو کہ یہی اس کا مقدر ہے اور کل اپنی عاشقِ زار کو دے دینا اور کہنا کہ اپنے حُسنِ بے پناہ کے بارے میں تو مجھے پہلے سے معلومات ہیں۔ کچھ نیا لکھو۔''

''نگار، مجھے تنگ نہ کرو۔''

''پھر کیا چاہتی ہو تم؟ 'لکھوں' یا کہ مضمون زبانی سناؤں۔۔۔ لکھوں؟۔۔۔ تم کہتی ہو تو چلو پھر یوں ہی سہی، سرکاری طریقے سے تحریری جواب دے دیتے ہیں۔

لکھو میں لکھواتی ہوں:

؎ آ کہ کچھ دِل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زرنگار کر لیں ہم

''یہ میرے اشعار ہیں۔ تم دیکھ رہی ہو۔۔۔ نگار۔''

''خدا کے لیے اب فیض کا پیچھا مت لو۔'' شہلا چلائی۔

نگار نے معاملے کو یوں سنبھالا کہ شیما کو محسوس ہونے لگا تھا کہ صورتِ حال اتنی بھی گمبھیر نہیں ہے جتنا وہ پریشان ہے۔ وہ کہنے لگی:

''نگار تم مجھ سے صرف دو سال ہی تو بڑی ہو اور پھر میں ایسی کونسی بچّی ہوں، لیکن ایسے موقعوں پر میرے ہاتھ پاؤں کیوں پھول جاتے ہیں؟''

''بات یہ ہے شیما کہ تم میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ تمہارے والد صاحب پروفیسر ہیں۔ تم دو بہنیں اور ایک بھائی۔۔۔ مختصر اولاد جسے والدین نے incubator میں رکھ کر پالا ہے۔ تم سول لائن کی رہائشی ہو اور موسیقی، شاعری اور کتابیں تمہاری ساتھی اور میں۔۔۔ آٹھ بہن بھائیوں میں میرا پانچواں نمبر اور والد صاحب ایک درمیانے درجے کے کاروباری۔ تم جانتی ہو کہ مرغی اپنے بچّوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے، لیکن میری ماں کے پاس اِتنا وقت نہیں تھا۔ کیونکہ مرغی کو تو صرف یہی کام ہوتا ہے جب کہ میری ماں کو گھرداری بھی کرنا ہوتی تھی۔ کپڑوں کی دُھلائی اور بچوں کی دھنائی سے جو وقت بچتا، وہ شام کو تھکے ہارے واپس آنے والے شوہر پر صرف ہو جاتا تھا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ابا جی نے میرا نام نگار پروین رکھا تھا، لیکن مجھے 'پروین' ہونے پر سخت اعتراض تھا۔ اس لیے میں نے میٹرک میں اپنا نام تبدیل کر کے نگار صلاح الدین کر لیا تھا۔ اب مجھے اپنا نام بہت پسند ہے۔ لیکن کبھی کبھی دِل چاہتا ہے کہ نگار بیگم ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ نگار بیگم!۔۔۔ ایک دم شاندار، پھر میں تخت پر بیٹھ کر چھالیہ کتر رہی ہوتی۔ فیروزی سلک کا سوٹ، ایک کلائی میں فیروزے کے جڑاؤ کنگن، دوسری میں نازک سی طلائی چوڑیاں، ناک میں ہیرے کی جھلملاتی کیل، گلے میں سچّے موتیوں کی لڑیاں۔۔۔ اور اس 'سادگی' میں بھی مَیں کمال کی دِکھتی۔ ہے نا!''

"جاگ جاؤ میری عزیز از جان بہنا

ع جاگ، سحر آئی ہے

سویرا ہو گیا ہے۔ چڑیاں چہک رہی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو مشامِ جان کو معطر کر رہی ہے۔

؎ اُٹھ جاگ مسافر ، بھور بھئی

تو کیوں کھٹیا پہ سووت ہے"

شہلا نے بہت محبت سے نگار کو جھنجھوڑا۔

"اب تم شروع ہو جاؤ شہلا۔۔۔تم پر بھی اس کا اثر ہونے لگا ہے اور نگار ہر پانچ منٹ کے بعد تم پٹڑی سے کیوں اُتر جاتی ہو؟" شیما اس وقت یہ سب خرافات سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"ہاں۔۔۔تو میں کہہ رہی تھی کہ تم جو شاعری کی زبان سمجھتی ہو، سنو۔

؎ ہم خود تراشتے ہیں منازل کے سنگِ میل

ہم وہ نہیں ہیں ، جن کو زمانہ بنا گیا

ہم لوگ اندرونِ شہر کے رہنے والے ہیں۔ اڑھائی مرلے کا تین منزلہ مکان۔۔۔

ہماری ماں کے پاس اِتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہمارے لیے بادام کا حریرہ اور گاجر کا حلوہ بناتیں۔ اس لیے محلّے میں جب کوئی کھانے کی چیز، بکنے کے لیے آتی تو میری باجی، دوسری منزل کی کھڑکی سے زنجیر سے بندھی ٹوکری لٹکا دیتی اور چوّنی نیچے پھینکتی، اور جو کچھ ہوتا، ہم سب بچّے چھینا جھپٹی کر کے کھا لیتے۔

ہمیں آج تک کسی نے اُنگلی پکڑ کر سڑک پار نہیں کروائی۔ اپا جی، سال، دو سال کے بعد پوچھتے تو انھیں پتا چلتا کہ میں کونسی کلاس میں پڑھ رہی ہوں۔"

شیما کے چہرے پر حیرت کے واضح آثار تھے۔

"ایسے ہی ایک دِن میں تیسری منزل کی چھت پر کھیل رہی تھی۔ میری عمر سات آٹھ سال ہو گی کہ گلی میں صدا سنائی دی۔ میں نے منڈیر پر سے جھانک کر دیکھا۔ ایک بابا جی تھے۔ میں نے پوچھا:

"بابا جی کیا بیچ رہے ہیں؟"

جواب میں انھوں نے میری طرف دیکھا اور معلوم ہے کیا کیا؟۔۔۔انھوں نے اپنا تہبند کھول دیا۔ میں چکرا کر رہ گئی۔ لیکن یقین مانو، میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا:

اگلے روز میں پھر اسی وقت چھت پر جا پہنچی۔ اس 'آس' میں کہ بابا جی پھر آئیں گے، وہی ہوا۔۔۔ میں نے پھر پوچھا اور۔۔۔ انھوں نے وہی جواب دیا، بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔ میں پوری تیاری سے آئی تھی۔ امّی کی باورچی خانے میں بیٹھنے کی پختہ لکڑی کی چوکی سے 'لیس' تھی۔ وہ زور سے نیچے پھینک دی، جو بابا جی کے سر میں لگی اور خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ میں دھڑ دھڑ سیڑھیاں اُترتی نیچے آئی۔ اتنی دیر میں بابا جی تہبند باندھ کر خون کی دھار کو ہاتھ سے روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹا چکے تھے۔

امی نے ان کی فریاد سن کر میری طرف دیکھا۔ بابا جی کی آنکھوں میں شیطانیت جھانک رہی تھی۔ پہلے تو میں زرد پڑ گئی، لیکن پھر میں نے بابا جی کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے، اُونچی آواز میں کہا:

"بتاؤں؟۔۔۔بتاؤں؟"

کہاں تو بابا جی مجھ پر تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 307 کا مقدمہ درج کروانے والے تھے اور کہاں گھگھیانے لگے اور اپنے لہجے میں دُنیا بھر کی مٹھاس بھر کر میرے سر پر پیار کرنے کی کوشش کرنے لگے لیکن جب جواب میں مَیں نے درشت لہجے میں کہا:

"مجھے ہاتھ مت لگانا۔۔۔گندا بابا۔"

تو انھوں نے جان چھڑانے میں ہی عافیت سمجھی۔ بس وہ دِن اور آج کا دِن۔۔۔

میں نے کبھی اپنے اندر اعتماد کی کمی محسوس نہیں کی اور یہ بات ہے بھی ماننے کی کہ مردوں کے مجمع میں سَر اُٹھا کر چلتے چلے جاؤ تو کیا مجال ہے کسی کی کہ آوازہ کس جائے اور اگر بقول شاعر:

ع نظر بچا کے چلو، جسم و جان چرا کے چلو

تو کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ چٹکی، دھول دھپّہ یا کوئی غلیظ فقرہ۔ میری جان، تم بھی اب انڈا کھٹک کر باہر نکل آؤ۔ دُنیا کا سرد، گرم چکھو گی تو تم میں خود ہی قوتِ مدافعت پیدا ہو جائے گی۔

OO

ہلکی بارش کے بعد موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ شیما لوگوں کا کمرہ sleeping beauty کا 'سویا ہوا محل' لگ رہا تھا۔ آج اتوار تھا اور وہ اس ویک انڈ پر گھر نہیں گئی تھیں، اور دیر تک سونے کے مزے لے رہی تھیں۔

سب سے پہلے شہلا اُٹھی تھی اور اس نے

ے اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں
اے سون تیرے درکار نہیں

زور زور سے پڑھ کر، ان دونوں کو جگایا۔

"چھٹی کے دِن، دیر تک سونے کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔" شیما نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"بالکل۔۔۔ بالکل۔۔۔ اور تم اللہ کی کون کون سی نعمتوں کو ٹھکراؤ گے؟"

نگار نے واش روم کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔

پھر تینوں نے ناشتہ بنایا اور اسے لے کر کمرے کے پچھواڑے والے لان میں آ گئیں۔

بارش تھم چکی تھی اور ست رنگ دھنک، آسمان پر اُبھر آئی تھی۔

"زندگی بہت سی خوبصورت چیزوں سے عبارت ہے، جیسے یہ مصوّرِ قوسِ قزح"

شیما نے جذب کے عالم میں کہا۔

"یا اللہ، رحم فرمانا۔۔۔ یہ تم پر بھی مِس مہ جبیں کا اثر ہونے لگا ہے۔ شیما خدا کے لیے، ہاتھ ہلکا رکھو۔ آج لائبریری بند ہے۔ فیروز اللغات بھی نہیں ملے گی۔"

نگار نے بے چارگی سے کہا۔

"جیسے مدھم غروبِ آفتاب" شہلا نے ٹکڑا لگایا۔

"جیسے نازک شگوفے۔"

"جیسے اچار اور پراٹھا۔" یہ نگار کا نقطہ نظر تھا۔

"جیسے بہار کی خوشگوار حدّت۔"

"سبز گھاس میں چھپی ہوئی بیر بہوٹی۔"

"پیار، ہنسی اور خاموش لمحے۔"

"جیسے دوستی، میری اور تمہاری دوستی۔" نگار نے کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔

"یہ جاتے جاتے بھی چھکا لگا گئی ہے۔" شہلا نے کہا۔

"چلو پھر سے سوئیں۔" شیما نے دعوتِ عام دی۔

دوبارہ دیر تک سونے، کمرے کی تفصیلی صفائی کرنے اور نہا دھو کر 'سہ پہر' کا کھانا کھانے بعد ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔

"چلو آئسکریم کھانے چلتے ہیں۔" نگار نے کہا۔

"مجھے تو یہاں پر آئسکریم کی کوئی دُکان نظر نہیں آئی۔" شہلا نے کہا۔

"میں پچھلی بار جب بازار گئی تھی تو دیکھی تھی۔ اُٹھو تو سہی مِل ہی جائے گی کوئی نہ کوئی اور ہاں مجھے 'رنگر جوا' سے بھی ملاقات کرنا ہے، دوپٹے رنگنے کے لیے دے رکھے ہیں۔"

مین بازار کے اگلے سرے پر ایک دُکان تھی۔ خاصی صاف ستھری۔ لکھا تھا:

'خواتین کے لیے پردے کا خاص انتظام ہے۔'

پروپرائیٹر: اعظم علی دکھی

جھلمل کرتے پردے کے دوسری طرف ایک لمبی میز اور چار کرسیاں تھیں۔ نگار نے اتنے فخریہ اور مربیانہ انداز میں، دونوں کی طرف دیکھا جیسے اس دُکان کی 'پروپرائیٹر' وہی ہو۔

جلد ہی ایک بارہ پندرہ سال کا لڑکا ہاتھ میں ٹرے پکڑے ہوئے آیا۔

'کیا لاؤں؟'

''ٹوٹی فروٹی آئسکریم کے تین کپ۔'' نگار نے اجازت طلب نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا۔

''جی ٹوٹی پھوٹی تو نہیں ہے۔''

''تو پھر پھٹی پُرانی لے آؤ۔''

اس کی بھی غیر موجودگی کی بنا پر لڑکے نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''نگار۔۔۔'' شہلا نے تنبیہی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہے کیا پھر؟''

''ہرے رنگ کی ہے یا گلابی رنگ کی۔''

''ٹھیک ہے اپنی مرضی سے لے آؤ۔''

نگار آج تہیہ کر کے آئی تھی کہ آئسکریم کھا کر ہی جائے گی۔

تھوڑی دیر کے بعد سٹین لیس سٹیل کے تین کپ ہری آئسکریم کے آ گئے۔

دراصل یہ 'ہرے رنگ کی 'آئس' تھی۔ 'کریم' کا فقدان تھا۔

''اوئے ہوئے۔ ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا۔ یہ برف کے گولے تو میں نے بچپن میں بہت کھائے ہیں۔'' نگار چہکی اور یوں شوق سے کھانے لگی جیسے برسوں کی پیاس بجھا رہی ہو۔

''دیکھو یار جب میں نے پہلی بار 'کون' آئسکریم کھائی تو اس کا بسکٹ، بیکار سمجھ کر

پھینک دیا تھا۔ اب بار بار کھانے سے مجھے پتا چل گیا ہے کہ اسے بھی ساتھ میں ہی کھاتے ہیں۔ انھیں بھی پتا چل جائے گا آہستہ آہستہ، کہ آئسکریم میں دُودھ کا شامل کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔''

جب یہ لوگ واپس آئیں، تو کمرے کے باہر کسی کا سامان پڑا ہوا تھا۔ تینوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اتنی دیر میں فتح بی بی بھاگی چلی آئی۔

''مس صاحبہ، ایک نئی مس صاحبہ آئی ہیں۔ اسی کمرے میں رہیں گی۔''

''آج اتوار کو؟ کل تو کسی نے جوائن نہیں کیا تھا؟''

اتنی دیر میں نئی لیکچرر بھی پہنچ گئی۔ یہ ثوبیہ تھی اکنامکس کی لیکچرر۔

''میری adhoc اپائنٹمنٹ ہوئی ہے۔ کل میرے بھائی آئے تھے۔ رہائش کے بارے میں معلوم کرنے۔ پرنسپل صاحبہ نے کہا تھا کہ میں آج شفٹ ہو جاؤں، وہ سوموار کو مجھے جوائن کروا لیں گی۔ دراصل بھائی جان کو، مجھے اتوار کو چھوڑنے میں آسانی تھی، اس لیے مسز ظہیر نے یہ favour کر دی۔''

شیما نے کمرہ کھولا تو فتح بی بی نے سامان اندر رکھ دیا۔

تینوں نے بہت پُرجوش انداز میں، ثوبیہ کو خوش آمدید کہا۔ بقول نگار، ثوبیہ کو دیکھتے ہی اسے 'محسوس منٹ' ہو گئی تھی کہ نیا ساتھی، انھی جیسا ہے۔۔۔ یاسمین اور سمیعہ سے بہت مختلف۔۔۔ اس لیے اس نے داستان گوئی شروع کی۔

''تو یوں صاحبو، چہار درویش، ایک بار پھر سے یکجا ہوئے ہیں۔ آپ 'مہ پارہ ثوبیہ' اپنا بستر لگائیے، سامان رکھیے، اتنی دیر میں ہم پُرتکلّف قسم کی چائے تیار کرتی ہیں کہ یہی اس ہاسٹل کی ریت ہے۔''

OO

''صفیہ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم آج کل تھکی تھکی اور خاموش نظر آتی ہو۔ موٹی بھی

ہو رہی ہو اور تمہارا Get up بھی مدھم ہو رہا ہے۔ خیریت تو ہے نا؟'' راشدہ نے اپنا رجسٹر مکمل کرتے کرتے کہا۔

''بالکل خیریت ہے۔ بس یونہی دِل نہیں چاہتا کسی بات کو۔''

''دیکھو کبھی کبھار کی بات الگ ہے لیکن سارا وقت کا یہ اُجاڑ حلیہ درست نہیں۔ خود کو بھی خیر، اس کا مزہ نہیں آتا لیکن شوہر کی نظر میں تو یہ بات بہت کھٹکتی ہے اور اس کا دھیان خواہ مخواہ اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتا ہے۔'' مسز نصیر نے تنبیہا کہا۔

''آپ صحیح کہہ رہی ہیں'' صفیہ کا رنگ اور پھیکا پڑ گیا۔

''کیونکہ ایک دانشور نے کہا ہے کہ دوسرے کے ہاتھ پر رکھا ہوا لڈّو اور ہمسائے کی بیوی اپنے اندر ایک عجیب کشش رکھتے ہیں۔''

صفیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''نگار۔۔۔ر۔۔۔ر'' شہلا نے دانت پیسے۔

''نہیں نگار ایک حد تک درست ہی کہہ رہی ہے۔ ایک عام شوہر یوں تو بنیادی طور پر آستین کا سانپ ہوتا ہی ہے، جب جی چاہے ڈس لے لیکن ایک نسبتاً شریف شوہر بھی بات کرنے سے باز نہیں آتا اور کچھ نہیں تو شیو کرتے کرتے یہی کہہ دے گا۔

''ہماری تو قسمت ہی ایسی ہے۔'' رافعہ نے کہا۔

''خیر ایسا بھی نہیں ہے۔ میرے میاں کو تو میرا بننا سنورنا پسند نہیں، وہ کہتے ہیں۔ بیوی تو سیدھی سادھی ہی اچھی لگتی ہے اگر اِتنی بناؤ سنگھار کرنے والی عورت ہی چاہیے ہو تو پھر اس بازار میں جانا بہتر ہے، شادی رچانے کی بجائے۔'' مسز سرور نے کہا۔

نگار کہنے لگی ''بات بناؤ سنگھار یا سادگی کی نہیں ہے۔ بات وہی ہے جو ایک دانشور نے کہی ہے کہ ناجائز میں بڑی کشش ہے۔۔۔ چاہے کمائی ہو، چاہے رشتہ۔۔۔ بچپن میں ہمسائے کے گھر سے چوری سے توڑا ہوا امرود۔۔۔ جوانی میں سڑک پر جاتی ہوئی لڑکی اور

اُدھیڑ عمر میں خود ہمسائی۔''

''یہ ایک دانشور، انتہائی کمینہ شخص ہے، جو ہر معاملے میں ٹانگ اٹکاتا ہے۔ بھلا اس سے مطلب۔۔۔ لینا ایک نہ دینا دو۔ یہ آخر ہے کون؟ کبھی اس سے ملواؤ تو سہی۔ ہمیں بھی تو واقفیت ہو اس ذاتِ شریف سے اور یہ اپنی باتیں ہم تک پہنچانے کے لیے آخر تمہی کو ذریعہ کیوں بناتا ہے؟ ہر دانائی تمہارے کان میں ہی کیوں پھونکتا ہے؟'' ربیعہ نے غصیلے انداز میں نگار کو ڈانٹا۔

''دیکھو وہ، ہر ایک سے راہ و رسم نہیں رکھتے تم خواہ مخواہ میں اپنا خون جلانے کی کوشش مت کرو۔'' نگار بھلا کب ہار ماننے والی تھی۔

''نہیں نہیں۔ آپ لوگ ایسے نہ کریں۔ بات کو مذاق میں نہ اُڑائیں۔ صفیہ واقعی پریشان ہے۔ صفیہ بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟'' مسز نصیر نے کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں مسز نصیر۔ ویسے ہی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے آج کل'' صفیہ منمنائی۔

''خیر تم نہ بتاؤ۔۔۔ آج مجھے جلدی گھر جانا ہے کل تم سے بات کروں گی۔۔۔'' مسز نصیر نے بیگ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ان کی صفیہ سے دُور پار کی عزیز داری بھی تھی۔

ان کے جانے کے بعد سٹاف روم کے اس کونے میں صرف صفیہ، شیما، شہلا، نگار اور رافعہ رہ گئیں۔

صفیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہنے لگی۔

''میں آج کل واقعی بہت پریشان ہوں۔ میں مسز نصیر کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ وہ ایسی نہیں ہیں، پھر بھی کہیں بات امّی تک نہ پہنچ جائے اس لیے ٹال رہی تھی۔ ہماری آپس کی بات اور ہے۔

نثار آج کل کسی اور لڑکی، بلکہ خاتون کے چکر میں ہیں۔ وہ ان کے ساتھ بینک میں

کام کرتی ہے۔ آج کل میں ہی کسی دوسرے بینک سے یہاں آئی ہے۔ پینتیس، اڑتیس سال کی غیر شادی شدہ۔''

''کیا اسے علم ہے کہ نثار بھائی شادی شدہ ہیں اور دو بچوں کے باپ۔''

''ظاہر ہے۔''

''پھر بھی؟''

''ہاں پھر بھی۔'' صفیہ نے جلے دِل سے کہا۔

''husband Hunter قسم کی چیز ہوگی۔''

''بہت خوبصورت ہے؟ تم اس سے ملی ہو؟''

''ہاں، ایک آدھ دفعہ۔۔۔ نثار کی کولیگ کی شادی اور ایک ڈِنر میں۔ اسے خوب صورت تو نہیں کہہ سکتے البتہ موڈرن اور سٹائلش ہے۔''

''نثار بھائی سنجیدہ ہیں؟''

''ابھی مجھ سے 'مشورہ' نہیں کیا، مجھے تو ان کے دوستوں نے فون کر کے بتایا ہے۔ ویسے نثار کا رویّہ بھی عجیب سا ہو رہا ہے۔ چڑچڑا پن اور بچوں کو بلاوجہ ڈانٹنا۔''

''یہ نثار بھائی کو کیا سوجھی؟''

''کچھ الگ نہیں سوجھی۔ مرد حضرات ہیں ہی 'ترکیب' میں 'خاص'۔ عورت کے نام پر ان کی باچھیں کِھل جاتی ہیں۔''

''تو کیا صفیہ عورت نہیں ہے؟''

''یار، ورائٹی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آٹھ، دس سال ایک ہی عورت کے ساتھ گزارتے گزارتے، دِل 'اُوبھ' بھی تو جاتا ہے۔ اب تم اِتنی ظالم نہ بنو۔''

''عورت کا نہیں اوبھتا؟''

''نہیں ان آٹھ دس سالوں میں عورت کو اور زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے کیونکہ اب وہ

صرف اس کا شوہر ہی نہیں، اس کے بچوں کا ابا بھی ہوتا ہے۔''

''اور یوں بھی اس کا فائدہ کچھ نہیں ہوتا کیونکہ عورت کو بیک وقت چار شادیوں کی اجازت نہیں ہے۔'' نگار نے فلسفہ بھگارا۔

''نگار تم تو اُٹھو نا یہاں سے، تم سب سے الگ بات کرتی ہو۔''

''الگ بات کرنا کوئی برائی ہے کیا؟ مجھے یقین ہے اب تم صفیہ کو ایسے ہی نسخے بتاؤ گی کہ نثار بھائی کا دِل خدمت، خاطر سے جیتنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہارے مجازی خدا اور تمہارے بچوں کے باپ ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لیکن میرے نزدیک اس کا یہ حل نہیں ہے۔'' نگار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''آپ فرمایئے آپ کے نزدیک کیا حل ہے؟'' رافعہ نے جل کر کہا۔

''صفیہ، تم نثار بھائی سے دوٹوک بات کرو اور اگر وہ نہیں مانتے تو تم اپنی پلیٹ میں دو انڈے رکھ لو۔'' نگار نے کہا۔

''دو انڈے؟؟؟''

''ہاں، دو انڈے! وہ یوں کہ ایک میاں بیوی کے درمیان ایسا ہی معاملہ چل رہا تھا۔ شوہر آفس سے فارغ ہو کر اپنی گرل فرینڈ سے ملنے چلا جاتا۔ بیوی نے شوہر سے کہا۔

''تمہاری تمام 'سرگرمیاں' میرے علم میں ہیں لیکن روز روز جھگڑا کر کے میں گھر کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہتی، جس روز تم اپنی گرل فرینڈ سے ملنے گئے اس سے، اگلے روز صبح ناشتے میں تمہاری پلیٹ میں دو انڈے ہوں گے۔ اس طرح تمہیں اندازا ہو جائے گا کہ مجھے سب علم ہے۔''

اب جب دو چار بار ایسا ہوا کہ شوہر کی پلیٹ میں دو انڈے پائے گئے تو شوہر بہت شرمندہ ہوا کہ کتنی بھلی عورت ہے۔ کوئی فضیحتہ نہیں کرتی۔ اس لیے اب میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔

بہت سے دِن گزر گئے۔ شوہر نے سوچا اب اگر میں دوبارہ اپنی دوست سے ملنے لگوں تو بیوی کو پتا نہیں چلے گا۔ کیونکہ اب مطمئن ہو کر اس نے میری نگرانی چھوڑ دی ہوگی۔ اس لیے وہ پھر ایک شام اپنی دوست کے ساتھ کھانا کھانے باہر چلا گیا۔ اور۔۔۔ اگلی صبح۔۔۔ ناشتے پر اس کی بیوی کی پلیٹ میں دو انڈے تھے۔۔۔ کیسا ہے؟

سو اب تم بھی نثار بھائی سے کھل کر بات کرو اور اگر معاملہ قابو میں نہ آئے تو تم بھی اپنی پلیٹ میں۔۔۔''

''نگار، خدا کے لیے اپنے زرّیں خیالات، اپنے تک محدود رکھا کرو۔''

''زرّیں خیالات تو زرّیں کے ہی ہو سکتے ہیں بلکہ اقوالِ زرّیں لیکن میں غلط نہیں کہہ رہی۔'' نگار نے کہا۔

''وہ ٹھیک ہے لیکن حق کا علم اس قدر بلند رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ لگی لپٹی بھی رہنے دیا کرو۔'' شیما نے ڈپٹ کر کہا۔

''بات یہ ہے کہ مرد بھی خدا نے عجیب چیز پیدا کی ہے۔ عورت کو دیکھ کر ان کی ہنسی ہی نہیں رُکتی، گویا عورت نہ ہوئی، زعفران کا کھیت ہوئی، تمھیں یاد ہے جب ہم لوگ ٹرپ پر گئے تھے تو لڑکیوں کی بھری ہوئی بس کو دیکھ کر لڑکوں کے چہرے کیسے کھل اُٹھتے تھے۔'' شہلا نے کہا۔

''خالی مردوں کو الزام نہ دو، تمھیں یہ بھی یاد ہو گا کہ لڑکیاں کیسے بے قابو ہو رہی تھیں۔ کھڑکیوں سے باہر لٹک رہی تھیں۔ انھیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔''

''بالکل۔۔۔ بالکل۔۔۔ اب نثار بھائی اکیلے تو نہیں ہیں نا! اس معاملے میں ایک عورت بھی برابر کی شریک ہے، جو یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ ایک عورت کو بھی اذیت دے رہی ہے اور بچّوں سے ان کا باپ بھی چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔۔۔ خدانخواستہ۔''

''صفیہ تم گھبراؤ نہیں۔۔۔ اس طرح تو تم اس خاتون کے لیے میدان کھلا چھوڑ

دوگی۔ تمھیں اپنی بقا کی جنگ لڑنا ہے۔ تحمل سے، برداشت سے، آہستگی سے۔'' نگار بے حد سنجیدہ تھی۔

''اللہ کرے یہ وقتی اُبال ہو باسی کڑھی میں۔ تم جانتی ہو نا! Men getnaughty at four zero forty''

مسئلہ وہیں کا وہیں تھا لیکن صفیہ ان کی باتوں سے، قدرے سنبھل گئی تھی۔

صلیحہ بھی آ کر گفتگو میں شامل ہو گئی۔

''اور دیکھو کسی کی دوسری شادی کا ذکر ہو تو کیسے یہ لوگ خود ترسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور مارے رشک کے بے حال۔ بات چاہے مذاق میں ہی کرتے ہیں لیکن دوسری شادی، ان کے اعصاب پر سوار رہتی ہے۔

میری خالہ زاد بہن نے مجھ سے کہا کہ میری نند کے لیے کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتانا۔ کل میرے میاں، آفس سے واپس آئے اور چائے پینے کے بعد بستر میں آرام کر رہے تھے تو میں نے ان سے کہا۔

''اگر کوئی پڑھا لکھا، شریف اور برسرِ روزگار لڑکا آپ کی نظر میں ہو تو بتائیے گا۔ نازیہ نے اپنی نند کے رِشتے کے سلسلے میں ذکر کیا تھا۔''

انھوں نے لیٹے لیٹے تکیہ نکال کر اپنے منہ پر رکھ لیا اور کہنے لگے۔

''میں راضی ہوں۔''

OO

آج خواتین کے عالمی دِن کے سلسلے میں کالج میں فنکشن ہو رہا تھا۔ ہال کو اس تقریب کے حوالے سے بینروں سے سجایا جا رہا تھا۔ متعلقہ شاف ممبران ڈیوٹی پر موجود تھیں۔

اِدھر، شاف روم میں تب سے زبردست بحث چھڑی ہوئی تھی، جب سے صلیحہ، منہ لٹکائے شاف روم میں داخل ہوئی تھی اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ اس کی بہن کے ہاں

تیسری بیٹی پیدا ہوئی ہے۔

مسز عالم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے صلیحہ کہ بیٹے کی خواہش اپنی جگہ پر ہے لیکن اس میں خدانخواستہ، رنجیدہ ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ اولاد تو نعمتِ خداداد ہے۔ میری نانی جی کہتی تھیں۔

'اے میوہ تے نہ لکھیں نہ ہزاریں۔'

اب دیکھو، ناجیہ میری اکلوتی اولاد ہے۔ میں نے ہمیشہ خدا کا شکر کیا ہے کہ اس نے مجھے صاحبِ اولاد کیا ہے۔ البتہ دوسرے بچّے کی خواہش اس لیے ضرور کی ہے کہ ناجیہ کا کوئی 'ماں جایا' تو ہو۔۔۔ چاہے بہن یا بھائی لیکن یہ وہی بات ہے کہ پانی کے آدھے بھرے ہوئے گلاس کو دیکھ کر ایک قنوطی روتا رہے گا اور رجائیت پسند، خوش ہوگا کہ ہے تو سہی، چاہے آدھا ہی سہی، نہ ہونے سے تھوڑا سا ہونا، یقیناً بہتر ہے اور میرے پاس تو بے بہا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں مسز عالم، اولاد کا تو کوئی نعم البدل نہیں ہے لیکن یہ بات، میں اور آپ سمجھتی ہیں، معاشرہ نہیں۔ ماریہ کے سسرال والوں نے، خاص طور پر اس کی نندوں نے تو آفت مچائی ہوئی ہے۔''

صلیحہ نے صورتِ حال واضح کرتے ہوئے کہا۔

''صلیحہ، ان سے کہو کہ یہ ان کی والدہ صاحبہ کی غلطی ہے۔ انھوں نے ماریہ کو وہ طریقہ کیوں نہیں بتایا، جس سے ان کے ہاں پانچ بیٹیوں کے بعد ماریہ کے شوہرِ نامدار پیدا ہوئے تھے۔'' نگار نے کہا۔

''ماریہ کی نندیں کہتی ہیں کہ ہمارا ایک ہی بھائی ہے۔ ہمیں تو اس کے سات بیٹے چاہئیں۔''

''تو پھر یوں کرو، نئے مہمان کا نام 'ست بھرائی' رکھ دو۔ اللہ کرم کرے گا۔'' شہلا نے کہا'' یا پھر بشریٰ، شکریہ، رجّی وغیرہ 'تمت بالخیر' بھی رکھا جا سکتا ہے۔''

''ہمارے ہمسائے میں بھی یہی معاملہ ہے، وہاں سات بہنوں کا بھائی پیدا ہوا تو وہ اس کے اِتنے لاڈ پیار کرتی تھیں کہ سارا وقت گود میں اُٹھائے پھرتی تھیں۔ اب تو بڑا ہو گیا ہے لیکن مسلسل گود میں چڑھے رہنے سے اس کی ٹانگیں مستقلاً اتنے فاصلے پر ہوگئی ہیں کہ 'ایفل ٹاور' لگتا ہے۔''

''نگار تم ہر بات کو مذاق میں نہ لیا کرو۔''

''کون کمبخت مذاق کر رہا ہے؟ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی کہ ہمارا معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے۔ حقیقی طور پر بھی اور نظریاتی طور پر بھی۔'' نگار سنجیدہ تھی۔

''بھئی بات یہ ہے کہ ہمیں اچھا بھی تو اسی طرح لگتا ہے۔ باپ، شوہر، بھائی، حتیٰ کہ بیٹے اور داماد کی خدمت گزاری میں مزا آتا ہے اور وجہ وہی ہے کہ مرد یقیناً ہم سے بہتر ہے۔'' آسیہ کہنے لگی۔

''بالکل صحیح۔۔۔ تم کہہ سکتی ہو، کیونکہ تم یہ سب ان کی محبّت میں کروگی۔ لیکن اگر تمہارے حقوق پامال کر دیئے جائیں، گھر کا آرام، بہتر کھانا، اچھا پہننا، اوڑھنا، فیصلے کا حق۔۔۔ سب۔۔۔ تم سے زبردستی چھین کر گھر کے مردوں کے حوالے کر دیا جائے تو ساری محبت ناک کے راستے نکل جائے۔'' ثوبیہ نے کہا۔

''آسیہ، تم اپنی بات نہ کرو۔ تمہاری بہترین پرورش ہوئی ہے۔ تمہارے منہ کا نوالہ چھین کر بھائی کو نہیں دیا گیا۔ تمہاری تعلیم پر بھی اتنے ہی اخراجات اُٹھے ہیں جتنے کہ بھائی کی تعلیم پر۔'' راشدہ نے کہا۔

''اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رشتہ طے کرتے وقت تم پر زبردستی نہیں کی گئی۔ جہیز سمیت پیا گھر سدھاری ہو تو انھوں نے بھی تمہیں 'حسبِ توفیق' اہمیت دی ہے۔ تم کیسے ان باتوں کو سمجھ سکتی ہو؟''

''ہم تو ان کی بات کر رہی ہیں جن کی پیدائش کے وقت ہی نام کے ساتھ 'بے چاری'

کا سابقہ یالاحقہ لگا دیا جاتا ہے۔''

''ہم اسلام کے ظہور سے پہلے، عرب میں عورت کی حیثیت کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بیٹیوں کو پیدائش کے وقت زندہ گاڑ دیا جاتا تھا اور اب سینکڑوں سال بعد، اس ملک میں جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے، میں سالم عورت کو زندہ گاڑ دیا جاتا ہے۔ ونی، کاروکاری، جنسی تشدد، اغوا، کس کس ظلم کا ذکر کریں؟''

''خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ تو معاشرے کے اس حصّے سے تعلق رکھتی ہیں جہاں ماں، بہن، بیٹی کو تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''

''اور بیوی کو؟'' رافعہ نے طنزاً کہا۔

''بیوی کو ایک موقعہ پر تو بہت عزّت دی جاتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ گالی ہمیشہ ماں، بہن اور بیٹی کے حوالے سے دی جاتی ہے۔ اس زمرے میں بیوی کا کہیں ذکر نہیں ہوتا۔''

''چلو، کہیں تو بیوی قابلِ احترام ٹھہری۔'' رافعہ اپنے دِل کے پھپھولے پھوڑنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔

''نہ۔۔۔نہ۔۔۔نہ، کسی زعم میں نہ رہنا۔ اسے کسی احترام وغیرہ کی وجہ سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاتا بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیوی کے ساتھ بدسلوکی کی کوئی پرواہ نہیں ہے انھیں۔''

''لے دسّ۔۔۔سارے رومانس کا بیڑا غرق کر دیا۔'' شہلا کراہی۔

''تمھاری پریشانی کی نذر۔۔۔ کچھ مزید۔ ہمارے معاشرے میں تو بیوی کی پرواہ کرنے والے کو باقاعدہ معتوب کیا جاتا ہے اور 'جورو کے غلام' کا خطاب دیا جاتا ہے۔ بلکہ 'کنجر' کہنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا کیونکہ 'اس بازار' میں کسبیاں تو پیشہ کرتی ہیں اور ان کے بھائی یعنی 'کنجر لوگ' گھر بساتے ہیں اور بیویوں کو سینت سینت کے رکھتے ہیں۔''

''لو، آج یہ بات سمجھ میں آئی ہے۔ میری دیورانی کا بھائی بھی 'بیوی سنبھال' قسم

کا آدمی ہے۔ اس لیے اس کی والدہ، جب اس سے ناراض ہوتی ہیں تو کہتی ہیں:

'اے کنجراں والے کم کِتھوں سِکھ لئے نیں۔''

صلیحہ نے کہا۔

''یہی تو رونا ہے۔ عورت اپنے لیے تو ایسا ہی شوہر چاہتی ہے لیکن کسی اور عورت کے شوہر کو ایسی 'حرکات' کا 'مرتکب' پاتی ہے تو برداشت نہیں کرتی۔''

شیما سر جھکائے منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ سامنے کاغذ پھیلا رکھے تھے۔

''تم کیوں چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے ہو خلافِ معمول؟'' ربیعہ نے کہا۔

''انھیں جب تک سٹیج میٹر نہ آئے، یہ گفتگو کرنا پسند نہیں فرماتیں۔'' ثوبیہ نے وضاحت کی۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ثریا بی بی پیغام لے کر آئی کہ پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ اس لیے سب لوگ ہال میں پہنچ جائیں۔

بچیاں تقریریں، ترانے اور ٹیبلو پیش کر چکیں تو شیما سٹیج پر آئی۔ ہال اس کے استقبال کے لیے تالیوں سے گونج اُٹھا۔ وہ طالبات کی پسندیدہ ٹیچر تھی۔

شیما نے ایک غیر معروف شاعر منظور نیازی کی نظم پڑھنا شروع کی۔ ہال میں واقعتاً اتنی خاموشی تھی کہ سوئی گرنے تک کی آواز سنائی دے سکتی تھی۔

'میں حوّا ہوں
آدم کی تنہائیوں میں
پریشانیوں، تنگ سامانیوں میں
ہر اِک پیداواری عمل میں ہمیشہ
شریکِ سفر تھی، شریکِ سفر ہوں
میں بوئے محبت ہوں، رنگِ وفا ہوں
گلوں میں مرا رنگ ہے، میری بُو ہے

رگِ زندگی میں مرا ہی لہو ہے
سکھایا ہے بادِ بہاری کو چلنا
ہر اِک شاخ میں میرے دم سے لچک ہے
زمانے میں ہر سو مری ہی مہک ہے
ابھی تک مجھے یاد ہے دورِ وحشت
سکھایا ہے میں نے ہی فنِ زراعت
درندوں کو تہذیب میں نے سکھائی
سکھائی ہے دریا کو میں نے روانی
سمندر کو ہے رشک میرے سکوں پر
میں جانِ جہاں بھی ہوں، تسکینِ جاں بھی
میرے دم سے رعنائی دو جہاں بھی
پرندوں نے سیکھی ہے پرواز مجھ سے
ہر اِک گیت مجھ سے، ہر اِک ساز مجھ سے
میں سُر بھی ہوں، نغمہ بھی ہوں، ساز بھی ہوں
میں تخلیق کی واقفِ راز بھی ہوں
مرے دم سے ہے روشنی زندگی میں
مجھی کو ڈبویا گیا تیرگی میں
میں رازق ہوں ہر ایک معصوم جاں کی
میں خالق ہوں تہذیب وفنِ جہاں کی
ہڑپہ، موئن دڑو، ٹیکسلا ہوں
کہ میں رونقِ بابل ونینوا ہوں

مگر تم نے سب کچھ کھنڈر کر دیا ہے
ہر اک سمت نفرت بکھیری ہے تم نے
محبت کو زیر وزبر کر دیا ہے
صفا اور مروہ کے اوراق پر بھی
قلم، پاؤں کے آبلوں میں ڈبو کر
رقم، داستانِ وفا کر چکی ہوں
میں وہ ہاجرہ ہوں

وہ مریم ہوں، جس پر
پڑے اَن گنت، سنگ ہائے ملامت
مگر میری ممتا کا آئینہ خانہ
سلامت رہا ہے
یسوع کو لیے قریہ قریہ پھری ہوں
جسے میری آغوش نے، تربیّت نے
مسیحا بنایا
خدیجہ ہوں میں ۔۔۔اور
محمد ﷺ کا ہر اک کٹھن وقت میں
ساتھ دیتی رہی ہوں
کبھی مجھ کو مالِ غنیمت بنا کر
حوالے کیا سورماؤں کے اپنے
کنیزانہ سانچے میں ڈھالی گئی ہوں

بدن کو میرے کر لیا قید لیکن
میری رُوح میں نفرتیں موجزن تھیں

مرے دِل میں آزاد ہونے کی فطری تڑپ تھی
نیا ایک قانون تشکیل دے کر
یہ مژدہ سنایا
گزر جاؤں گر زچگی کے عمل سے
غلامی سے مجھ کو رہائی ملے گی
نہ مقصود تھا مجھ کو آزاد کرنا
میری خودسری کو
میری سرکشی کو
بدل کر
خودآمادگی پیدا کرنا غرض تھی
کبھی مندروں میں مجھے دیوداسی بنا کر
پروہت بھی میرا بدن نوچتے تھے
ذرا پوچھئے آبِ گنگ و جمن سے
کہ اشنان گہرائیوں میں تمہاری
کیا کتنی سیتاؤں کی آتما نے
کلیساؤں میں بھی
بنی راہبوں کی ہوس کا نشانہ

جہاں دفن ہیں
کتنے
بن باپ معصوم بچوں کے لاشے
نہ بپتسمہ ان کو دیا ہے کسی نے
نہ مانگی دُعا مغفرت کے لیے ہی

لگا کر کبھی مہر میرے بدن پر
بنایا مجھے اُونٹنی اپنی جس پر
فقط جبّہ پوشوں کا حقِ ہوس تھا

سجائے گئے مجھ سے بازار اکثر
بکے ہیں میرے زلف و رُخسار اکثر
میں کرموں کی ماری رہی شب گزیدہ
اندھیروں میں آئے خریدار اکثر
میں وہ ماں ہوں جس نے
سبھی فلسفہ دان پیدا کیے ہیں
کسی نے کہا
میرے دانتوں کی تعداد مردوں سے کم ہے
کسی نے کہا عقل چوٹی کے پیچھے
کسی نے مجھے صرف جوتا سمجھ کر
بدل لینے کا مشورہ بھی دیا ہے

غرض جو بھی آیا
نئی اک فصیل اس نے تعمیر کی ہے
میرے جسم کے گرد
زنجیر کا اِک نیا بل دیا ہے
ستم کے اندھیرے کو پھیلا دیا ہے
مقدر مرا اور گہنا دیا ہے

مرا خون پی کر
ولادت کا اعجاز دِکھلانے والے
میرا دودھ پی کر جواں ہونے والے
میری لوریوں کی حلاوت کے بدلے
مجھے میرے بیٹے
جکڑنے کا کرتے رہے ہر جتن کیوں؟
'میں بیٹی بھی ہوں اور بہن بھی ہوں ماں بھی'
مگر مجھ پہ مزدور کا بھی تشدد
کسانوں کا بھی جبر میں سہہ رہی ہوں
وڈیروں کے زنداں بھی میرے لیے ہیں
جنھیں نام گھر کا دیا ہے وہ زنداں
کہ جن کی فصیلوں سے باہر نکلنا
میرے واسطے جیتے جی غیر ممکن
مجھے امن، آزادی، جمہوریت کے

حسین خواب بھی دیکھنے کی اجازت نہیں ہے
اگر چاہتے ہو
نئی نسل آزاد، خوددار ہو
سر اُٹھا کے چلے
تو
میرے ذہن کو
میرے اَفکار کو
پست ہمت خیالات سے، جبر سے
ہر طرح کی غلامی کی زنجیر سے
کرنا ہوگا رِہا
میری تخلیق میں
عکس ہوگا مرے ہی خیالات کا

مجھے ناتواں کس لیے جانتے ہو
مگر تم حقیقت کو پہچانتے ہو
کہ میرے قوائے عقلیہ کبھی بھی
کسی مرد سے کم نہیں تھے

اور اب میں نے ہے اِک نیا راز پایا
پلٹ دی ہے جس نے مری آج کایا
نیا رُوپ دُنیا کو دِکھلا رہی ہوں
نیا نور ہر سمت پھیلا رہی ہوں

کہ جس سے اندھیرے سمٹنے لگے ہیں
وڈیرے، لُٹیرے لرزنے لگے ہیں

میں اپنا مقدر بنانے کی خاطر
حصارِ ستم کو گرانے کی خاطر
جو چھینا گیا حق وہ پانے کی خاطر
اُٹھوں گی تو اَب کون روکے گا مجھ کو
زمانے کی آواز میری صدا ہے
کہ ہر جبر کا دائرہ توڑ ڈالو
اور آزاد ہونے کا وقت آ گیا ہے
اُٹھی ہے نئی لہر دُنیا میں ہر سُو
بنی ہوں میں اس لہر کا ایک حصّہ
جو ایوان کہنہ روایات کے ہیں
انھیں آج زیروزبر کر رہی ہوں
نئی منزلوں کا سفر کر رہی ہوں

اتنی عمدہ نظم اور شیما کا اندازِ بیاں۔ سب لوگ عش عش کر اُٹھے۔

OO

''کل مزا آ گیا فنکشن کا۔ بچّیوں نے بہت اچھے انداز میں عورت کی حالتِ زار کی عکاسی کی۔ میں سمجھتی ہوں جب یہ نسل اپنے مسائل کو سمجھے گی تو یقیناً اگلی نسل کے لیے آسانیاں پیدا ہوں گی۔'' ربیعہ نے کہا۔

''بالکل، معاشرے میں تبدیلی لانے کا سب سے پہلا مرحلہ 'آگہی' ہے۔ مسئلہ،

اس وقت تک مسئلے کی حیثیت اختیار نہیں کرتا جب تک اس کا احساس لوگوں کے دِلوں میں پیدا نہ ہو لیکن یہ تو پہلا قدم ہے، جو بھی عورت کے حقوق کی بات کرتا ہے، باغی کہلاتا ہے اور مولوی حضرات تو باقاعدہ طور پر اسے عذابِ الٰہی کی 'بشارتیں' دینے لگتے ہیں۔ یہ مرکّب قسم کی جاہلیت ہے۔ صدیوں کا معاملہ ہے، اسے سالوں میں حل نہیں کیا جا سکتا۔'' نگار نے اپنے مضمون کے حوالے سے بات کی۔

''اگر ہم لوگ کوئی ایسی بات کریں تو لوگ کہتے ہیں پڑھ لکھ کر اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خدا کا خوف ہی نہیں رہا۔'' صلیحہ نے کہا۔

''بالکل۔۔۔ بالکل۔۔۔ اب دیکھو، یہ جو میں ہوں۔۔۔ جس پر ماں باپ نے اِتنا روپیہ خرچ کیا۔ جس نے اِتنی محنت کی۔۔۔ پڑھا۔۔۔ 'سولہ جماعتیں' پاس کیں۔ اب خیر سے اسسٹنٹ پروفیسر ہوں، اٹھارویں گریڈ کی افسر۔۔۔ ہزاروں کماتی ہوں لیکن مجھ پر کچھ اچھا برا بیت جائے تو اس کی شنوائی نہیں ہوگی کہ آدھی گواہی کے قابل ہوں اور وہ جو چار جماعت پاس ہے، پہلے گریڈ کا 'افسر'۔۔۔ جو گیٹ پر کھڑا، بچّیوں کو لینے کے لیے آنے والے اصحاب کے ساتھ اول فول بک رہا ہے، پوری گواہی کا حق دار ہے کہ مرد ہے۔''

صفیہ نے کہا۔

حاضرینِ سٹاف روم نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ ایسی باتیں کرنے اور ایسے معاملات کو یہاں زیرِ بحث لانے کا رواج تھا اور نہ ہی حوصلہ۔ اکثر لوگ، سب اچھا، ماشا اللہ اور سبحان اللہ کے خوگر۔ اگرچہ در پردہ سبھی اس حقیقت سے واقف اور نالاں۔

''ہمارے پسماندہ علاقوں میں تو عورت پر ہر قسم کا ظلم اور ناانصافی روا رکھی جاتی ہے۔ اندازہ کرو اس بچّی کی حالت کا جس کی پیدائش پر مبارکباد کی بجائے پرسہ دیا جاتا ہے۔ بھائیوں کا بچا کھچا کھاتی ہے، بہت چھوٹا بھائی بھی رُعب جماتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح

ہنکائی جاتی ہے اور پھر نئے گھر سدھارتی ہے، جہاں شوہر کو 'مالک' کہا جاتا ہے۔ سارا دِن گدھوں کی طرح کام کرنے کے بعد، رات کو سڑیل شوہر کی ٹانگیں دباتی ہے اور اُونگھ آ جائے تو شوہر 'وہی' ٹانگیں مار کر اسے چارپائی سے گرا دیتا ہے اور مغلّظات بکتا ہے۔" شہلا نے کہا۔

"'وہی' ٹانگیں؟" ثوبیہ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"ہاں۔۔۔وہی ٹانگیں۔۔۔کیونکہ ابھی 'کرائے' پر ملنا شروع نہیں ہوئیں۔ 'اسی' ملکی پسماندگی کا تو ذِکر کر رہے ہیں، ہم لوگ۔" نگار نے شہلا کی جگہ جواب دیا۔

"یہ مردوں کی دُنیا ہے۔۔۔اس کائنات کی طاقت ور ترین ہستی یعنی خدا بھی مذکّر ہے۔ خدا رحم کرنے 'والا' ہے 'والی' نہیں۔"

"لیکن مردوں کی اجارہ داری اتفاقیہ نہیں۔ یہ سارا وقت اسے قائم رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ پچھلے دِنوں ہمارے گھر میں تھوڑا، مرمّت کا کام ہو رہا تھا۔ کام کرنے والے دو مزدوروں کی آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی لیکن پھر بھی دونوں ایک دوسرے کو 'صاحب' کہہ کر بلاتے تھے۔ مثلاً

"ارشاد صاحب، اپنی ذلالت چنگی نہیں ہندی۔" جواب ملتا۔

"رفیق صاحب، ذلیلاں نال انج ای کری دا اے۔"

ہم لوگوں نے کبھی ایک دوسرے کو صاحبہ کہا ہے؟ وہ اپنی 'عزّت' خود کرتے ہیں تو دوسروں کو بھی 'مجبوراً' کرنا پڑتی ہے۔"

"معاشرتی پسماندگی کی وجہ سے صرف عورت پر ہونے والے مظالم ہی نہیں اور بھی بہت سے 'مقاماتِ آہ و فغاں' ایسے ہیں جو کسی بھی حسّاس شخص کی نیندیں اُڑا دینے کے لیے کافی ہیں۔

میں بہت پریشان ہوتی ہوں، گیارہ بجے کے قریب اس مزدور کو دیکھ کر جسے آج بھی 'دیہاڑی' نہیں مل سکی۔ بوڑھی عورت کو بھیک مانگتے اور چھابڑی لگائے، گدلی آنکھوں

والے بوڑھے کو دیکھ کر، ورکشاپ میں 'استاد' کی مار کھانے والے سات آٹھ سال کے 'چھوٹے' کو دیکھ کر، قلفی بیچنے والے نوجوان کو بس کے پیچھے دوڑ لگاتے ہوئے اور جوان ماں کو جون کی تپتی دوپہر میں سڑک پر روڑی کوٹتے ہوئے دیکھ کر، جس نے درخت کی چھاؤں میں جھلستی زمین پر کپڑے کے ٹکڑے پر اپنے دس روزہ بچے کو لٹا رکھا ہے۔ جان لٹانے والی بہن کی کم مائیگی کو دیکھ کر، جس کے حصّے کا عمدہ کھانا اس کا نکھٹّو بھائی ہضم کر چکا ہے۔ اس دس بارہ سال کی بچّی کو دیکھ کر، جس کی گود میں مالکن کا بچّہ بیٹھا آئس کریم کھا رہا ہے۔" شیما نے تاسّف سے کہا۔

"میں بھی بہت پریشان ہوتی ہوں، شوہر کو بیوی کی ڈانٹ کھاتے دیکھ کر، 'بے چاری' کہے جانے پر آرٹی فشل انگوٹھیاں پہنے، سرکاری پرائمری سکول ٹیچر کی مسمسی شکل دیکھ کر، اس بچے کی مایوسی دیکھ کر، جس کا چاکلیٹ اس کی ماں نے کھا لیا ہے۔ اس لکچرر کو دیکھ کر جو ابھی ابھی پرنسپل سے ڈانٹ کھا کر آئی ہے۔ اس لفنگے کو دیکھ کر، جس کی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر بجائے جانے والی سیٹی، لڑکی کے باپ کو ساتھ دیکھ کر منہ میں ہی رہ جاتی ہے۔"

نگار کی بات بھی راشدہ کی ڈانٹ سن کر منہ میں ہی رہ گئی۔

OO

شہلا جیسے ہی کلاس لے کر سٹاف روم میں داخل ہوئی، بجلی بند ہو گئی۔

"ہک ہا۔۔۔بتّی پھر چلی گئی۔"

"یہ بتی چلی گئی کیا ہوتا ہے؟ یوں کیوں نہیں کہتیں کہ بجلی بند ہو گئی ہے۔" فاخرہ نے کہا۔

"پنجابی میں اسے ایسے ہی کہتے ہیں، البتہ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اسلامیات میں اسے کیسے کہتے ہیں۔" فاخرہ، اسلامیات کی لکچرر تھی۔

"اور یہ تمہاری ہک ہا۔۔۔آخر یہ کیا لفظ ہے؟"

"فاخرہ بی بی، یہ وہی ہے جسے تم بہت نزاکت سے کہتی ہو 'آئے ہائے'۔ پنجابی میں اسے یوں ہی کہا جاتا ہے۔"

"مانا کہ تمہارا مضمون پنجابی ہے لیکن اسے عام زندگی میں استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیوں؟ کیوں ضرورت نہیں ہے؟ پنجابی ہماری ماں بولی ہے اور شاید تم اس حقیقت سے واقف نہیں کہ کسی انسان سے اس کی مادری زبان چھین لینا اس پر ظلم کرنے کے مترادف ہے میرے لیے تو جو مزہ اس میں ہے، وہ کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ ہم انگلش اس لیے نہیں بولتے کہ کافروں کی زبان ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا سیکھنا کتنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے اور علوم کا وافر ذخیرہ اس میں موجود ہے۔"

"ویسے آسیہ اور فاخرہ سے تو تمہیں گلہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ جا و بے جا، اس کا وافر استعمال کرتی رہتی ہے۔" راشدہ نے کہا۔

"میں اکثریت کی بات کر رہی ہوں۔ اُردو کا ہمارا شین قاف درست نہیں۔ پنجابی بولتے ہوئے تمہیں شرم آتی ہے۔ بلاوجہ ہتک محسوس کرتی ہیں۔ اب باقی تو اشاروں کی زبان ہی رہ جاتی ہے، اسی سے گزارا کیا کرو۔" شہلا نے کہا۔

"اور پھر ہمارے لوک گیت اور صوفیانہ کلام۔" شیما نے کہا۔

"اور ہاں وہ تمہارا Drum Soldier ۔۔۔ کیا حال ہے، اس کا؟ ۔۔۔ کب آ رہا ہے وہ abroad سے واپس؟" نگار نے اِرم سے پوچھا۔

"کون؟"

"بھئی وہ تمہارا منگیتر ۔۔۔ تمہارا ڈھول سپاہی ۔۔۔ فاخرہ اب تم تو خوش ہو، نا میری انگریزی زبان دانی سے۔"

فاخرہ اسلامیات پڑھاتی تھی اور غلط انگریزی بولنے میں یقین رکھتی تھی۔ اس کا

ساتھ، آسیہ بہت خشوع وخضوع سے دیتی تھی ایک روز اس کا تین سالہ بیٹا بھی ساتھ آیا تھا کیونکہ کالج کے بعد وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے والی تھی۔ اس نے سیب چھیل کر بچے کے سامنے رکھا اور بہت دُلار سے کہنے لگی۔

"بیٹا یہ apple لو اور finish کر دو۔"

صائمہ سعید نے اس کی طرف دیکھ کر بازو چڑھا لیے اور نتھنے پھلا کر کہا۔

"نگار اسے منع کر لو میرے سامنے 'اس قدر' انگلش نہ بولے۔"

کچھ روز پہلے آسیہ کالج دیر سے آئی تو صائمہ نے اس سے پوچھا۔

"خیریت؟ آج دیر سے کیوں آئی ہو؟"

"ہاں سب خیریت ہے۔ رات میں کھانا نہیں بنا سکی تھی اب بھاگم دوڑ میں پکا کر آئی ہوں۔"

"کیا پکایا ہے؟" صائمہ نے پوچھا۔

"potatoes ۔۔۔ جلدی جلدی میں تو یہی پکا سکتی تھی۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

تب سے صائمہ تڑپتی پھرتی تھی۔

"یار یہ مجھے اتنا جاہل سمجھتی ہے کہ آلو کی اِنگلش بھی یہی سکھائے گی۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ثریا بی بی کاغذات کا پلندہ اُٹھائے سٹاف روم میں داخل ہوئی۔ سبھی کا ماتھا ٹھنکا اور انھوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

یہ ڈائریکٹوریٹ کی طرف سے تیسرا سوال نامہ تھا جو پچھلے دو ماہ میں آ چکا تھا۔

"اب کیا نیا ہوا ہے جو پھر سے یہ محبت نامہ بھجوا دیا گیا ہے؟" صلیحہ نے پوچھا۔

"اب تو ایک دو باتیں ہی ایسی بچی ہیں جن کے بارے میں معلومات نہیں لی گئیں۔ اب بھی اگر ان کے بارے میں سوال نہیں پوچھا گیا ہے تو خود ہی بتا دو تا کہ ان کی

تسلی ہو جائے۔'' نگار نے مشورہ دیا۔

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ محبت کی شادی میں یقین رکھتی ہیں یا طے شدہ شادی میں؟

شادی کے بعد، ساس سے کیا سلوک کریں گی؟ صحیح جواب پر ✓ کا نشان لگائیں۔

بہت اچھا / اچھا / درمیانہ / برا / بہت برا

اپنے انڈر گارمنٹس کا سائز لکھیں۔

اپنے کسی پھٹے پرانے عشق کے بارے میں بتائیں۔

لیکن اس سے پہلے ہاتھ اُٹھا کر حلف لیں کہ جو کہیں گی، سچ کہیں گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہیں گی۔''

''نگار بالکل بے قابو نہ ہو جایا کرو۔'' راشدہ نے جل کر کہا۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے؟ تم خود بتاؤ کہ یہ ساری معلومات ہم انھیں دے چکے ہیں نا! اور وہ بھی کئی بار نام، ولدیت، اگر شوہر پالا ہوا ہے تو اس کا نام، تعلیمی قابلیت، عمر اور امتحان میں ڈویژن، جو ساری عمر دوسروں سے چھپائی جاتی ہے، تک پوچھ لیتے ہیں۔ اپنی جائیداد۔۔۔ اگر خدانخواستہ ہے تو، میاں کے اثاثے، جو اس نے بیوی سے چھپا رکھے ہیں۔ سروس، کہاں کہاں کی اور اپنے نکمے پن سے داستان چھوڑ آئیں۔ زبان کے بارے میں سوال کے جواب میں سبھی جھوٹ بولتی ہیں کہ انگلش روانی سے بول سکتی ہیں۔ ویسے فاخرہ اور آسیہ اس سے مستثنیٰ ہیں کہ سچی ہیں۔''

دونوں نے قہر آلود نظروں سے نگار کو دیکھا اور ہوا میں مُکّا لہرایا۔

''مشغلے کے خانے میں کھانا پکانا یا سلائی کڑھائی لکھا جاتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ضرورت رشتہ کا اشتہار نہیں ہے جس میں امورِ خانہ داری میں طاق دوشیزہ کو ترجیح دی جائے گی۔

کسی کو کتابوں، شاعری یا معلوماتِ عامہ سے کوئی شغف نہیں۔ اب اور کیا جاننا چاہتے ہیں یہ؟''

○○

کینٹین والی باجی، اجازت طلب کر کے ایک خاتون کے ہمراہ سٹاف روم میں داخل ہوئی اور صفورہ کے پاس بیٹھ گئی۔

''مس صاحبہ، آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں بات کرنی ہے۔ آپ اسلامیات پڑھاتی ہیں، اس لیے، آپ بتا سکیں گی۔''

''جی باجی، کہیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

کینٹین والی باجی، جگت باجی تھی۔ کیا پرنسپل صاحبہ اور کیا سٹاف۔۔۔ طالبات کی تو باجی تھی ہی۔ سٹاف کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہنا اور بچیوں کے لیے شفقت بھرا رویہ اس کی مقبولیت کا راز تھا۔

''یہ حلیمہ ہے میری ماموں زاد بہن۔۔۔ یہی بتائے گی۔'' باجی نے کہا۔

''مس صاحبہ، میرا بھائی مجھ سے بڑا ہے، محمد شریف نام ہے اس کا۔ بائیس[۲۲] سال پہلے اس نے اپنی بیوی کو شادی کے دو سال بعد ہی طلاق دے دی تھی۔ میاں بیوی میں جھگڑا رہتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ جوان ہے تیئس[۲۳] سال کا۔ اپنی ماں کے پاس ہی ہوتا ہے۔ اب شریف بھائی کا ارادہ ہے کہ دوبارہ اپنی بیوی سے شادی کر لے۔''

''اب؟ بائیس[۲۲] سال کے بعد؟ آپ کے بھائی کو یہ خیال کیسے آیا؟'' صفورہ اپنی چیخ پر قابو نہ رکھ سکی۔

''وہ جی بیمار شمار رہتا ہے۔ کتنی دیر بھابیاں اس کو روٹی پکا کر دیں گی۔ اب تو ویسے بھی خدمت کرانے کے دن آ رہے ہیں۔ کاروبار بھی بھائی کا 'مٹھا' ہی ہے۔ اس کے سسرال والوں نے کافی جائیداد بھرجائی کے نام لگا دی ہے۔ کیونکہ ان کے در پر جو بیٹھی رہی ہے اتنے

سال۔اس کا بھی بھائی کو آسرا ہو جائے گا۔'' حلیمہ نے صورتِ حال واضح کی۔

''اچھا تو آپ کا بھائی کاروبار کر رہا ہے۔''

صفورہ نے طنزاً کہا۔

''بس جی، یہی سمجھ لیں۔اللہ کرے یہ کام ہو جائے تو ہمیں بھی اس کی طرف سے بے فکری ہو جائے۔''

حلیمہ، شاید صفورہ کے طنز کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

''لیکن حلیمہ بہن۔۔۔اچھا خیر۔۔۔اسلام میں اس طرح دوبارہ شادی کرنے کو حلالہ کہتے ہیں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ بیوی پہلے کسی اور شخص سے نکاح کرے۔۔۔ اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات رکھے اور پھر اس سے طلاق لے کر دوبارہ پہلے خاوند سے نکاح کرے۔۔۔یہ سب کیسے ہوگا؟'' صفورہ نے بتایا۔

''اس کا بندوبست ہے جی۔ ہمارے شہر میں ایک مولوی صاحب ہیں۔وہ یہی 'کام' کرتے ہیں۔ان کا نام ہی لوگوں نے مولوی حلالہ رکھ دیا ہے۔ایسے جتنے بھی 'کیس' ہوں وہ ان پر 'کام' کرتے ہیں۔بہت رش ہوتا ہے، ان کے پاس۔۔۔کبھی کبھی تو ایک وقت میں دو تین عورتیں ان کے نکاح میں ہوتی ہیں۔مرد کے غصے کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔'برداشت' تو کر نہیں سکتا، بس تین بار طلاق کہہ کر عورت کو فارغ کر دیتا ہے۔پھر پچھتاتا ہے تو مولوی صاحب کے پاس جانا پڑتا ہے۔فیس بھی وہ اچھی خاصی لیتے ہیں۔لیکن بچوں کے لیے تو یہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ویسے 'گرنٹی' بھی تو ہوتی ہے کہ طلاق ضرور دے دیں گے۔''

''مرد تو فیس دے کر چھوٹ جاتا ہے اور عورت کو نہ چاہتے ہوئے بھی غیر مرد سے تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔توبہ۔۔۔توبہ۔۔۔''

ربیعہ پاس بیٹھی سن رہی تھی، کہے بغیر رہ نہ سکی۔

''غیر کہاں جی؟ نکاح تو ہوا ہوتا ہے مولوی صاحب سے۔یہ کوئی حرام کاری تو

نہیں ہے نا! مولوی صاحب، بے چاروں کی تو بس ایک ہی شرط ہوتی ہے کہ نکاح کے وقت عورت ویسے ہی نہ اُٹھ کر آ جائے۔جوڑا اچھا ہو اور دُلہن کی طرح تیار ہو۔شریف بھائی کہتا ہے کہ نکاح کا جوڑا بھی ہم بنائیں گے اور فیس بھی دیں گے بس بھابھی رضامند ہو جائے۔''

حلیمہ نے خوش دلی سے کہا۔

''اور بیوٹی پارلر کا خرچ؟'' نگار بدبدائی۔

شیما نے اسے بری طرح گھورا۔

''چلیں، بندوبست تو بہت اچھا ہے۔'' صفورہ نے کہا ''لیکن بات یہ ہے کہ آپ کی بھابھی، اس کے لیے تیار بھی ہو جائے گی یا نہیں۔''

''یہ تو جی اب بات کرنے پر ہی پتا چلے گا۔ہماری طرف سے تو پوری 'رضامندی' ہے۔اس کو بھی مان جانا چاہیے۔آخر خاوند کا گھر ہی، اپنا گھر ہوتا ہے۔اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔پر وہ ہے بڑی کم عقل۔اللہ کرے یہ بات اس کی سمجھ میں آ جائے۔ہم چار بندے لے کر جائیں گے اور معاملہ 'سیٹ' کریں گے۔آپ دُعا کرنا۔میں تو یہ پوچھنے کے لیے آئی تھی کہ ایسے وقت میں دینِ اسلام کا کیا حکم ہے؟ عورت اگر نہ مانے تو اس کے لیے کیا عذاب ہے؟''

''اس کے لیے تو عذاب ہی عذاب ہے۔آپ لوگوں کا کہنا نہ مان کر، آپ کے حساب میں اللہ کی طرف سے عذاب اور کہنا مان کر جان کا عذاب۔''

نگار کے لیے چپ رہنا مشکل ہو رہا تھا۔

حلیمہ کی آنکھیں چمکیں۔شاید اس نے پوری بات نہیں سنی تھی۔عذاب کا لفظ ہی اس نے کافی سمجھا تھا اور اب خوش تھی کہ بھابھی کو سمجھانے کے لیے اس کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

''بس جی یہی معلومات لینے کے لیے تو میں آپ کے پاس آئی تھی۔بہت بہت مہربانی۔اب نکاح ہونے کے بعد آ کر آپ کو بتاؤں گی۔اللہ آپ کا بھلا کرے۔''

"بالکل۔۔۔ بالکل ہم مٹھائی کا انتظار کریں گے۔" نگار نے بے قراری سے کہا۔

حلیمہ کے جانے کے بعد سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک بے ساختہ قہقہہ، سٹاف روم میں گونجا۔

"یہ تو اندازہ ہو گیا ہے کہ جس خاتون کے اپنے گزشتہ شوہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کی بات، بائیس(۲۲) سال بعد دوبارہ شروع ہوئی ہے، اس نے شادی کے دو سال بعد ہی طلاق لینا کیوں گوارا کیا ہوگا۔" صلیحہ نے کہا۔

"لیکن یہ کتنی زیادتی کی بات ہے کہ عورت ہی عورت کو عذابوں کی 'بشارت' دیتی رہتی ہے۔"

"ویسے ایک بات ماننے کی ہے، حلیمہ کا بھائی ہے بڑا جی دار۔۔۔ کہتا ہے، نکاح کا جوڑا وہ خود بنائے گا۔ ورنہ میں تو سوچ رہی تھی کہ شاید اس خاتون کو اپنی پھانسی کے لیے رسّی بھی خود ہی لانا پڑے گی۔"

نگار کا اندازِ فکر سب سے الگ تھا۔

"عورت پر ظلم کے بہت رنگ ہیں

ع کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں

نجم حسین سیّد کہتے ہیں:

"سیونی اسیں ذات دیاں پچھوکمّیاں (میری سکھیو، ہم ذات کی پچھویاں ہیں)
لیہے لگیاں جدو کنیاں جمیاں (جب سے پیدا ہوئی ہیں، راہوں کی خاک چھان رہی ہیں)
پولے پیریں (دبے پاؤں)
دھرت سمندر گاہندیاں (زمین اور سمندر میں چلتی ہیں۔)
نونہاں دنداں والیاں کولوں ڈھڈ لکاؤندیاں (ناخنوں اور دانتوں والوں سے پیٹ چھپاتے)
سانوں وریاں ہزاراں ہو گئے۔" (ہمیں ہزاروں سال ہو گئے۔)

شہلا نے اپنے عمدہ شعری ذوق کا مظاہرہ کیا۔

"عورت بے چاری تو تمام عمر مردوں کے اِستحصال کا سامنا کرتی ہے اور انھی کے تعمیر کردہ شرافت کے پُل صراط پر چلتی رہتی ہے۔ باپ کی 'پگڑی' اور بھائی کی 'غیرت' کی خاطر سانس بھی اپنی مرضی سے نہیں لے پاتی۔"

"اور باقی زندگی شوہر کی مرضی کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس کے اِشاروں پر چلتے چلتے اس کے پاؤں آبلوں سے اَٹ جاتے ہیں اور اس کی سوچ دم گھٹ کر مر جاتی ہے، اس کے جذبے لہولہان ہو جاتے ہیں۔" رافعہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

نگار نے زوردار تالی بجائی اور جوس کا گلاس اس کے سامنے رکھا۔

"پیو میری جان۔۔۔ تمہارے اندر جو 'آتشِ نمرود' بھڑک رہی ہے اسے ٹھنڈا کرو۔"

رافعہ، فٹافٹ پورا گلاس چڑھا گئی۔

"شاباش، میرا بیٹا راجہ بن گیا۔ سب سے پہلے گلاس ختم کر لیا۔" نگار نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اور عورت کو 'نصف انسان' مان کر جو قانون بنائے جاتے ہیں۔ ان سے رہی سہی کسر پوری ہو جاتی ہے۔" نورین نے کہا۔

"مزید باقی رہی سہی کسر، پیر اور مولوی حضرات پوری کر دیتے ہیں۔ اب انھی عزّت مآب مولوی حلالہ کو لے لو۔ ان کا حلوہ مانڈا ابھی چل رہا ہے۔ عیش بھی کر رہے ہیں اور لوگوں کی جان پر احسان بھی۔" ربیعہ کہنے لگی۔

ــہ یہ پیرانِ حرم کہ زینتِ محراب و منبر ہیں
بنامِ دِین و دانشِ الٰہی تقسیم کرتے ہیں

شیما نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا اچھا بس کرو پلیز۔ میں چائے میں دو چمچے چینی ڈال چکی ہوں لیکن وہ اور

کڑوی ہوتی جارہی ہے۔ اپنی تقریر کو کچھ دیر کے لیے اُٹھا رکھو۔''
فوزیہ نے چڑچڑے پن سے کہا۔
''تمہاری چائے کڑوی ہو یا میٹھی۔۔۔ مجھے کہنے دو۔''
نورین نے بھی اسی انداز میں چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
''نورین کو کہنے دو فوزیہ۔۔۔ یہ بے چاری تقریر تیار کر چکی ہے اور اس کا جوشِ خطابت اگر ٹھنڈا پڑ گیا تو اسے خدانخواستہ 'دردِ قولنج' ہو سکتا ہے۔ تم کہو نورین۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔'' نگار نے کہا۔
''میرا موڈ نہیں رہا۔ شیما تم کچھ کہو۔'' نورین بولی۔
''نورین، تم نگار کی بدتمیزیوں کو نظرانداز کر دیا کرو۔ یہ بچّی ہے۔ آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔'' شیما نے نگار کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''اور لیجیے اب فہمیدہ ریاض کا کلام سنیے۔ موضوع یہی ہے لیکن۔۔۔ منظوم

'سنگدل رواجوں کی
یہ عمارتِ کہنہ
اپنے آپ پر نادم
اپنے بوجھ سے لرزاں
جس کا ذرّہ ذرّہ ہے
خود شکستگی ساماں
سب خمیدہ دیواریں
سب جھکی ہوئی کڑیاں
سنگدل رواجوں کے
خستہ حال زنداں میں

اک صدائے مستانہ
ایک رقصِ رندانہ
یہ عمارتِ کہنہ
ٹوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی چھوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی
جبر و خوف کی دختر
واہموں کی پروردہ
مصلحت سے ہم بستر
ضعف و یاس کی مادر
جب نجات پائے گی
سانس لے گی دڑّانہ
محورقصِ رندانہ
اپنی ذات پائے گی
تو ہے وہ زنِ زندہ
جس کا تن شعلہ ہے
جس کی رُوح آہن ہے
جس کا نطق گویا ہے
بازوؤں میں قوت ہے
اُنگلیوں میں صنّاعی
ولولوں میں بے باکی

لذّتوں کی شیدائی
عشق آشنا عورت
وصل آشنا عورت

شیما کے اندازِ بیان سے نظم کا مزا دو آتشہ ہو گیا تھا۔

OO

مسز عالم کے ہاتھ میں دعوتی کارڈوں کا پلندہ تھا، ایک ہفتہ کے بعد ان کی بیٹی کی شادی تھی۔ اس نے اسی سال بی۔ اے کیا تھا۔ سب نے انھیں مبارکباد دی۔

ربیعہ کہنے لگی۔

''مسز عالم، ویسے تو بہت خوشی کی بات ہے، لیکن میں سمجھتی ہوں، آپ کو اِتنی جلدی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ابھی ناجیہ بہت چھوٹی ہے۔ آپ اسے ایم۔ اے کرنے دیتیں اور پھر کوئی job شروع کرنے کے بعد اسے بیاہتیں۔''

''نہیں نہیں job کر کے کیا کرنا تھا؟ ہم جو دوہری ذمّہ داریاں اُٹھا رہی ہیں تو کونسا کمال کر رہی ہیں؟'' مسز تصوّر نے جلدی سے کہا۔

''گھر رہنے والی خواتین ہم سے بہت بہتر ہیں۔ مزے سے ہر چیز، آرڈر کرتی ہیں میاں کو۔۔۔ اور ہم 'کمیٹیاں' ڈال ڈال کر گھر بناتی ہیں۔''

''ویسے بھی اِتنا کام شام ٹھیک نہیں، آرام، آرام اور بس آرام۔'' صفورہ نے کہا۔

''اسی لیے تو عبدالعزیز خالد کہتے ہیں:

ع کارِ زناں ہے خانہ نشینی و کاہلی

شیما نے کہا، تو آسیہ غرّائی۔

''شیما، تمھیں نفسیات کے حوالے سے کچھ کہنا ہے تو کہو۔ اپنی اُردو دانی کا رُعب ہم پر مت جھاڑو۔''

''لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ ہمیں ہر بات کے لیے محتاج نہیں ہونا پڑتا۔'' سٹاف روم میں ایک مباحثہ شروع ہو گیا تھا۔

''اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری ایک پہچان ہے۔ ہم فلاں کی بیٹی، فلاں کی بہن یا فلاں کی بیوی کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔ یہ اظہارِ ذات کا ذریعہ ہے۔۔۔ اور ذات کی تشفّی۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ے حرفِ ناگفتہ، مجالِ نفسی می خواہد
ورنہ مارا، بہ جہاں تو سروکار کجاست
(وہ حرف جو کہا نہیں گیا، کہے جانے کی اجازت چاہتا ہے
ورنہ میرا، تیرے جہان سے کیا سروکار ہے)

شیما نے کہا۔

''مجال ہے جو میری بات کا تم پر کوئی اثر ہوا ہو۔ اب تم اُردو چھوڑ، فارسی میں شروع ہو گئی ہو۔'' آسیہ نے کہا۔

''بھاڑ میں گیا ذات کا اظہار۔۔۔'' مسز تصوّر نے جل کر کہا ''میرے تو میاں لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ میری بھی کوئی ضرورت ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اگر کسی چیز کا نام لو تو کہتے ہیں۔

''تم لے لو۔۔۔ بہت پیسے ہیں تمہارے پاس۔''

گویا، خود ان کے پاس نہیں ہیں۔ صبح میں یہاں سر کھپاؤ اور شام کو گھر داری میں صرف ہو جاؤ۔ کیا فائدہ؟''

''بالکل صحیح، لیکن مالی ضرورتوں کا تصوّر بھی اب مختلف ہو گیا ہے۔ صرف پیٹ بھر جاتا کافی نہیں ہے۔ بنیادی ضرورتوں میں تعلیم، تفریح اور علاج معالجے کی سہولتیں ملنا بھی شامل ہے بلکہ آسائش کی جدید اشیائے ضرورت بھی۔'' نگار نے کہا۔

''جیسے، اگر میری بیٹی، بیس روپے والی گڑیا مانگتی ہے تو میں اسے دو سو روپے والی
گڑیا دِلانے کی پوزیشن میں ہوں اور پھر اپنے خاندان کی آمدنی میں اضافہ کر کے جو سکون
ملتا ہے، اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ یہ احساس کہ آپ ایک ناکارہ پرزہ نہیں بلکہ انتہائی کارآمد
ہیں، بہت تقویت دیتا ہے۔'' ربیعہ نے کہا۔

''لیکن اس 'کارآمدیت' کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں بہت بڑی قیمت دینا پڑتی
ہے۔ ہمارے ہاں یورپ والی صورتِ حال تو ہے نہیں۔ میرے میاں صاحب اُٹھ کر پانی
پینے کے بھی روادار نہیں۔ اب وہ بھی تو میرے جیسے ہی پروفیسر ہیں۔ واپسی پر مجھے یہاں
سے لیتے ہوئے گھر جاتے ہیں۔ گھر پہنچتے ہی ہم لوگ کھانا کھاتے ہیں، جو میں صبح تیار کر کے
آتی ہوں۔ میز سے بمشکل برتن اُٹھاتی ہوں کہ آیا گھر جانے کی تیاری کر لیتی ہے۔ بیٹی کو
آیا صبح کے وقت نہلا دُھلا کر سُلا دیتی ہے اور خود آرام سے بیٹھی ٹی۔وی دیکھتی رہتی ہے اور
جب میں گھر جاتی ہوں تو بیٹا رانی، شگفتہ، چاک و چوبند اور کھیلنے کے موڈ میں ہوتی ہیں۔
اب میرے تو آرام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر اس کے والد صاحب، ارشاد
فرماتے ہیں:

''اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ، مجھے آرام کرنا ہے۔''

''بات یہ ہے کہ ہم چکّی کے دو پاٹوں میں پس رہی ہیں۔ نئی ضروریات اور پرانی
اقدار۔ ہم نوکری تو کر رہی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ گھریلو ذمّہ داریوں میں کوئی
ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتا۔ ایک دو نسلوں کو تو قربان ہونا پڑے گا اس چکّر میں۔ پھر جب معاشرہ یہ
بات اچھی طرح سمجھ جائے گا کہ عورت کے کام کیے بغیر خاندان کی مالی ضروریات پوری نہیں
ہو سکتیں تو مرد اس کی دیگر ذمّہ داریوں میں، اس کی مدد کرنے لگے گا اور یہ بات اس کے لیے
طعنہ نہیں رہے گی۔'' نگار نے سوشیالوجسٹ ہونے کے ناتے کہا۔

''خواتین و خواتین چائے تیار ہے۔ نوشِ جان فرمائیں۔''

''ہماری نوکری میں سرِ فہرست ہماری ٹی بریک ہے ایسی چائے گھر میں مل سکتی
ہے کیا؟'' ربیعہ نے قطعیت سے کہا۔

OO

رافعہ سٹاف روم میں داخل ہوئی تو سخت تھکی ہوئی اور پریشان لگ رہی تھی۔ اُڑی
اُڑی رنگت اور چہرے پر پھیکا پن۔

''خیریت ہے رافعہ؟'' کشور نے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں!''

''کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔۔۔ یہ لو پہلے لپ سٹک لگاؤ۔'' نگار نے اپنے پرس
میں سے لپ سٹک نکالتے ہوئے کہا۔

''اور پھر بات کرو۔۔۔ مسئلہ کیا ہے؟''

رافعہ لپ اسٹک ہاتھ میں پکڑ کر، پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔

''یہ خیریت ہے؟ خیریت ایسی ہوتی ہے؟'' ثوبیہ پھنکاری۔

''بتاتی کیوں نہیں؟''

''کیا بتاؤں؟ میرا تو اعتماد ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں کچھ صحیح بھی
کر سکتی ہوں۔ میں غلط ہوں۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ ہر وقت اور میرے مقابلے میں ہر شخص صحیح
ہے۔۔۔ کم از کم میرے میاں کے نزدیک۔''

''یہ قصّہ تو پرانا ہے اب بریکنگ نیوز کیا ہے؟ تازہ ترین؟''

''تازہ ترین کیا ہونا ہے؟ وہی گھسی پٹی باتیں۔۔۔ صبح میں آنٹی کے لیے ناشتہ
بنانے لگی تو وہ کہنے لگیں کہ مجھے فی الحال نہیں کرنا۔ میں نے اتنا کہہ دیا کہ ابھی گرم گرم کر
لیں۔ پھر مجھے کالج کے لیے تیار ہونا ہے۔ بس اتنی سی بات پر، میاں نے اتنا فضیحتا کیا کہ اب
امّی جی تمہاری مرضی پر چلیں گی؟ ناشتہ بھی تمہارے بتائے ہوئے وقت پر کریں گی؟ تم میری

ماں کی خدمت نہیں کر سکتیں تو مجھے بتا دو میں کوئی اور بندوبست کر لیتا ہوں۔''

''ایں۔۔۔ اور بندوبست۔۔۔ کیسا بندوبست؟ ہمارے بھائی صاحب آخر چاہتے کیا ہیں؟'' کشور کے ارادے اچھے نہیں تھے۔

''اور پتا نہیں کیا کچھ کہتے رہے۔ میں نے بہتیرا کہا کہ مجھے معاف کر دیں لیکن تو یہ۔۔۔'' رافعہ سسکی۔

''تم نے معافی کس بات کی مانگی؟ کالج آنے کی؟'' نگار کا بھی موڈ خراب تھا۔

''کیا کروں؟ معافی مانگنے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ خود بخود یہ الفاظ منہ سے نکل جاتے ہیں۔ ان کی توقعات اتنی الجھی ہوئی ہیں کہ اپنی دانست میں مَیں بہت ٹھیک کر کے بھی غلط گردانی جاتی ہوں۔ اگر میں دائیں جاؤں تو پتا چلتا ہے کہ اس وقت مجھے بائیں جانا چاہیے تھا اور جب بائیں کا رُخ کرتی ہوں تو دراصل یہ دائیں جانے کا وقت ہوتا ہے۔ وجہ میری کم عقلی نہیں ہے۔ وجہ تو ان کا وہ معیار ہے جس پر میں کبھی پورا نہیں اُتر سکتی۔''

''گولی مارو 'ان' کے اس معیار کو۔۔۔ تم بالکل بھی غلط نہیں ہو۔ ذرا حوصلے سے کام لو۔۔۔ یہ بہت ضروری ہے۔۔۔ دیکھو تمہاری صحت متاثر ہو رہی ہے۔ اکیلی بیٹھی سوچوں میں ڈوبی رہتی ہو۔ یہ صحیح نہیں ہے۔'' صلیحہ ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑے رافعہ کو تسلی دے رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں۔ میرا جسم کپکپاتا رہتا ہے۔ لگتا ہے کہ دِل اُچھل کر باہر آ جائے گا۔ ڈری سہمی سی رہتی ہوں۔۔۔ عدم اعتماد کا شکار۔۔۔ نہ جانے اب میں نے کیا کر دیا ہے؟ اب اس کی باز پرس کس انداز میں ہو گی؟ میرے میاں 'فردِ جرم' بھی اس انداز سے عائد کرتے ہیں کہ میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی خود کو گناہگار سمجھنے لگتی ہوں۔'' رافعہ کے دل کا غبار ابھی نکلا نہیں تھا۔

''دیکھا جائے تو میں نے کبھی اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کیا۔ میں روٹی کپڑے پر

کام کر رہی ہوں۔ وہی کھانا جو گھر میں سب کھاتے ہیں اور سال کے دو جوڑے اور وہ بھی مانگ کر۔۔۔ میری سالگرہ ہے۔۔۔ ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ مجھے تحفہ نہیں دیں گے کیا؟ وہ بادلِ نخواستہ دے تو دیتے ہیں لیکن یوں جیسے بھیک دے رہے ہیں۔ میں بہت تحقیر محسوس کرتی ہوں لیکن پھر اگلے سال کہہ دیتی ہوں تا کہ ہمارے درمیان کچھ سانجھ قائم رہے، مجھے تو اتنا اچھا لگتا ہے کہ انہیں تحفے میں کچھ نہ کچھ دیتی رہوں۔''

''کیا؟ کیا؟ کیا؟۔۔۔ تم تحفے دیتی ہو؟ اتنے لاڈ پیار؟ آخر کیوں؟ بی بی یہ سب تمہارا قصور ہے! اس طرح کرو گی تو ایسا ہی ہو گا۔ حقوق دیتا کوئی نہیں، حقوق لیے جاتے ہیں۔ بے چاری! پتی ورتا رافعہ بی بی!! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔'' فاخرہ کا لہجہ طنز کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔

''یہ بھی میرا قصور ہے؟ تم جانتی ہو، مجھے گھر کو سجا، بنا کر رکھنے کا کتنا شوق ہے۔ کل ناراض ہوئے تو کہنے لگے کوئی احسان نہیں کرتی تم مجھ پر۔۔۔ میرے بستر پر جو چادر بچھاتی ہو اس کے پیسے لے لیا کرو۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ بھلا یہ کوئی بات ہے کرنے کی۔'' رافعہ روئے جا رہی تھی۔

''یہ رونا دھونا بند کرو۔۔۔ رونے کے بجائے تم یہ کرتیں کہ پلنگ سمیت چادر 'ان' کے نیچے سے نکال لیتیں۔ وہ بھی تو تم نے ہی پچھلے سال خریدا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' فاخرہ غصّے سے پاگل ہو رہی تھی۔

''ناراض نہ ہو۔ میں تو پہلے ہی پریشان ہوں۔'' رافعہ منمنائی ''میں ان باتوں کی پرواہ نہ بھی کروں، لیکن بات تو یہ ہے کہ مجھے وہ تحفظ نہیں ملا، جو ایک بیاہتا عورت کو شوہر کے زیرِ سایہ ملتا ہے۔۔۔ وہ فصیل، جو دنیا اور بیوی کے درمیان حائل ہوتی ہے۔''

رافعہ اب دکھ کم ہونے کی وجہ سے حسبِ عادت گاڑھی اُردو بولنے لگی تھی۔

فاخرہ جو ابھی رافعہ کے رویّے پر اس سے نالاں تھی اب اس نے رافعہ کو اس طرح

فاخرہ کا 'جذباتی کھولاؤ' پھر عروج پر تھا۔

''یہ بہت زیادتی ہے۔لیکن تم واقعی Miss ہو اگر Hit ہوتیں تو یقیناً یوں رو نہ رہی ہوتیں۔میری طرف دیکھو۔میرے شوہرِ نامدار کا بھی آج موڈ خراب تھا۔کافی گرما گرم گفتگو فرما رہے تھے لیکن میں نے بھی کچھ کم نہیں کیا۔اور کہہ دیا کہ میں اس روز روز کی دانتا کِلکِل سے تنگ آ گئی ہوں۔آئندہ مجھے کچھ کہنے سے پہلے اچھی طرح سے سوچ لیں ورنہ ویسے ہی جواب کے لیے منتظر رہیں۔۔۔ہاں۔''

''تم نے یہ سب کہہ دیا؟''

''ہاں۔۔۔کہہ دیا!''

''واقعی؟''

''واقعی!''

''لیکن کیسے؟'' رافعہ چلاّئی۔

''دل میں ۔۔۔جیسے ڈرامے میں ڈائیلاگ کے بعد بریکٹ میں لکھا ہوتا ہے ۔۔۔(دل میں)''

''بدتمیز۔۔۔''

''مذاق کی بات اور ہے لیکن یہ کس قدر زیادتی ہے۔ماں باپ، بیٹی سے کہتے ہیں جب 'اپنے' گھر جاؤ گی تو یوں کر لینا، ووں کر لینا۔۔۔گویا جس گھر میں پیدا ہو، پاؤں پاؤں چلنا سیکھو، جس گھر کے کونے کونے سے محبّت ہو، جس پر اپنی جان بھی قربان کرنا چاہو، وہ اس کا گھر نہیں ہے۔۔۔''

''تیرے باگاں دے وچ وچ وے بابل ڈولا نئیں لنگدا
میں باگ کٹادیاں گا، دھیے گھر جا اپنے''

ایک کونے سے ربیعہ کی آواز اُبھری۔

''اور پھر یہی سنتے سنتے پیا گھر سدھارو۔۔۔بڑی آس۔۔۔بڑی اُمید لے کر۔ 'اپنا گھر' کس قدر پیارا احساس ہے۔اس گھر میں آنے سے بہت پہلے اس سے تعلق بندھ جاتا ہے۔اس گھر کے لیے کیا کیا سپنے نہیں دیکھے جاتے، جو ساس کی ایک ہی کڑک سے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی دل چھوٹا نہیں کیا جاتا کہ 'اپنے گھر' جیسی چیز کے پانے کے لیے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔۔۔''

''اور جب 'اپنے' گھر جاؤ تو شوہر کہتا ہے۔۔۔چلی جاؤ 'میرے' گھر سے'' رافعہ کی آواز میں شکستگی تھی۔

''پس ثابت ہوا کہ عورت کا گھر وہی ہے، جو اسے سرکاری طور پر ملا ہوا ہو'' کشور نے نہایت عاقلانہ انداز میں انکشاف کیا۔وہ ان دِنوں G.O.R. (سرکاری ملازموں کی رہائش) میں رہ رہی تھی۔

نگار نے چائے کی خالی پیالی رکھی اور ماحول کی 'آلودگی' کو محسوس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''رافعہ چندا، دِل برا نہ کرو۔آج میرا لکچر انسانی اور حیوانی معاشروں کے بارے میں تھا۔ماحولیات اور جانداروں کے اس سے متعلق رویّوں کے بارے میں۔آج صرف ایک جاندار کے بارے میں پڑھایا۔''

''کیا؟''

''یہی کہ بیوی ایک وفادار 'جانور' ہے۔بھوکی رہ لیتی ہے، مار سہہ جاتی ہے، بے عزّتی برداشت کر لیتی ہے اور جیسے ہی شوہر پچکارے، دم ہلاتی ہوئی اس کے پیچھے چلنے لگتی ہے۔'' حاضرین سٹاف روم پُر 'رقّت' طاری ہوگئی۔

اتنی دیر میں مدیحہ کھلکھلاتی ہوئی داخل ہوئی۔

''واہ۔۔۔واہ۔۔۔واہ کتنا مزہ آیا! آخر میں نے بدلہ لے ہی لیا۔۔۔'ظلم دا بدلہ'

شیمانے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ باقی لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔

''صاحبو! قصّہ کچھ یوں ہے کہ تقریباً 'عرصہ مدّت' دس روز سے ایک چوہا گھر میں دندناتا پھر رہا تھا۔ میں نے میاں سے چوہے مار دوا لانے کو کہا۔ تین چار دن تو لائے ہی نہیں، اور جو لائے تو روزانہ ایک ہی جواب ہوتا ''لا رکھی ہے، آفس میں رہ گئی ہے۔''

آج صبح بھی یہی جواب ملا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا، تو پھر یوں کریں، چوہے کو آفس لے جائیں۔ اور پھر جو میاں کے پھولے ہوئے چہرے پر نظر پڑی تو اب تک ہنسی بند نہیں ہو رہی۔''

''یہی تو ساری خرابی ہے کہ اگر بیوی سے ذرا بھر کی بھی دیر ہو جائے تو قیامت آجاتی ہے۔'' رافعہ کے دل کے زخم ہرے ہو گئے۔

''مدیحہ کی طرف دیکھو یہ ہوتا ہے صحیح رویّہ!'' کشور نے شاباشی کے انداز میں کہا۔

''یار تپانہ کرو ایسی باتوں پر، خرچ ہو جاؤ گی۔''

''کیسے نہ تپوں۔۔۔ جب اظہار بھائی ایسی باتیں کرتے ہیں تو تم پریشان نہیں ہوتیں۔''

''ہوتی تھی۔ اب نہیں۔''

''اب ایسا کیا ہو گیا ہے؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔'' رافعہ ابھی تک غصّے میں تھی۔

''مجھے ایک بزرگ نے وظیفہ بتایا ہے۔ وہ کرتی ہوں تب سے بہت سکون میں ہوں۔'' سبھی کے چہرے پر تجسّس اُبھر آیا۔

رافعہ نے جلدی سے پرس میں سے پنسل نکالنا چاہی، وظیفہ لکھنے کے لیے۔

''نہیں۔۔۔ نہیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت چھوٹا سا وظیفہ ہے۔ آسانی سے یاد ہو جائے گا۔ دن میں تین بار باقاعدگی سے اس کی دو تسبیح کرنا ہیں۔ اگر کسی وقت زیادہ پریشانی ہو تو اسے فوری طور پر بھی کیا جا سکتا ہے۔'' سبھی انتہا درجہ متوجہ تھیں۔

''ہر دانے پر دو، دو بار پڑھنا ہے۔ دفع، دفع۔۔۔ دفع دفع۔۔۔ دفع دفع۔۔۔

دیکھنا کتنی جلدی افاقہ ہوتا ہے۔''

سبھی نے بیک زبان کہا ''آئے ہائے۔''

رافعہ نے دانت کچکچائے۔

''لیکن یہ بات اب طے ہے کہ اگر میرے میاں کا رویّہ یہی رہا تو میں کوئی سخت فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔'' رافعہ نے کہا۔

''نہیں۔۔۔ں۔۔۔ں۔۔۔ں تم ایسا ہرگز نہیں کرو گی، تمہیں میری قسم۔'' ثوبیہ نے فلمی انداز میں ماتھے پر اُلٹا ہاتھ رکھ کر کہا۔

''نہیں رافعہ! تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ مانا کہ تمہیں ان کی باتوں سے بہت دکھ ہوتا ہے لیکن پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ شوہر، عورت کے سر پر چھت کی طرح ہوتا ہے۔'' شیما نے کہا۔

''ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ چھت چاہے غالبؔ کے مکان جیسی ہو، جس کے بارے میں انہوں نے فرمایا ہے کہ بارش ایک دن برستی ہے تو چھت پورا مہینہ ٹپکتی رہتی ہے۔'' نگار کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔

''نگار کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔۔۔ ہر بات میں مسخرہ پن کرتی ہو۔''

''دیکھو نا! اے کاش دل کو روؤں کہ پیٹوں تمہاری عقل کو میں۔ شادی کرنے سے پہلے تمہیں اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے تھا کہ اس دنیا میں ایک مرد، ایک یا ایک سے زیادہ عورتوں کو تنگ کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔۔۔ اب سب لاحاصل۔۔۔ باقی رہا آنٹی کا رویّہ۔۔۔ تو اس کے بارے میں دلبرداشتہ ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں، خدا نے کہا کہ میرے ساتھ کوئی ہو، جو میرا مددگار ہو اس لیے اس نے ماں کو پیدا کیا، اور شیطان کو بھی مددگار درکار تھا اس لیے ساس کو پیدا کیا گیا۔''

''شرم کرو نگار۔۔۔ تم بہت بڑھتی جا رہی ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ اب موضوع بدلنے کی ضرورت ہے۔ ایسا ہے کہ اب میں سٹاف روم کی دیگر خصوصیات پر روشنی ڈالتی ہوں۔ سامعین کرام، ہمارا سٹاف روم ہمارا ہائیڈ پارک تو ہے ہی اور بھی بہت کچھ اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ یہ 'مایوس پھوہڑ خواتین کی' آخری علاج گاہ' ہے۔ جہاں انہیں 'شرطیہ' سگھڑ بنایا جاتا ہے۔ کبھی 'رشیدہ کی کشیدہ کاری' سے متعلقہ مشورے یعنی دوپٹے پر کونسی 'خوشنما' بیل کاڑھی جائے گی اور قمیص پر کون سی 'دلفریب' بوٹیاں مناسب رہیں گی؟ کبھی 'زیبی کا دستر خوان' اور کبھی 'رانو کے ٹوٹکے'۔ سالن میں ادرک کس طرح اور کس وقت ڈالنا چاہیے؟ اور یہ کہ شوہر کے دل تک پہنچنے کا راستہ جو معدے سے ہو کر گزرتا ہے، اسے کیسے طے کرنا ہے؟ پلاسٹک کے برتنوں سے داغ چھڑانے کا کیا طریقہ ہوتا ہے؟ چائے دانی میں سے تمباکو کی سی بو آنے لگے تو کیا کرنا چاہیے؟ ساس کی ناراضگی دور کرنے کے لیے کونسا میٹھا بنانا چاہیے؟ ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور''

''بس کرو ۔۔۔ بس کرو نگار۔ کتنا اچھا ہوتا اگر تم اوائل عمری میں ہی فل سٹاپ اور کوما کا استعمال سیکھ لیتیں، مگر اب تو ہر طرف مایوسی ہی مایوسی ہے۔'' ثوبیہ چلائی لیکن نگار نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''مزید برآں یہ کہ بہت عمدہ شاپنگ گائیڈ کا کام بھی سرانجام دیتا ہے مثلاً کونسی چیز، شہر کے کس کونے میں اچھی اور سستی دستیاب ہے ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''یہاں علم کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں لیکن کوشش کی جاتی ہے کہ حتی الامکان گفتگو میں ان کا ذکر نہ آئے کیونکہ یہ دل پر بلاوجہ بوجھ ڈالتا ہے، ذہن کو پراگندہ کرتا ہے اور اس سے چہرے کی تازگی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔'' شیما نے کہا۔

OO

''نگار تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ اب تو بہت بہتر لگ رہی ہو۔''
راشدہ نے پوچھا۔

''بہتر تو نہیں ہوں، ڈھیٹ ہوں ۔۔۔ کمرے میں اکیلے لیٹے رہنے سے تو اچھا ہے کہ اپنے فرائض سرانجام دوں۔'' لہجے سے بے انتہا ذمہ داری ٹپک رہی تھی۔

''اچھا؟ یوں تو رات سے بہت اچھی دکھ رہی ہو۔''

''ہوں ۔۔۔ ٹھیک تو نہیں ہوں لیکن یہ کچھ یوں ہے کہ

ے 'لپ اسٹک' لگانے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ میرا تازہ کلام ہے۔''

''شکر ہے، کسی خرافات کو تو تم نے ذاتی کلام مانا ورنہ کبھی نیک و بد، غریب غالب اور فیض کے سر تھوپ دیتی ہو۔''

صلیحہ نے کہا۔

ے ''نس نس میں اگن
ٹوٹے ہے بدن
دلدار 'دبانے' آ جاؤ۔''

نگار نے بیٹھی بیٹھی آواز میں تان اُڑانے کی ناکام کوشش کی۔

''ہائیں ۔۔۔ ہائیں یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ربیعہ غرائی۔

''زکام ہو رہا ہے ۔۔۔ اپنی کیفیات بیان کر رہی ہوں۔''

''جب زکام کی بجائے 'ڈکاب' کی آواز نکلے تو یقیناً 'صحیح درجے' کا زکام ہوتا ہے، جو کہ تمہیں ہے لیکن دلدار بے چارے کا، یہ اِستعمال تو نہ کرو۔ کچھ خدا خوفی ۔۔۔''

ربیعہ نے کہا۔

''تم نے دوا لی؟'' ثمینہ نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''بس! یونہی! ابھی ایک آدھ دن اور، میں اسی رومان انگیز کیفیت میں گزارنا چاہتی ہوں۔ سن سن کرتا بدن، آنکھوں کی گلابی اور خماری۔۔۔ آغازِ جوانی تو نہیں ہے لیکن کچھ لوگ سمجھتے ہیں، ہم پی کے نکلتے ہیں۔''

''دفان ہو جاؤ اپنے فلسفے سمیت اور ڈھنگ سے، انسانوں کی طرح دوا لو۔''

''چلو، میری تو طبیعت ٹھیک نہیں، یہ تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟''

''یہ تو اسی دِن سے لٹک چکا ہے جب سے کشور چھٹی پر ہے اور مجھے لگاتار چار کلاسز لینا پڑتی ہیں۔ تم نے غور نہیں کیا ہوگا۔'' ثمینہ نے لاپرواہی سے کہا۔

''لو گرما گرم چائے پیو اور ساتھ میں سر درد کی گولی بھی لو، جو میں سرکاری خزانے کو نقصان پہنچا کر، طالبات کے لیے بنائی گئی ڈسپنسری کی انچارج، مس شائستہ بتول سے منّت سماجت کر کے لائی ہوں۔'' راشدہ نے کہا۔

مس شائستہ کے کھردرے لب و لہجے اور خشک رویّے سے سبھی نالاں رہتے تھے۔

''پتا نہیں والدین کیا سوچ کر اپنے بچّے کا نام رکھتے ہیں؟'' نگار، اکثر اپنی حیرانی کا اظہار کرتی۔

''گویا تم مجھے حرام مال کھلانا چاہتی ہو۔'' نگار نے گولی منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے خدشہ ہے کہ دوا سے کہیں نگار کی طبیعت ٹھیک نہ ہو جائے ورنہ۔۔۔ تم جانتی ہو!''

اِرم نے ثمینہ کے کان میں سرگوشی کی۔

''میں 'چُھنّی کاکی' نہیں ہوں کہ تمہاری بات نہ سمجھوں۔ میری طبیعت ٹھیک ہو چکی ہے اس لیے۔۔۔ خواتین و خواتین۔۔۔ غالبؔ کا تازہ کلام سنیے۔'' نگار نے اُونچی آواز میں سبھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تازہ کلام؟ غالبؔ زندہ ہیں کیا؟'' فاخرہ کے ہونٹوں سے دبی دبی چیخ برآمد ہوئی۔

''زندہ تو نہیں ہیں۔'' نگار نے بڑے وثوق سے کہا ''لیکن اسے تازہ کلام یوں کہہ سکتے ہیں کہ ابھی کل ہی، میں نے پڑھا ہے اور ویسے بھی، یہ ان کے دیوان میں موجود نہیں ہے۔''

''تو کہیں سے، ان کا غیر مطبوعہ کلام تمہارے ہاتھ لگ گیا ہے؟''

''مخطوطات؟''

''یہ تحقیق بعد میں کرنا، پہلے شعر سنو۔'' نگار نے ڈپٹ کر کہا۔

؎ اے خدا، حسن والوں کو حسن نہ دے، حسن پر ناز کرتے ہیں
لگا کر تیل بالوں میں، غالبؔ کو برباد کرتے ہیں

سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔

''توبہ ہے نگار، یہ غالبؔ کا نہیں، تمہارا کلام ہے اور لگتا ہے اسی نزلہ زُکام کی کیفیت میں 'آمد' ہوئی ہے۔''

''قسم لے لو، میں نے خود ٹرک کے پیچھے لکھا دیکھا ہے۔''

''اس کی طبیعت، کہیں اسی کی وجہ سے ہی تو خراب نہیں ہوگئی۔'' اِرم نے پھر ثمینہ کے کان میں سرگوشی کی۔

ہنسی سے فرصت ملی تو رافعہ نے کہا۔

''ہماری نوکری، ہمارے لیے کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہم کیسے ان بے معنی باتوں پر ہنستے رہتے ہیں۔ ایسی باتیں میں گھر پر کروں تو میری ساس اور میرا میاں تو فوراً مجھے پاگل خانے میں بھرتی کرا دیں۔ میں تو یہیں ہنس، بول لیتی ہوں، گھر میں تو سوائے جلنے کُڑھنے کے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔''

''میاں اور ساس سے یاد آیا ثمینہ! تمہاری آپی کی بات چل رہی تھی۔ کیا بنا؟''

''بنا کیا تھا؟ اس اتوار کو وہ لوگ آئے تھے اور پھر وہی پرانا قصہ۔۔۔ انھوں نے پوچھا والد صاحب کیا کرتے ہیں؟ آپ نے ان سے ملوایا ہی نہیں اور جب انھیں بتایا گیا کہ والد صاحب عرصہ ہوا وفات پا چکے ہیں تو چپ سے ہو گئے۔ دراصل انھیں اباجی کی وفات کا 'صدمہ' نہیں تھا۔ انھیں اس نہ ملنے والے جہیز کی فکر تھی جو والد صاحب کی وفات کی وجہ سے شاید نہیں مِل پائے گا۔''

''تمھاری آپی، اتنی پیاری، سلیقہ شعار اور پڑھی لکھی ہیں کہ جہیز کی کمی کو ان کے رشتہ پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے لیکن بات یہ ہے کہ لوگوں کی سوچ کو آپ کیسے بدل سکتے ہیں؟''

''مجھ سے چھوٹی بہت بدتمیز ہے۔ پرسوں جب وہ لوگ واپس گئے تو کہنے لگی۔

''ماں، ایسا کرتے ہیں، پہلے آپ کے لیے رِشتہ ڈھونڈ لیتے ہیں، لوگوں کی تسلّی بھی ہو جائے گی اور ہمارا کام بھی بن جائے گا۔'' ثمینہ نے ہنس کر کہا۔

''وہ تو امّی ہمارے ساتھ دوستوں کی طرح رہتی ہیں۔ اِس لیے ڈانٹنے کی بجائے بہت ہنسیں۔ اِتنی دیر میں، باہر سبزی والا آ گیا۔ امّی اس سے آلو پیاز لینے چلی گئیں اور واپس آ کر کہنے لگیں۔

''توبہ بابا بڑی مشکل سے مانا ہے۔ قیمتیں تو آج کل آسمان کو چھو رہی ہیں۔''

چھوٹی اُچھل کر بستر سے نکلی۔

''اچھا مان گئے؟۔۔۔ ویری گڈ!۔۔۔ کہاں ہیں؟ میں ان سے مِل لوں۔''

اور احتراماً، سَر پر دوپٹہ اوڑھ کر دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے اور آپی نے اس کی خوب پٹائی کی۔ شکر کی بات یہ ہے کہ ہم ایسی باتوں کو محسوس نہیں کرتیں ورنہ لوگوں کا تو مصمّم اِرادہ ہے کہ ہماری زندگی اجیرن کر دیں۔''

اِتنی دیر میں شہلا سٹاف روم میں داخل ہوئی۔ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔

''خیریت تو ہے۔'' ثمینہ نے گھبرا کر کہا۔

''ہاں۔۔۔ ہاں، بالکل خیریت ہے۔ مَیں کلاس میں سے نکلی تو میرا جوتا 'بے قدراں دی یاری' ثابت ہوا اور

ع ٹٹ گیا تڑک کر کے

تھوڑی دیر بعد سردار خان اجازت لے کر سٹاف روم میں آیا اور ایک مٹھائی کی ٹوکری، درمیانی میز پر رکھ کر چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے، انجم مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ دو روز پہلے انجم کی منگنی ہوئی تھی۔ کالج سے تقریباً سارے سٹاف ممبران نے شرکت کی تھی۔ آج وہ آتے ہوئے، اپنے سسرال کی طرف سے آئی ہوئی مٹھائی لائی تھی۔ سب نے باری باری اِس کے گلے مِل کر مبارک دی۔

ثوبیہ، نگار اور شہلا موجود تھیں لیکن ان کے ساتھ، شیما کو نہ دیکھ کر انجم نے پوچھا:

''شیما نظر نہیں آ رہی؟''

''وہ ویمن گارڈ انچارج ہے نا! آج تھیوری کی کلاس ہے۔'' شہلا نے جواب دیا۔

اتنی دیر میں شیما ہنستی ہوئی سٹاف روم میں داخل ہوئی۔

''آج صوبیدار صاحب بہت اچھے لگ رہے تھے کیا، جو اتنی خوش ہو؟'' نگار نے پوچھا۔

''نہیں، صوبیدار صاحب تو ویسے ہی لگ رہے تھے، جیسے وہ ہیں۔ البتہ ان کا لکچر بہت اچھا تھا۔۔۔ ہڈیوں کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا۔ انھوں نے بورڈ پر لکھا:

'ہڈیوں کا ٹوٹنا'

اور دوسری طرف انگریزی میں لکھا: 'Bones of Fracture'

میں نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

''صوبیدار صاحب۔۔۔ میرا خیال ہے یہ 'Fracture of Bones' ہونا چاہیے۔''

انھوں نے جواب دیا۔

"نہیں سر، اِدھر بھی ہڈیاں پہلے آئی ہیں۔ اُدھر بھی ہڈیاں پہلے آئیں گی۔"

ایک زوردار قہقہہ گونجا، پھر انجم نے اس کی توجہ مٹھائی کی طرف مبذول کرائی۔

شیما نے مبارکباد دی۔

نگار نے فرمائش کی۔

"شیما، وہ اس روز والی بات بھی بتاؤ نا سب کو۔"

"چھوڑ و بھی۔" شیما نے اسے گھورا۔

"نہیں۔۔۔نہیں ہمیں بھی بتاؤ۔" سب نے اصرار کیا۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ سٹاف روم میں کوئی بات شروع ہو اور پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے۔

شیما کہنے لگی۔

"آپ سب کو پتا ہے، یہ فوجی لوگ وقت کے کتنے پابند ہوتے ہیں۔۔۔اس لیے صوبیدار صاحب بھی ہیں۔ ایک دِن کافی دیر سے آئے، تو میں نے تشویش کا اظہار کرنے کے لیے کہا۔

صوبیدار صاحب، آپ آج دیر سے آئے ہیں۔ خیریت ہے نا!

تو صوبیدار صاحب نے کیا جواب دیا ہوگا؟ ذرا سوچو۔۔۔انھوں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"بتاؤں گا۔۔۔تنہائی میں۔"

"ہائے۔" سب نے بیک زبان کہا۔

"پھر انھوں نے تنہائی میں کیا بتایا؟"

"میں نے انھیں موقعہ ہی نہیں دیا کہ نہ جانے کیا کہہ دیں۔" شیما نے کھسیانی سی ہنسی، ہنستے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہلکے نارنجی رنگ کی شلوار اور آتشیں گلابی رنگ کے پھولوں والا

قمیص دوپٹہ پہنے کوئی خاتون، سٹاف روم کے سامنے والے برآمدے سے گزری۔

"یہ کون الہڑ دوشیزہ ہے؟"

وہ واپس مڑی اور اندر داخل ہوئی تو گویا بہار آ گئی۔

"ارے یہ تو مسز ذاکر ہیں۔"

وہ یوں تو باغ و بہار شخصیت کی مالک تھیں لیکن اس سے پہلے، سب نے انھیں دھیمے دھیمے رنگ پہنے دیکھا تھا۔ اب یوں دیکھا تو ہائیں ہائیں ہی کرتی رہ گئیں۔

"یہ۔۔۔یہ کیا؟ مسز ذاکر" ثمینہ نے کہا۔۔۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" انھوں نے کہا۔

"آپ، آپ نہیں لگ رہیں۔"

"وہ الگ مسئلہ ہے۔۔۔یہ بتاؤ اچھی لگ رہی ہوں یا نہیں؟"

"وہ تو یقیناً لگ رہی ہیں، لیکن مختلف۔" شیما نے کہا۔

"بھئی بات یہ ہے کہ مختلف نظر آنے کے لیے تو لوگ بہت پاپڑ بیلتے ہیں۔ میں نے تو صرف گہرا اور شوخ رنگ پہنا ہے۔ ویسے بھی، یہ تو موسم کا تقاضہ ہے۔"

ان دِنوں کالج پھولوں سے بھرا پڑا تھا۔

ع "تم جس رنگ کے کپڑے پہنو، وہ موسم کا رنگ"

ربیعہ، حسبِ عادت گنگنائی۔

مسز ذاکر کی طرف دیکھ کر شیما کی بھی حسِ شعریت پھڑکی۔

ے "دلِ عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں"

مسز ذاکر ہنسے جا رہی تھیں۔

ع "بلّے بلّے بھئی کرتی چوں اَگ سدی۔" شہلا نے پنجابی بولی گائی۔

مسز ذاکر، اگرچہ عمر میں ان سب سے، بہت بڑی تھیں اور ان کی ریٹائرمنٹ میں، چند ہی سال باقی تھے لیکن ان کی شگفتہ طبیعت اور محبت بھرے انداز نے کبھی بے جا تکلّف کو ان کے اور دوسروں کے درمیان حائل نہیں ہونے دیا تھا۔

وہ کہنے لگیں۔

"چند روز پیشتر، جب میں کالج کے لیے تیار ہوئی تو میں نے براؤن اور ڈرٹی گرین رنگ کا چھوٹے چھوٹے پھولوں والا سوٹ پہنا۔ آپ لوگوں نے دیکھا ہی ہے، مجھے محسوس ہوا کہ میں اِس میں بہت سست، تھکی ہوئی اور اُداس لگ رہی ہوں۔ پھیکا پھیکا، میلا میلا سا، یہ رُوپ مجھے اور تھکا گیا۔ میں نے بیٹی سے بات کی تو وہ کہنے لگی:

"امّی میں کہنے ہی والی تھی کہ اب آپ ایسے رنگ نہ پہنا کریں 'پیسٹل کلرز' پہننے کی، اب آپ کی عمر نہیں رہی۔ یورپ میں خواتین، لڑکپن اور جوانی تو بدرنگ جینز، جیکٹ اور جوگرز میں، بغیر میک اَپ کے گزار دیتی ہیں اور چالیس کی عمر سے گزرتے ہی، سجنے سنورنے لگتی ہیں کہ اب انھیں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔"

سو، اسی روز شام کو میں دو سوٹ اس انداز کے لے آئی۔ اب آپ لوگوں کے سامنے ہوں۔ فیصلہ آپ کریں گی۔"

سب لوگوں کی رائے تھی کہ وہ مختلف ضرور لگ رہی ہیں، لیکن اچھی۔ اس لیے اس تبدیلی کے حق میں، زیادہ ووٹ تھے۔

مسز عالم کہنے لگیں "لیکن ہماری عمر کا تقاضہ ہے کہ 'سوبر' رنگ ہی پہنے جائیں۔ ایسے رنگ تو نوعمر بچیوں کو ہی سجتے ہیں۔"

مسز ریاض کہنے لگیں۔

"بھئی، مجھے تو مسز ذاکر بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ چاک و چوبند اور کھلی کھلی۔ دیکھیں، جب عمارت نئی ہوتی ہے تو اسے کسی رنگ و روغن کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جب

اس پر کئی ماہ و سال گزر جائیں، کڑی دھوپ اس کا اصلی رنگ اُڑا دے اور بارشیں، سیلن اور پھپھوندی کے داغ چھوڑ جائیں، کلّر زدہ پلاسٹر اُکھڑنے لگے تو ضرورت ہوتی ہے کہ اس کی لیپا پوتی اور مرمّت کی جائے۔ یہی حالت ہم لوگوں کی ہے۔ اس لیے میں تو سوچ رہی ہوں، کہ اب میں بھی خوش رنگ سوٹ ہی خریدا کروں گی۔"

OO

نگار کالج سے فارغ ہو کر لوٹی تو اسے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی، اس نے کتابیں اور پرس میز پر پھینکا، جوتے اُتار کر کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی، سر پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر کے بعد، کچن کے دروازے پر نظر ڈالی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس پر لگے چارٹ پیپر پر موٹا موٹا لکھا تھا۔

'No Entry'

"ہائیں؟ کھوئی ہائے؟"

اس نے برٹش فوجیوں کے انداز میں زور سے ہانک لگائی۔

شیما کمرے میں آئی۔۔۔ یا وحشت۔۔۔ ایک تو نگار۔۔۔ اُوپر سے بھوکی۔

"کیوں چلّا رہی ہو؟ اس سے مزید انرجی زائل ہوگی۔"

"یہ کیا ہے؟ آج کھانا نہیں ملے گا کیا؟" نگار نے کچن کے دروازے کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ملے گا۔۔۔ ضرور ملے گا میری جان۔۔۔ تم سب کو بلاؤ اور ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔"

ثوبیہ کی ممتا بھری آواز نے اسے تقویت دی۔ وہ ایپرن باندھے اور Cooking Gloves چڑھائے، کچن کے دروازے میں مستعد کھڑی تھی۔

"آج کھانا کس نے بنایا ہے؟"

"میں نے۔"

ثوبیہ کی آواز میں بے پناہ غرور چھلک رہا تھا۔

"تم نے؟؟؟۔۔۔لیکن کیوں؟"

(لہجہ ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو "تم نے یہ زیادتی کیوں کی؟")

"وہ دراصل میں، شوہر کے دِل میں اُترنے کا راستہ جاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔۔۔میں نے سوچا ابھی سے تیاری شروع کر دوں۔"

ثوبیہ نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ شوہر کمبخت ہے کدھر؟۔۔۔بہر حال۔۔۔مجھے کچھ کھانے کو دو۔۔۔ بے شک تمہارا پکا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔" نگار کی فرمائش میں بے انتہا بے بسی تھی۔

ثوبیہ نے اُبلے ہوئے چاولوں کے 'ملیدے' کی ڈش میز پر رکھی تو سب نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ نگار نے بدرنگ اور بدوضع دال کے ڈونگے کو دیکھا اور برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"یہ شوہر کے دِل 'میں' اُترنے کا تو ہرگز نہیں، البتہ دِل 'سے' اُترنے کا راستہ ہوسکتا ہے۔۔۔واللہ اَعلم بِالصّواب۔ بہر حال، اسے جیسے تیسے حلق سے اُتارو اور پھر، مس مہ جبیں کے ہاں چلتے ہیں لیکن ثوبیہ آئندہ رااحتیاط۔۔۔دوبارہ ہمیں آزمانے کی کوشش نہ کرنا۔"

مس مہ جبیں، شدید بیماری کی وجہ سے کئی روز سے کالج نہیں آ رہی تھیں۔ اب وہ صحت یاب تو ہوگئی تھیں لیکن ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق، انھیں کافی دیر آرام کرنا تھا۔ باری باری سبھی کولیگز، ان کی خیریت معلوم کر آئی تھیں۔ آج شیما، ثوبیہ، شہلا اور نگار، اس خیال سے ان کے ہاں دوبارہ آئی تھیں کہ گپ شپ کر کے ان کا دِل بہلایا جائے۔

مس مہ جبیں اپنے کمرے میں اکیلی لیٹی تھیں۔ نیم تاریک کمرے میں، ہلکی موسیقی

کے باوجود ایک وحشت انگیز خاموشی تھی۔

ان کی بھابھی نے دروازے میں، کھڑے کھڑے ان لوگوں کی خیریت دریافت کی اور واپس چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازمہ بدرنگ سا شربت لے کر آئی تو مس مہ جبیں نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔ وہ شاید اس کی بھی توقع نہیں کر رہی تھیں۔

"مس مہ جبیں آپ نہیں پییں گی؟" شیما نے پوچھا۔

"نہیں شیما۔ میری پرہیز چل رہی ہے۔ ورنہ دِل تو کوئی ٹھنڈی میٹھی چیز پینے کو بہت چاہتا ہے۔ آپ لوگ پییں۔۔۔میں ٹھیک ہوتی تو آپ کی کچھ خاطر داری کرتی۔" مس مہ جبیں کے لہجے میں ملال تھا۔

"نہیں نہیں، مس مہ جبیں۔۔۔تکلّف نہ کیجیے۔ ہم، تو صرف آپ سے گپ شپ کرنے آئی ہیں۔"

"بہت اچھا کیا۔ بستر پر لیٹ لیٹ کر میرا دِل اُوبھ گیا ہے۔ اُمید ہے کچھ دِنوں تک کالج آنے لگوں گی۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا ہوگا؟"

"مس مہ جبیں۔ ہے تو یہ انتہائی ذاتی سا معاملہ۔۔۔پتا نہیں آپ میری اس جسارت کو کیا رنگ دیں، لیکن یقین مانئے گا میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ جو اتنی خوبصورت شخصیت کی مالک ہیں تو یہ کیسے ہوا کہ آپ نے اپنی زندگی کے ساتھی کا انتخاب نہیں کیا اور اکیلے زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی؟" نگار نے دبی زبان میں کہا۔

شہلا اور شیما نے اسے گھورا، کیونکہ مس مہ جبیں کا انٹرویو کرنا تو ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ انھوں نے سہمی سہمی نظروں سے، مس مہ جبیں کی طرف دیکھا کہ اب نہ جانے وہ اپنے ردِّعمل کا اظہار کس طرح سے کریں گی؟

"یہ بات میں نے آج تک کسی سے نہیں کی، کیونکہ یہ میری ذات کا معاملہ ہے اور میں اسے اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہتی ہوں۔"

شہلا، ثوبیہ اور شیما نے نگار کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا، جو کہہ رہی تھیں۔

''کہا تھا نا تم سے!''

''لیکن، آج تم نے اتنی محبت اور اپنائیت سے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں سوچتی ہوں اپنی زندگی کی کہانی تمھیں سنا ہی دوں۔''

اس پر جہاں ان تینوں نے اطمینان کی سانس لی، وہاں نگار نے اپنے مخصوص فخریہ انداز میں ان کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''دیکھ لیا نا پھر تم لوگوں نے!''

مس مہ جبیں کی نگاہیں خلاؤں میں بھٹک رہی تھیں، اُنھوں نے ان پر ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ہولے ہولے کہنے لگیں۔۔۔ یوں جیسے ہم کلامی کر رہی ہوں۔

''میں بھی جب تمھاری طرح ملتانی مٹی کی گڑیا تھی، تو میرے بدن سے اُٹھتی ہوئی کورے برتن کی سی خوشبو، مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی کہ دُنیا کتنی حسین ہے۔ پھول میرے لیے کھلتے، چاند میرے لیے چمکتا، وہ راتیں کتنی حسین تھیں جب آسمان ستاروں سے ڈھک جاتا۔ چاندنی راتوں میں، مَیں گھنٹوں چاند کو تکتی رہتی۔ حتیٰ کہ اس کی ایک ایک کرن، مجھ میں جذب ہو جاتی اور جب میں کمرے میں جاتی، تو چاندنی دبے پاؤں ساتھ چلی آتی۔ روشن صبحیں، دِلفریب شامیں۔۔۔ مدھم چاندنی، پرانے گیتوں اور معصوم تمناؤں کی دُنیا۔ کتنے اچھے تھے وہ دِن، جب صبح کے دُھندلکوں میں، مَیں تازہ کھلے ہوئے پھول کی مانند مہکی مہکی اور نکھری ہوئی نظر آتی۔''

مس مہ جبیں، عام گفتگو بھی بہت مقفّٰی و مسجّع انداز میں کرتی تھیں۔ ان کی بات ختم ہوتی تو نگار آہستگی سے کہا کرتی ''میرا خیال ہے 'زبانِ یار' کو سمجھنے کے لیے مجھے اُردو منشی فاضل کا امتحان پاس کر ہی لینا چاہیے۔'' اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں شرارت جگمگا رہی تھی لیکن خدا کا شکر کہ وہ منہ سے کچھ نہیں بولی۔

''قوسِ قزح آج بھی ویسی ہی رنگین ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ گلاب میں اب بھی وہی دِلکشی ہے۔ نیلگوں آسمان پر چاند آج بھی اسی طرح درخشاں ہے۔ تاروں بھری رات میں گہرے پانیوں کی سندرتا، اب بھی باقی ہے۔ سورج اب بھی، اسی آب وتاب سے چمکتا ہے لیکن مجھے ان سب میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ یوں لگتا ہے، جیسے ان میں گئے سمے کی دِلفریبی نہیں ہے۔ جانتی ہو کیوں؟''

نگار نے بے ساختہ انکار میں سر ہلایا۔

''تم کیا جانو؟ ان باتوں کو وہی جانتا ہے جو ان راہوں سے گزرا ہو، اور ان راہوں کی ایک راہی میں بھی ہوں۔

میٹرک کے بعد جب امّاں نے مجھے پڑھائی کا سلسلہ منقطع کرنے کو کہا تو میں دھک سے رہ گئی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ مجھے تو ابھی بہت سا پڑھنا ہے۔ امّاں نے بہتیرا سمجھایا کہ عورت کا اصل مقام، گھر کی چاردیواری ہے اور اب مجھے گھر گرہستی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے خود کو تیار کرنا چاہیے اور نہ جانے کیا کیا کچھ، لیکن اس وقت تو دماغ تسلیم ہی نہیں کرتا تھا کہ میں بھی ایک عورت ہوں۔ سولہ سترہ سال کی لڑکی، بھلا کب خود کو 'عورت' کہلوانا پسند کرے گی؟'' مس مہ جبیں ذرا کی ذرا سانس لینے کو رُکیں۔

''تب میں جوان تھی، کائنات جوان تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے آئندہ پانچ چھ سالوں کے اس پار نظر ڈالی۔ ایک بے پرواہ، مہکتی بہکتی دُنیا دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی، کچھ اجنبی، کچھ جانی پہچانی، میری اپنی کائنات۔۔۔ وہی زندگی جس کی تمنا ہر لڑکی کے دِل میں ہوتی ہے۔ میں بھی اس صنف سے تعلق رکھنے کے ناتے کچھ ایسی ہی زندگی کی متمنی تھی۔ لیکن ایک ایسی عورت کے تصوّر سے ہی جسے روٹیاں تھاپنے اور صبح شام اپنے ڈھیر سارے بچوں کو کوسنے دینے کے علاوہ کوئی کام نہ ہو، میرا دم گھٹنے لگتا۔ تف ہے ایسی عورت پر جس کا مقصدِ حیات ہی بچّے پیدا کرنا، تین وقت، پیٹ کا دوزخ بھرنے کا بندوبست کرنا اور جھوٹے

برتن دھونا ہو۔ کیا زندگی ہے اس عورت کی جس کا مرنا جینا، اوڑھنا بچھونا ہی چولہا چکی ہو۔''

''کہیں یہ میری ماں کا ذکر تو نہیں کر رہیں؟'' نگار نے شیما کے کان میں سرگوشی کی۔

''بدتمیز'' شیما نے دانت پیسے۔

''مجھے ایسی زندگی گزارنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں گھریلو زندگی کی متمنّی تو تھی لیکن ابھی نہیں۔۔۔ میرے دِل نے کہا۔ اور یوں بھی۔ میرے ذہن میں اور بہت کچھ تھا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ عورت اور مرد ایک ہی گاڑی کے دو پہیئے ہیں اور زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے عورت کو مرد کے شانہ بشانہ چلنا چاہیے۔ بحیثیت ماں، عورت معاشرے کا ستون ہوتی ہے اور ایک پڑھی لکھی ماں ہی ایک صحت مند معاشرے کو جنم دے سکتی ہے۔'' لگتا تھا مس مہ جبیں، معاشرے میں عورت کے کردار پر تقریر کر رہی ہیں۔

''مجھے آج بھی وہ واقعہ اسی طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ جھکی جھکی آنکھوں اور موٹے فریم کی عینک والے، اسلامیات کے لکچرر، کا گھر بار تو تھا نہیں۔ اس لیے جب وہ اپنی ہمسائی کے ساتھ اماں سے بات کرنے آیا تو اماں کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں کہ نہ ساس نند کا جھگڑا، نہ سسرال کی جِھک جِھک لیکن میں جھنجھلا گئی۔ اماں کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ اسلامیات کے لکچرر سے شادی!۔۔۔ میں کھلکھلائی۔۔۔ اسلامیات کے لکچرر سے شادی۔۔۔ آئے ہائے۔۔۔ کیسی مضحکہ خیز بات تھی۔ برقعہ پہننے کے تصوّر سے ہی میرا دم گھٹنے لگا اور پھر وہ تو کہے گا کہ گھر کی چار دیواری میں بی بی جّخن بنی بیٹھی رہو کہ عورت کا اصل مقام یہی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے دھانی، پیازی، نیلے اور زعفرانی چنے چنائے دوپٹے گھوم گئے۔۔۔ وہ بھلا کب اوڑھنے دے گا؟ اور ہاں وہ 'سلیولیس شرٹ' جسے پہننے کے لیے میں اماں کو کبھی نہ منا سکی، وہ بھی اس کی اجازت نہیں دے گا۔ ہائے تو کیا میں اس کا ارمان اپنے ساتھ ہی قبر میں لے جاؤں گی؟ نہ کوئی کلب نہ پارٹی۔۔۔ نہیں نہیں وہ میرے خیالات کے ساتھ، بالکل بھی لگا نہیں کھاتا۔''

مس مہ جبیں نے ایک لمبی سانس لی۔ پانی کے دو گھونٹ پیے اور اپنے بیڈ کے ساتھ سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جانے کی اجازت چاہنے کا سوچنے لگیں۔ اِتنی دیر میں مس مہ جبیں، پھر سے کہنے لگیں۔

''اور پھر تو گویا موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ کبھی یہ، کبھی وہ اور اماں کو جب 'وہ' پسند آ گیا تو میرے خیالات کا محل دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ وہ خوابوں کے چیختے چلّاتے رنگ، وہ امریکن طرز کی کوٹھی، جس میں، مَیں ننگے پاؤں گھوما کرتی، نیلے پھولوں والے سفید قالین والا بیڈ روم۔۔۔ ہیرے کا بریسلٹ۔۔۔ سب کچھ دُھندلا گیا۔ کہنے کو تو وہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈووکیٹ ہائیکورٹ تھا لیکن آمدن نام کو نہیں تھی۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں کالا کوٹ پہنے، سائکل کے کیریئر پر ایک خربوزہ اور پاؤ بھر برف رکھے، وہ اس گھر کی طرف لوٹتا جہاں آلو بینگن اور تنوری روٹیاں پڑی اس کا انتظار کیا کرتیں۔ میں نے اماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس کے ساتھ خوش نہ رہ سکوں گی اور ہاں وہ بزنس مین۔۔۔ خیر بزنس مین میرا آئیڈیل تو تھا لیکن میرا آئیڈیل ہیروں کا کاروبار کرتا تھا۔ ابصار علی کی طرح کھالوں کا نہیں۔ وہ اباجی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا تو سستے درباری عطر کی خوشبو کے ساتھ ساتھ کھالوں کی لپٹ بھی آ جاتی اور جب تصوّر ہی تصوّر میں، میں نے کونوں کھدروں میں مہکتی کھالوں کو دیکھا تو مارے کراہت کے میرا جی اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ کہاں جگ مگ، جگ مگ کرتے ہیروں کا کاروبار اور کہاں۔۔۔ بدرنگ اور بدبودار کھالیں۔ لاحول ولا۔۔۔ کیسی غیر رُومانی بات تھی۔۔۔ ہے نا!''

مس مہ جبیں، اوپرے دِل سے ہنس رہی تھیں۔

''پھر بہت سے آئے اور چلے گئے۔ تب میں تعلیم ختم کر چکی تھی اور مجھے ملازمت بھی مِل گئی تھی۔ میں بے حد خوش تھی کہ اب میں بڑے بڑے کام کروں گی۔ اپنا مستقبل خود بناؤں گی، تقریریں کروں گی۔ ملک کی عورتوں کو معاشرے میں مناسب مقام دِلا کر رہوں

گی۔ مباحثوں میں حصہ لوں گی، رسائل اور اخباروں میں میرے مضمون چھپیں گے، کالم نظر
آئیں گے۔ کلاسیکی موسیقی سیکھوں گی۔ ان فرسودہ روایات اور اقدار کو بدل کر رکھ دوں گی جن
کے مطابق اعلیٰ تعلیم اور شخصی آزادی کے باوجود عورت کا مقصد صرف بچّے پیدا کرنا ہے۔
عورت اور بھی بہت کچھ کر سکتی ہے، اگر اسے موقعہ دیا جائے۔ جس عورت کو تمام عمر اُنگلی سے
لگائے پھرو، اس میں بھلا اعتماد کہاں سے پیدا ہوگا؟''

یوں رفتہ رفتہ۔۔۔ میرا پڑھانے کا تجربہ بھی چار سال ہو گیا۔ میری طالبات مجھے
بہت پسند کرتی تھیں، کیونکہ میرا پڑھانے کا انداز اچھا تھا لیکن کلاسیکی موسیقی اور بحث مباحثے
دُور دُور تک نظر نہیں آتے تھے۔ میں معاشرے کی اِصلاح کا سوچتی رہتی اور امّاں کی ملنے
والیاں سرگوشیاں کرتیں ''ارے چھوٹی بہن کو تو اچھا خاصہ ڈاکٹر مل گیا، (تب یاسمین کی شادی
ایک جھڑوس سے ڈاکٹر سے ہو چکی تھی۔) اور بڑی بہن یونہی بیٹھی ہے بے چاری۔ 'بے چاری'
تب یہ مہمل سا لفظ بہت اچھا لگا کرتا تھا۔ کیونکہ تب میں اسے محض ان عورتوں کے محدود ذہن
کی پیداوار سمجھتی تھی اور 'بے چارگی' کی ان ہولناکیوں سے واقف نہیں تھی، جن کا سامنا مجھے
آج کرنا پڑ رہا ہے اور جن کی پیش گوئی، تب ہی ان عورتوں نے کر دی تھی۔'' مس مہ جبیں
کے چہرے پر پچھتاوا ہلکورے لے رہا تھا۔

''امّاں نے محفلِ میلاد میں جن خواتین کو مدعو کیا تھا ان میں سے ایک کو کہتے
ہوئے، میں نے خود اپنے کانوں سے سنا۔

''چھوٹی کو تو ایف۔ اے کے بعد ہی اچھا لڑکا مل گیا اور بڑی بے چاری نوکری
کرنے جا رہی ہیں۔ اب ان باتوں سے تو یہی ہوگا نا! میری ثمینہ کیا کم روتی تھی کہ امّی نے
مجھے میٹرک بھی نہ کرنے دیا۔ اب مہ جبیں رانی کے لیے تو کوئی راجہ ہی اُترے گا آسمان سے۔''

تب یہ باتیں بہت مزے کی لگتی تھیں، اور میں ان پر دل کھول کر ہنستی۔ اس وقت
مجھے ان کی ذرّہ بھر بھی پرواہ نہیں تھی اور میں ان سب رجعت پسند اور دقیانوسی تنقیدوں کو

خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے ترقی پسند خیالات، کی بے پناہ عظمت کو سینے سے لگائے
دبے دبے مسکرایا کرتی تھی۔''

مس مہ جبیں نے رُک رُک کر کچھ اس انداز سے ان سے چائے کے لیے پوچھا کہ
چاہنے کے باوجود، انھوں نے انکار کرنے کو ہی بہتر جانا۔

''اور پھر ایک دِن، صبح کی اوّلین ساعتوں کے دُھندلکوں میں مَیں نے محسوس کیا
کہ میری آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے ہیں اور میں بہت عمر رسیدہ نظر آ رہی ہوں۔ تب
مجھے عجیب سی کوفت ہوئی۔ کیا عورتیں یہی ہوتی ہیں؟ محض یہی۔ تب تک موسلا دھار بارش،
بوندا باندی میں تبدیل ہو چکی تھی اور پھر مطلع بالکل صاف ہو گیا اور اب تو کوئی اَبر کا آوارہ ٹکڑا
بھی نہیں جس کی چھاؤں میں، ہاتھ سے نکل چکی جوانی کی، لمبی تپتی دوپہریں گزار دوں۔ میں
تھک چکی ہوں اور تنہا ہوں۔''

مس مہ جبیں کھانسیں، تھوڑا پانی پیا اور شہلا کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولیں۔

''ذرا واش رُوم تک جانے میں میری مدد کرو۔''

شہلا انھیں واش رُوم تک چھوڑ کر آئی تو شیما نے نگار سے کہا۔

''تمھیں کس نے کہا تھا یہ رام کتھا چھیڑنے کو؟''

''چپ رہو میں تو پہلے ہی پچھتا رہی ہوں کہ فیروز اللغات ساتھ کیوں نہ لے کر
آئی؟ اب آدھی بات سمجھ میں آتی ہے آدھی نہیں۔'' نگار نے مایوسی سے کہا۔

مس مہ جبیں واپس بستر پر آئیں تو شہلا نے سب کی طرف سے جانے کی
اِجازت چاہی۔

''نہیں رُکو۔ اب بات شروع ہوئی ہے تو ختم تو ہونے دو۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہی
تھی، اندھیرا چھا رہا ہے اور میں تھک چکی ہوں۔ میں ویران اور تپتے ہوئے ریلوے سٹیشن پر
لگے ہوئے اس نل کی طرح ہوں، جس پر لکھا ہو 'پینے کا ٹھنڈا پانی' لیکن پانی کے چائے بننے

میں، صرف پتی کی کسر باقی ہو۔ کہنے کو تو میں صنفِ نازک سے متعلق ہوں لیکن مجھ میں وہ
نزاکت ختم ہو چکی ہے، جس کی تعریف کرتے کرتے شاعر ساری عمر گزار دیتے ہیں۔ میری
آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ستاروں کی، چمک ماند پڑ چکی ہے۔ پکی ہوئی خوبانی
کا سا رنگ، وقت کے تھپیڑوں سے دُھندلا گیا ہے۔ گالوں کی آگ سے شعلے بلند ہو کر،
جانے کب کے سرد پڑ گئے ہیں؟ راکھ کریدنے سے شاید ہی کوئی چنگاری ملے۔ میں عورت
ہوں۔۔۔ میں بیٹی ہوں، لیکن بیٹی بھی ایسی جس کے ضعیف باپ کی کمر اس کا بوجھ اُٹھانے
پر مجبور تھی۔ جس کی بوڑھی ماں کی آنکھیں اسے 'اپنے گھر' میں ہنستا بستا دیکھنا چاہتی تھیں۔
میں عورت ہوں۔۔۔ لیکن بیوی نہیں، جو شوہر کی شریکِ سفر بن سکے۔ میں عورت ہوں۔۔۔
لیکن ماں نہیں، جس کے پاؤں تلے کسی کو جنّت کی تلاش ہو۔"

"مس مہ جبیں۔ آپ اس طرح سے کیوں سوچتی ہیں؟ آپ کے پاس اور عزیز
رِشتے بھی تو ہیں۔" شہلا نے کہا۔

"اور رِشتے۔۔۔ ہنہ۔۔۔ جب سے تم آئی ہو، کسی کو میرے کمرے میں آتے
دیکھا ہے؟ میرا بھی دِل چاہتا ہے کہ میرے لیے دُعا، کے لیے ہاتھ اُٹھیں۔۔۔ رات کو
جب میں سو رہی ہوں تو کوئی تشویش سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھے کہ بخار تیز تو
نہیں۔ میرے ٹھیک نہ ہونے پر، ڈاکٹر تبدیل کرنے کی تجویز دے۔ کوئی میرے لیے پرہیزی
کھانا بنائے۔۔۔ کوئی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے پاؤں دبائے۔

میری سوچیں بکھری بکھری سی ہیں۔۔۔ عجیب و غریب غیر منطقی خیالات۔۔۔
دربدر بھٹکنے والے آوارہ گرد۔۔۔ جو ذہن کے چور دروازے پر ہولے سے دستک دے کر
بڑی دھیرج سے، سکونِ دِل میں ہلچل مچا کر، چپکے سے غائب ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور یہ تنہائی
اور بے رحم سنّاٹا۔۔۔ وقت کتنا ظالم ہے۔ کاش یہ زیادہ نہیں تو دس پندرہ سال ہی، پیچھے چلا
جائے۔ میں سخت تھک گئی ہوں۔ اکٹھے پن کا احساسِ رفاقت۔۔۔ دائمی رفاقت۔۔۔ جو

میں نے کبھی محسوس ہی نہیں کی۔"

(مس مہ جبیں، قرۃ العین حیدر سے بہت متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ شیما نے سوچا۔)

"میں نے کہا تھا نا مجھے منشی فاضل کا امتحان پاس کر لینے دو، لیکن تم لوگوں نے
میری ایک نہیں چلنے دی۔" نگار نے بے بسی سے ان تینوں کی طرف دیکھا جن کی آنکھیں
شعلے برسا رہی تھیں۔

"تم چپ نہیں رہ سکتیں؟" شہلا نے دھیمی آواز میں ڈپٹ کر کہا۔

"اب تو اس دِلفریب جگمگ کرتی دُنیا کے، رنگ بھی پھیکے پڑ گئے ہیں۔ میں چاندنی
راتوں میں کمرے میں بند بیٹھی رہتی ہوں کہ کہیں ٹھنڈ لگ گئی تو صبح پڑھانے نہ جا سکوں گی۔
غروبِ آفتاب سے منہ موڑ کے بچیوں کی کاپیاں جانچتی رہتی ہوں۔

کبھی سوچتی ہوں کہ آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک چڑھائے، موٹی موٹی کتابوں
میں سر کھپانے سے تو کہیں بہتر تھا کہ میں بڑی خاموشی سے، ایک سجے سجائے گھر میں، اپنا
بیشتر وقت اپنے لباس کے ساتھ لپ اِسٹک میچ کرنے میں گزار دیتی اور بڑی شدّت سے
اس شوہر کا انتظار کیا کرتی جو اکثر دیر سے گھر لوٹتا۔

لیکن اب بھی جب کبھی میں اپنے 'تعلیم یافتہ اور روشن خیال' ذہن سے سوچتی
ہوں تو اس میں مجھے اپنا کوئی قصور نظر نہیں آتا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ کچھ لوگوں کو زمانے
کی بدلتی ہوئی اقدار کا شکار بننا ہی پڑتا ہے۔ زمانے کی چکّی کے نئے اور پرانے پاٹوں کے
درمیان مجھ جیسے لوگ ہی پِسا کرتے ہیں لیکن یہ سوچیں، یہ نظریات ایک خاص عمر میں ہی
اچھے لگتے ہیں۔ ان بلند بانگ دعوؤں کے مقابلے میں میری تنہائی، ایک اٹل حقیقت ہے۔
ایک عام گھریلو عورت اگر تنگ دست ہے تو کیا ہوا؟۔۔۔ اور میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتی
ہوں تو؟۔۔۔ کیا اس سے رِشتوں کی مہک اور بچوں کی کلکاریاں نہیں خریدی جا سکتیں۔"

مس مہ جبیں نے سر پیچھے ٹکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔ ان کا رنگ زرد تھا اور ماتھے

پر پسینہ۔ لگتا تھا وہ نقاہت کے باعث مزید بولنے سے قاصر ہیں۔

ان لوگوں نے موقعہ غنیمت جانا اور آہستگی سے اُٹھ کر باہر آ گئیں۔ راہداری، نیم تاریک تھی، اس کے اس پار، کمرے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ مس مہ جبیں کی بھابھی اور ان کے بچوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

واپسی پر شہلا نے کہا۔

''مس مہ جبیں کالج میں بھی الگ تھلگ رہتی ہیں اور ادھر گھر پر بھی، اسی لیے تو راہداری کے اس پار کی رونقیں، وہیں تک محدود ہیں اور یہ اپنے کمرے میں بند خود کو ایسی منفی سوچوں کے حوالے کیے رکھتی ہیں۔''

''یہی وجہ ہے کہ زندگی ان کے لیے مشکل ہو گئی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے والے کبھی اپنے حال کو enjoy نہیں کر سکتے۔'' شیما نے جواب دیا۔

نگار بالکل خاموش تھی۔ جب یہ کمرے میں واپس پہنچیں تو شیما اور شہلا نے دیکھا کہ نگار کی آنکھیں سرخ اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں، جیسے راستہ بھر روتی رہی ہو۔

''تمہیں کیا ہوا مہ پارہ نگار؟'' شیما نے کہا۔

''وہ مس مہ جبیں۔۔۔ ابھی تو لغات نہ لے جانے کی وجہ سے میں ان کا موقف پوری طرح سمجھ نہیں پائی۔۔۔ ورنہ۔۔۔ پتا نہیں میرا کیا حال ہوتا؟''

نگار نے بڑی دِل پذیر آواز میں کہا۔

۔۔۔ اگلی صبح کالج بند کر دیا گیا تھا اور ہر آنکھ پُرنم تھی۔ مس مہ جبیں کے بھائی نے اطلاع دی تھی کہ صبح دس بجے جب ان کے کمرے میں نوکرانی ناشتہ دینے گئی تو دیکھا کہ مس مہ جبیں پلنگ کے ساتھ سر ٹکائے بیٹھی تھیں لیکن رات کے کسی پہر میں، وہ پچھتاووں کے اس جہاں سے کوچ کر گئی تھیں۔

○○

باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ دُھندلایا ہوا موسم بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دُھلے دُھلائے درختوں کے پتوں سے ٹپکے پانی کے قطرے بے آواز گر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ سٹاف روم کی کھڑکی کے فریم میں ایک خوبصورت پینٹنگ آویزاں ہے۔ سردی کافی بڑھ گئی تھی، لیکن مسلسل ہیٹر چلنے اور زیادہ لوگوں کے کمرے میں موجود ہونے سے نیم گرم آسودگی کا احساس ان کی کارکردگی کو متاثر ہونے سے بچا رہا تھا۔

دسمبر میں، طالبات کے ٹسٹ ہوئے تھے۔ مہینے کے آخری ہفتہ میں کالج، موسمِ سرما کی چھٹیوں کے لیے بند رہا تھا۔ اب جنوری میں کالج دوبارہ کھلا تھا اور تمام لوگ واپس آ کر یوں ایک دوسرے سے مل رہے تھے جیسے سالوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ اس وقت، اکثر لوگ سٹاف روم میں بیٹھے، باقی ماندہ پرچے، چیک کر رہے تھے۔

''تم باہر کیا جھانکتی جا رہی ہو؟ اتنے اطمینان سے بیٹھی ہو۔ پتا بھی ہے، اسی ہفتہ لسٹ دینا ہے۔'' صلیحہ نے کہا۔

''میری سٹوڈنٹس بہت تھوڑی ہیں۔ اس لیے پیپر آسانی سے چیک ہو گئے ہیں۔ اب صرف لسٹ بنانا باقی ہے۔ رات کو بستر میں گھس کر بناؤں گی۔'' راشدہ نے کہا۔

''فلاسفی پڑھانے کا یہ فائدہ تو ہے کہ اس کی طالبات تعداد میں بہت کم ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ پوری کلاس کے پرچے چیک کرنا پڑتے ہیں اور مرے کی لاش پر سو دُرّے یہ کہ لڑکیوں کی انگلش، مجھ ناچیز کی انگلش سے بہت بہتر ہے۔ پیپر دیکھتے ہی دِل 'باغ باغ' ہو جاتا ہے اور تمہیں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہوسٹل میں رہتی ہو۔ کیچڑ میں سَنی گلیوں اور سڑکوں کا تصور کر کے ہی، میری تو ٹانگوں میں اینٹھن ہونے لگتی ہے۔ بارش سے وابستہ ساری رومانیت ناک کے راستے نکل جاتی ہے۔'' سفیرہ نے جل کر کہا۔

''تمہاری بچیوں کی انگلش کی طرح، میرا بھی مسئلہ یہی ہے کہ میری طالبات کو ہسٹری آتی بہت ہے۔ اس لیے مجھے چکرا کر رکھ دیتی ہیں۔ پتا نہیں کہاں سے انھیں ایسی

معلومات دستیاب ہو جاتی ہیں جو آج تک مجھے ایم۔اے کرنے اور گولڈ میڈل حاصل کرنے کے باوجود نہ مل سکیں۔''

''اِدھر میری ایک سٹوڈنٹ نے پرچے کے آخر میں لکھا ہے 'مس میں Pol-Scientist بننا چاہتی ہوں میری مدد کیجیے۔' اور ویسے آذربائیجان کو آذربھائی جان لکھتی ہیں اور دوسری صاحبہ نے اس سوال کا جواب کہ امریکہ کا صدر، کتنی مدّت کے لیے چنا جاتا ہے کا جواب یوں دیا ہے۔

'امریکہ کا صدر دُنیا کا طاقتور ترین شخص ہے، اس لیے اس کے لیے کوئی خاص مدّت مقرر نہیں ہے جب وہ 'صدری' کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو الیکشن کے بعد، دوسرا صدر چن لیا جاتا ہے۔'' عتیقہ نے کہا۔

''لیکن میری طالبات بہت سمجھدار ہیں۔ سنو لکھتی ہیں۔

''پاکستان میں شعبۂ صنعت پر عمرانیات کے بہت اچھے اثرات مرتّب ہوئے ہیں۔ اس لیے مختلف اشیاء، جو ماضی میں دوسرے ممالک سے منگوائی جاتی تھیں، ان کے کارخانے اب پاکستان میں بھی قائم ہوگئے ہیں۔ مثلاً برف کے کارخانے۔'' نگار کھلکھلائی۔

''ایک دِن میں اپنی سٹوڈنٹس کو لائبریری لے گئی۔ میں، انھیں، دراوڑوں کی برصغیر میں آمد کے بارے میں، ذرا تفصیل سے نقشہ پر دکھانا چاہتی تھی۔

سری لنکا کے بارے میں بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ بھارت کے جنوب میں، یہ جو 'بوندسی' نظر آرہی ہے۔ یہ سری لنکا ہے۔ اب ایک علاّمہ نے پرچے میں لکھا ہے۔

'آریاؤں کے حملوں کی وجہ سے دراوڑ 'بوندسی' تک چلے گئے' کیسا ہے؟'' نگار نے کہا۔

''یوں تو صفحوں پر صفحے کالے کرتی چلی جاتی ہیں لیکن انتہائی کوشش کے باوجود اس میں سے ایک بات بھی ڈھنگ کی نہیں نکلتی۔ ایک لڑکی نے تو سوالیہ پرچہ ہی بار بار یوں

سجا سجا کر لکھا ہے کہ ایک نظر میں تو متاثر ہوئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔'' ربیعہ نے کہا۔

اِتنی دیر میں ثریا بی بی، چائے کی ٹرے اُٹھائے سٹاف روم میں داخل ہوئی تو ایک زوردار نعرہ گونجا۔

''ثریا بی بی زندہ باد، پاکستان پائندہ باد۔''

پاکستان پائندہ باد۔''

ثریا بی بی کے ہونٹوں پر مربیانہ مسکراہٹ جگمگائی۔

''مس جی، آج چوکیدار نے دولڑکوں کو بہت مارا۔ ان کے ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا۔'' ثریا بی بی کالج کا چلتا پھرتا اخبار تھی۔

''کیوں؟''

''وہ جی 'چیچو چیچ گنڈریاں' کھیل رہے تھے۔''

''اس میں مارنے والی کیا بات تھی؟ سردار خان کو بھی موقعہ چاہیے۔ کھیلنے دیتا بے چاروں کو۔''

''وہ جی جب چھٹی کے وقت، لڑکیاں اپنے گھروں کو جارہی تھیں تو وہ ان کی طرف اِشارہ کرکے کہہ رہے تھے۔

'چیچو چیچ گنڈریاں، دو تیریاں، دو میریاں۔'' (دو تمہاری، دو میری)

"لاحول ولا قوۃ"

ہنسی کا طوفان تھما تو مسز تصوّر نے میز پر پڑا ہوا، اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا نکالا اور کہنے لگیں۔

''ایک بار پھر لاحول ولا قوۃ۔۔۔ یہ دیکھیں، میرا خیال ہے، میاں نے ہمسائیوں کی چابیاں، بھی میرے پرس میں رکھ دی ہیں۔ آتے وقت، انھوں نے ہی گھر کو تالا لگایا تھا۔۔۔ بیٹی کی جرابیں بھی اسی میں سے مل رہی ہیں۔۔۔ اور یہ لیس تو بہت دِن ہوئے

گم ہوگئی تھی۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی تھی اور اب وہ خیر سے، میرے بیگ میں سے نکل رہی ہے۔

پھر انھوں نے بیگ میں سے ایک چھوٹا لفافہ نکالا، اس میں بھنے ہوئے چنے تھے۔ وہ تبرکاً، سب کو 'چکھنے' کے لیے دیے اور دوبارہ پرس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''لیکن۔۔۔ یہ ہیر برش تو میرا نہیں ہے۔ ضرور یہ چھوٹی بیٹی کی کارستانی ہے۔''

اس بار وہ تھوڑا تذبذب میں تھیں۔ اب انھوں نے پرس کو اندر باہر سے بغور دیکھا اور 'انکشاف' کیا کہ

''یہ پرس تو میرا نہیں ہے۔ یہ کس کا ہے؟''

'تفتیش' کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو 'دراصل' سفیرہ کا پرس کھولے بیٹھی تھیں اور مزے کی بات یہ کہ ان کا پرس، اس پرس سے ملتا جلتا بھی نہیں تھا۔

مسز تصوّر اکثر ایسے کام کیا کرتی تھیں اور یہ کہہ کر بری الذّمہ ہوجاتی تھیں۔

''بھئی کیا کریں، یہ ایک عالمی سچ ہے کہ پروفیسر لوگ بھلکڑ ہوتے ہیں۔ سو ہم بھی ہیں۔۔۔ اب کیا کیا جاسکتا ہے۔''

اور پھر بھلکڑ پن پر بات ہونے لگی۔

ربیعہ، ہنستے ہنستے کہنے لگی۔

''ایک بار میں اور مسز نصیر بازار جارہی تھیں۔ ایک صاحب کو دیکھ کر مسز نصیر کہنے لگیں۔

''دیکھو ربیعہ، یہ صاحب کچھ دیکھے دیکھے سے لگتے ہیں۔''

میں نے کہا۔

''مسز نصیر، یہ نصیر بھائی ہیں۔''

سٹاف روم قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

''مسز نصیر، یقین نہیں آتا۔۔۔ کیا واقعی؟''

''وہ دراصل ابھی نیا نیا معاملہ تھا نا!''

''کتنی دیر ہوئی تھی آپ کی شادی کو؟''

''نہیں، اب ایسا بھی نہیں ہے۔۔۔ وہ بیٹے کو سکول سے لے کر آرہے تھے۔''

مسز نصیر نے شرماتے ہوئے کہا۔

سٹاف روم ایک بار پھر قہقہوں کی زد میں تھا۔

''اور میں نے بھلا کیا کیا تھا؟ پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں، جب میں امّی کے ہاں گئی تو ایک دن بڑے اہتمام سے، بازار سے جلیل کے لیے کارڈ خرید کر لائی اور اس پر لکھا:

''I can't live with you.''

دراصل میں without لکھنا چاہتی تھی۔ جب جلیل کو یہ کارڈ ملا تو وہ اس 'انوکھے اظہارِ عشق' کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ خدا کا شکر ہے انھوں نے برا نہیں منایا، ورنہ بڑی مشکل ہوجاتی۔ دراصل وہ میری ایسی حرکات، کے عادی ہوچکے ہیں۔'' صلیحہ نے معافی کے انداز میں، کانوں کو چُھوتے ہوئے کہا۔

''اچھا بھئی، بس کرو، اپنی حماقتوں پر اتنا فخر مناسب نہیں ہے۔ ہمیں رزلٹ بھی دینا ہے۔'' مسز عالم نے سرزنش کی۔

سب لوگ، پھر سے پرچے دیکھنے لگے۔

''میری داستان تو بہت دُکھ بھری ہے مسز عالم، پلیز، سن لیجیے۔'' فاخرہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

مسز عالم نے پنسل میز پر رکھ دی اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

اسے اجازت نامہ سمجھتے ہوئے، باقی سب نے بھی پرچے رکھ دیے۔

''میں نے سوال کیا تھا کہ پہلا خلع کن کے درمیان واقع ہوا؟'' جواب ملا۔

'پہلا خلع مہاجرین اور انصار کے درمیان واقع ہوا۔'

''واہ واہ۔'' شیما نے داد دی۔

''ایک اور عقلمند کہتی ہیں،

'ہم لوگ مذہب سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر چہ یہ مملکت ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کی ہے۔ لیکن اِتنے سال گزر جانے کے بعد بھی، ہمارے چلن کافروں والے ہیں۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ملائیں تو پانی بنتا ہے، لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ہرگز ممکن نہیں، جب تک خالقِ دوجہاں کی رضا اس میں شامل نہ ہو۔ اس لیے یوں لکھنا چاہیے۔

'جب ہائیڈروجن اور آکسیجن ملائیں گے تو پانی بنے گا ان شاء اللہ۔'

'اب آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟' فاخرہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''بس، تم یہ کرو کہ ایک جملے کا اضافہ کر دو۔ کتنا پیارا پانی بنا ہے، ماشاء اللہ۔'' نگار نے جھٹ سے کہا۔

قہقہے بلند ہوئے۔ صلیحہ کو تو ہنستے ہنستے اچّھو لگ گیا۔

''سوال تھا،

'طہارتِ دل پر نوٹ لکھیں۔'

لکھتی ہیں:

'طہارت کرتے وقت بھی اگر دِل میں خوفِ خدا ہو تو اسے طہارتِ دِل کہتے ہیں۔'

''استغفر اللہ۔''

''پچھلے سال میری ایک سٹوڈنٹ نے بھی ایسی ہی خرافات لکھی تھیں، ظاہر ہے فیل ہو گئی۔ پھر اس نے مسز ظہیر کو درخواست دی۔

''جنابہ ہیڈ مسٹرس صاحبہ

مؤدبانہ گزارش ہے کہ میں نے 'ناکافی' محنت کی تھی، پھر بھی مجھے فیل کر دیا گیا ہے۔''

''دراصل یہ فیل کبھی بھی نہیں ہوتیں۔ ان کے پیپر بھی ہمیشہ 'بہت اچھے' ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں کسی 'بیرونی سازش' کے تحت فیل کر دیا جاتا ہے۔ امریکہ یا اسرائیل کی سازش۔''

''چلو صغرا، اب تمہاری باری ہے۔ آخر مطالعہ پاکستان میں بھی تو کچھ عقل کی باتیں لکھی ہوں گی۔''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ سنیے۔''

''صغرا نے اپنے سامنے پڑے ہوئے پرچوں کے ڈھیر میں سے ایک پرچہ نکالا اور پڑھنے لگی۔

''جب برصغیر تقسیم ہوا تو ہندو اور مسلمان ایک ہی ٹرین میں سوار ہو گئے اور آپس میں لڑ لڑ کر مر گئے۔ تب سے دوقومی نظریہ کا رواج ہو گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں اس لیے انھیں الگ الگ ٹرینوں میں سوار ہونا چاہیے۔''

''ہائے، میں مر جاواں۔'' شہلا کراہی۔

''رُکو۔۔۔ رُکو۔۔۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔'' صغرا نے کہا۔

''اور یہ کہ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی۔۔۔ بس تم سنتی جاؤ۔'' شیما نے کہا۔

''سوال تھا، نہرو رپورٹ کے بارے میں آپ کیا جانتی ہیں؟'' جواب ان کا آیا۔

'پنڈت نہرو نے نہر سویز کے کنارے جو قرارداد پیش کی، اسے نہرو رپورٹ کہتے ہیں۔'

سب نے تالیاں بجائیں۔

''اب عجو کی باری ہے۔ عجو ڈارلنگ کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں، آج عجو غزل سرا نہ ہوئی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے میری لڑکیوں میں Talent نہیں ہے؟ میں نے نیٹ بال کے چھ کھلاڑیوں کے نام لکھنے کو کہا تھا، ایک صاحبہ نے بڑی آسانی سے یوں لکھے ہیں:

۱۔ پہلا کھلاڑی ۲۔ دوسرا کھلاڑی ۳۔ تیسرا کھلاڑی

۴۔ چوتھا کھلاڑی ۵۔ پانچواں کھلاڑی ۶۔ چھٹا کھلاڑی''

بجّو نے گلے میں لٹکی ہوئی سیٹی بجائی اور اُنگلی کھڑی کر دی۔

''اگر نیٹ بال کے بیس کھلاڑی بھی ہوتے تو ان کے لیے کیا مشکل تھا۔ موصوفہ کو کونسی گنتی نہیں آتی۔''

''مس مہ جبیں سے تو پوچھنے کی جرأت، ہم لوگ نہیں کر سکتے، اس لیے ثمینہ تم ہی کچھ اُردو ادب کی کہانی کہو۔''

''کیا کہوں۔۔۔ کیا نہ کہوں۔۔۔ ہماری قومی زبان بے چاری، تو ان ظالموں کے ہاتھوں میں بلبلا رہی ہے۔ جملے ایسے بناتی ہیں کہ دِل اُتھل پتھل ہونے لگتا ہے۔ میری ایک عزیز از جان طالبہ نے 'اِبتلا' کا جملہ یوں بنایا ہے۔

'میں گھر جا رہی تھی کہ جھاڑیوں کے پاس مجھے ایک اِبتلا پڑا ہوا ملا۔''

اور والد صاحب کو خط لکھتی ہیں، ذرا القاب ملاحظہ ہو:

'میرے نامی گرامی والد صاحب۔'

اور 'بغلیں جھانکنے' کا جملہ بناتے ہوئے تو ساری حدیں پھلانگ گئی ہیں۔'

'میں غسل خانے میں نہاتے ہوئے، اپنی بغلیں جھانکتی ہوں۔'

''بدتمیز''

''کون؟ میں یا یہ لڑکی؟۔۔۔ اور ڈھٹائی دیکھو، آخر میں یہ لکھا ہے۔

'مس پلیز، مجھے پاس کر دیں۔ میری شادی ہونے والی ہے۔'

''کر دو پاس بے چاری کو۔۔۔ اس کا 'دوسرا' امتحان شروع ہونے والا ہے۔''

''رافعہ تم کیا کہتی ہو، تمہاری لڑکیوں میں 'سمجھ دانی' نہیں ہے کیا؟''

''ان کی 'سمجھ دانی' تو بہت ہی بڑی ہے لیکن میں ابھی تک اس سے مستفیض نہیں ہو سکی۔ کیونکہ میں نے ابھی تک پیپرز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔''

''کیوں؟ اچھا، اچھا، تم ہمارے بھائی صاحب کی خاطر مدارات میں جتی رہی ہو گی، چھٹیوں میں۔''

ثمینہ، اسے اس معاملے میں کبھی معاف نہیں کرتی تھی۔

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میرا دِل ہی نہیں چاہتا، لاکھ کوشش کے باوجود میں خود کو ابھی تک آمادہ نہیں کر سکی اور میرا یہ مسئلہ دِن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہمارے پروفیشن کا یہ سب سے برا حصہ ہے۔'' رافعہ نے جواب دیا۔

''مایوس مت ہو جانِ جگر، میں ایک بزرگ کو جانتی ہوں، وہ اِن لکچررز کو جو پیپر چیک کرنے سے جان چراتی ہیں، تعویز بنا دیتے ہیں۔ میں تمہیں لے چلوں گی۔ شفا من جانب اللہ ہے لیکن علاج کرانا بھی تو سنّت ہے اور پھر وہ مایوس حضرات جو ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی طریقہ علاج سے تنگ آ چکے ہوں، ان کے لیے آخری اُمید، رُوحانی علاج ہے۔ جیسے۔۔۔'' نگار بہت سنجیدہ تھی۔

''رُکو۔۔۔ رُکو۔۔۔ نگار۔۔۔ فل سٹاپ۔۔۔ فل سٹاپ۔'' شہلا نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

''خدایا میں کدھر چلی جاؤں؟'' صفیہ جو ایک کونے میں بیٹھی پیپر چیک کر رہی تھی، نے چلّا کر سر پکڑ لیا۔

''صبر کرو، میری بہن، اور کہیں بھی مت جاؤ، بس دِل تھام کر باقی کا پرچہ بھی چیک کر لو۔''

ع ''میں باز آئی محبت سے سنبھالو پاندان اپنا۔''

صفیہ نے پیپر، میز پر پٹختے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے اب چلتے ہیں۔ باقی ماندہ 'عقل کی پڑیاں' اب کل کھولیں گے۔''

سفیرہ نے بیگ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ باقی سب نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔

"جلدی سے کھانا لگاؤ یار، مجھے گاجر کا حلوہ بہت یاد آ رہا ہے۔" نگار نے ہاسٹل کی جانب چلتے ہوئے بے تابی سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اور تم کس مرض کی دوا ہو؟ بس حکم چلانا آتا ہے۔ تم سردار خان کو کہو کہ گرم گرم نان لا دے اور واپس آ کر برتن لگاؤ، میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" شہلا نے بے رحمی سے کہا۔

"اور یہ شیما تمھاری لاڈلی کب سے ہو گئی ہے؟ اسے کوئی کام نہیں کہہ رہیں۔" نگار نے شیما کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

"وہ بالکل بھی لاڈلی نہیں ہے نگار بانو، تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کھانا اسی نے بنایا ہے۔"

نگار، نان لے کر واپس آئی تو میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ خوش رنگ اور اِشتہا انگیز خوشبو والی چکن کڑاہی، ساتھ میں سلاد اور رائتہ۔

نگار نے پہلے ہی نوالے کے بعد قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ کھانا واقعی، اِتنا مزے کا تھا کہ جلد ہی ختم ہو گیا۔

نگار نے شیما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے حبیبِ عنبر دست، ذرا ڈونگہ تو اِدھر بڑھانا۔"

ڈونگے میں بمشکل دو نوالوں کے لیے سالن موجود تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا، انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا تو سالن کو پلیٹ میں نکال کر نان لینا چاہا مگر وہ بھی ندارد تھا۔ ایک چھوٹا ٹکڑا، شہلا کے ہاتھ میں تھا۔ نگار نے وہ اُچک لیا اور تان اُڑائی۔

ع "تیرا 'نان' ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے"

"تمھاری اس بے وقت کی راگنی کا مطلب؟" شہلا نے چڑ کر کہا۔

"شہلا ڈارلنگ، یہ 'بے وقت' کی نہیں 'عین' وقت کی راگنی ہے۔ تمھیں پتا ہے کہ

'پیٹ نہ پیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں'

نگار نے ڈھٹائی سے کہا۔

"اور یہ کہ 'روٹی تو بہر طور کما کھائے مچھندر'"

کھانا کھا کر، انھوں نے بمشکل برتن اُٹھا کر کچن میں رکھے اور رضائیوں میں دُبک گئیں۔ پاؤں سردی سے جمنے والے ہو رہے تھے، اس لیے وہ بھلا بیٹھی تھیں کہ ابھی پرچوں کے پلندے ان کے سروں پر سوار ہیں۔

اور پھر اتنی گہری نیند سوئیں کہ شام کی چائے بھی دیر سے پی گئی۔

منوّر خاتون، ان دِنوں پھر بیمار تھیں۔ اس لیے ان کی ڈیوٹی، ہاسٹل میں مقیم لکچررز، مل بانٹ کر کرتی تھیں۔ اس وقت، شیما ہاسٹل کا راؤنڈ لینے چلی گئی۔ ڈارمیٹری کے ایک کونے میں دیوار پر موٹا موٹا لکھا تھا۔

'Lover's Point۔۔۔ اے محبت زندہ باد' اسے مٹانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن چونے کے اُکھڑ جانے پر بھی وہ صاف نظر آ رہا تھا۔

شیما نے پوچھا۔

"اس کونے میں کس کی چارپائیاں ہیں؟"

"مس یہ رول نمبر 37 اور 146 کی ہیں۔"

"وہ خود کہاں ہیں؟"

"جی، وہ باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہیں۔"

"اس سردی میں؟" یخ ٹھنڈی ہوا، برآمدوں میں شائیں شائیں کر رہی تھی۔ شیما سویٹر پہننے اور شال اوڑھنے کے باوجود کپکپا رہی تھی۔

"اور یہ کس نے لکھا ہے؟"

"معلوم نہیں مس، کس نے لکھا ہے۔ یہ اس وقت لکھا گیا جب وہ دونوں سو رہی تھیں۔"

"ایک ہی چارپائی پر۔۔۔" پیچھے سے آواز آئی۔

لڑکیاں، دبی دبی آواز میں ہنسنے لگیں۔

شیما کی نگاہوں میں مشن سکول کی ڈارمیٹری گھوم گئی۔ بوا پیاری کا کھیل، جو اس وقت اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اب عمر کے ساتھ اور نفسیات پڑھنے سے اسے جان تو گئی تھی۔ لیکن وہ یہ فیصلہ کر نہیں پا رہی تھی کہ اس مسئلہ پر ان دونوں سے بات کیسے کرے؟

واپس آ کر، اس نے باقی لوگوں کو بتایا تو نگار کہنے لگی۔

''اویارا ع ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے'' پرسوں جب صبح اسمبلی کی گھنٹی ہونے سے پہلے میں ہاسٹل کو تالا لگوانے گئی تو فرسٹ ایئر کی ایک پیاری سی لڑکی نے اپنی 'باجی جان' جو فورتھ ایئر کی سٹوڈنٹ ہے، کا بستر بنایا۔ کالج سے واپس آ کر تبدیل کرنے کے لیے کپڑے استری کیے اور پھر لچکتی، شرماتی ہوئی اس کے لیے، کچن سے چائے کا کپ لے کر آئی تو 'باجی جان' نے ایسی 'عاشقانہ' نظر اس پر ڈالی کہ میں پگھل کر رہ گئی۔''

''نا۔۔۔ یہ تم کس سلسلے میں پگھل گئیں؟'' ثوبیہ نے ڈپٹ کر کہا۔

''اس لیے کہ میں بے چاری کنواری کنیا، ان معاملات میں سے گزری جو نہیں ہوں۔'' نگار نے اپنے دوپٹے کا کونہ اُنگلی پر لپیٹتے ہوئے، شرما کر کہا۔

''گزرنا بھی مت، یہ بہت 'اوکھے پینڈے' ہیں۔ اور یوں بھی وزارتِ عشق نے تنبیہ کی ہے کہ پیار مضرِ صحت ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''نہیں یار، میں تو سنجیدگی سے اس معاملے پر غور کر رہی ہوں۔ یہ روزانہ کپڑے اِستری کرنے سے تو نجات ملے گی اور وہ جو کہتے ہیں پان پرائی کے ہاتھ کا تو پھر چائے کا بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ ہونا چاہیے۔''

''اچھا تو تم 'باجی جان' بنو گی۔ واہ۔''

''بالکل بالکل۔۔۔ میرا دماغ خراب ہے کہ دو لوگوں کے کپڑے اِستری کروں۔ میں تو اپنے ہی کرنے سے بیزار ہوں۔''

ابھی یہ لوگ پیپر دیکھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھیں کہ بجلی بند ہو گئی۔ اب سوائے اس کے کہ وہ بستروں میں گھس جاتیں، ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ نگار نے گانا گانا شروع کیا۔ ''کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟۔۔۔ کیوں اندھیری؟۔۔۔ ہاں ہاں اندھیری۔۔۔ ارے واہ واہ اندھیری۔۔۔ آہ آہ اندھیری۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ کیوں؟''

''خدا کے لیے یہ قوالی بند کرو۔ نگار آخر تمہارا بچپنا کب جائے گا؟'' شہلا سوئی آواز میں کراہی۔

''نا۔۔۔ یہ قوالی بچپن میں کی جاتی ہے کیا؟ تم شاید جانتی نہیں کہ دُنیائے موسیقی میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔ کیوں اندھیری؟۔۔۔ ہاں ہاں کیوں اندھیری۔۔۔؟''

''نگار کبھی کبھار تو تم زِچ کر دیتی ہو قسم سے۔''

شیما نے نگار کو ڈانٹا۔

OOO

حصّہ چہارم

کالج میں ویمن گارڈز کی پاسنگ آؤٹ پریڈ ہونے والی تھی۔کالج سے متعلّقہ تقریبات کو خواتین کے کالجز میں عام طور پر بے دلی سے نہیں نبایا جاتا۔پرنسپل، اساتذہ اور طالبات سبھی بہت جی جان سے ان کی تیاری کرتی ہیں اور اس کالج میں تو تھوڑی طالبات اور کم سٹاف ممبران کی وجہ سے، ماحول ایک چھوٹے کنبے کا سا تھا۔اس موقعہ پر بھی بہت گہما گہمی تھی۔سبھی اپنی اپنی ڈیوٹی میں مصروف تھیں۔سوائے چند ایک کے جو عادتاً ہر بات میں بیزاری کا اظہار ضروری سمجھتی تھیں، بہت خوشی اور جوش وخروش سے تیاریاں کی جارہی تھیں۔

فنکشن کی تیاریوں کے ساتھ ہی ساتھ، سٹاف ممبران نئے سوٹ، میچنگ جوتوں اور پرس وغیرہ کی خریداری میں بھی مصروف تھیں۔سٹاف روم میں چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے، کام کے ساتھ ساتھ ان پر بھی گفتگو جاری رہتی۔

نگار سٹاف روم میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں دو لپ سٹکس تھیں۔وہ اپنے مخصوص انداز میں سب سے مخاطب ہوئی۔

''خواتین وخواتین۔۔۔آپ دیکھ رہی ہیں کہ میرے ہاتھ میں دو لپ سٹکس ہیں۔

آپ کو بتاتی چلوں کہ میں انہیں ابھی رات ہی خرید کر لائی ہوں۔ ایک کا شیڈ گہرا عنابی ہے اور دوسری کا ہلکا براؤن۔۔۔ لیکن میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پائی کہ اس روز کون سی استعمال کروں؟۔۔۔ اگر D.C صاحب اچھی پرسنیلٹی کے مالک ہوئے تو گہرا شیڈ لگاؤں گی اور اگر 'ماٹھی' سی شخصیت ہوئی تو ہلکا براؤن ٹھیک رہے گا۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟''

''ایک تو D.C کا کنوارا ہونا مصیبت ہو گیا، خیر سے شیڈ ہی کا فیصلہ نہیں ہو پا رہا۔'' ربیعہ کہنے لگی۔

شیما ویمن گارڈ انچارج تھی، اس لیے تقریب کا 'آنکھوں دیکھا حال' بیان کرنا، اس کی ذمّہ داری تھی، اس وقت، وہ اسی کی مشق کر رہی تھی۔ اس نے کاغذات پر سے سر اُٹھا کر کہا۔

''میرا خیال ہے تم ایک ہونٹ پر گہرا اور دوسرے پر ہلکا شیڈ لگا لینا کیونکہ پہلے D.C صاحب کو دیکھنا اور یہ فیصلہ کرنا کہ کیسی شخصیت ہے اور پھر لپ اسٹک لگانا۔۔۔ عین وقت پر، کافی مشکل ہوگا۔ تمہارے لیے۔''

''تم سے کسی ڈھنگ کی بات کی توقّع کرنا، فضول ہے۔'' نگار نے منہ بنا کر کہا۔

اتنے میں ثریا بی بی نے شیما کے پاس آ کر کہا کہ اسے اور نگار کو پرنسپل صاحبہ بلا رہی ہیں۔

پرنسپل صاحبہ نے بتایا کہ صبح کی تقریب کے حوالے سے کوئی اخباری نمائندہ ملنا چاہتا ہے۔

اس سے پہلے، مختلف اخباروں کے نمائندے آ چکے تھے۔

''آئے۔۔۔ ہائے۔ اب یہ کون ذاتِ شریف باقی ہیں؟'' نگار بڑبڑائی۔

ملاقاتیوں کے لیے مخصوص کمرے میں، ایک عجیب الخلقت 'چیز' ان کی منتظر تھی۔ سفید قمیض، سفید پتلون، سفید جوتوں اور سیاہ چشمے سے مزیّن۔۔۔ جب کہ سیاہ چشمے پر سنہرا

Sticker جگمگا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ کی چھنگلی کے ناخن پر، تازہ تازہ لگی ہوئی سرخ نیل پالش نمایاں تھی۔ اور 'فرطِ جذبات' یا سردی سے ہاتھ ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

سلام، دعا اور خیریت معلوم کرنے کے بعد انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔

''میڈم، میرا نام دُرِّبدر چغتائی ہے۔ میں روزنامہ 'صدائے صحرا' کا نمائندہ ہوں اور صبح ہونے والی تقریب کے حوالے سے حاضر ہوا ہوں۔'' آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

''جی۔۔۔ جی۔ دربدر صاحب، بہت شکریہ لیکن یہاں تو کوئی صحرا، سرے سے موجود ہی نہیں، جس کی صدا آپ قلم بند کریں گے۔''

نگار کے چہرے پر مخصوص 'شیطانی' مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''میڈم۔۔۔ دُرِّبدر۔۔۔ اور میں صبح کی تقریب کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''جی۔۔۔ جی ردّوبدل صاحب۔ آپ کہیے، میں ہمہ تن 'خرگوش' ہوں۔''

''میڈم، گوش'' اس بار چغتائی صاحب نے اپنے نام کی تصحیح نہیں کی لیکن ان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''خالی گوش؟ چلئے آپ کہتے ہیں تو یوں ہی سہی۔ جی میں گوش ہوں، آپ کہیے۔'' نگار چہکی۔

شیما کے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''تقریب صبح ٹھیک دس بجے شروع ہوگی تو مجھے یہاں کس وقت پہنچنا ہوگا؟ اور کیا میرے لیے نشست مخصوص ہوگی؟ میرا مطلب ہے پریس والوں کے لیے۔''

''جی آپ ٹھیک 'ساڑھے دس بجے' یہاں پہنچ جائیے گا اور بیٹھیں گے تو آپ اپنی نشست پر ہی لیکن آپ کو محسوس یوں ہوگا گویا ہم نے آپ کو اپنے سر پر بٹھا رکھا ہے۔'' نگار کے منہ سے محبّت کا شیرہ ٹپک رہا تھا۔

''جی۔۔۔جی ان شاء اللہ'' دُرّیدر چغتائی نے شرماتے ہوئے کہا۔

''اورا، ب مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' نگار کھلی پڑ رہی تھی۔

''فرمایئے؟''

''یہ بدایونی حضرات کا تعلق بدایون سے اور شیرازی حضرات کا، شیراز سے ہوتا ہے۔آپ کا تعلق چغت۔۔۔؟''

شیما زور سے کھنکاری لیکن نگار بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔

''اور یہ سیاہ چشمہ۔۔۔آپ کی سفید چھڑی کہاں ہے؟''

شیما نے اسے گھورا۔

''کیا بات ہے مس شیما؟ آپ مجھے گھور کیوں رہی ہیں؟''

نگار نے ناگواری سے کہا۔

(اس کمبخت کو تو کچھ کہنا بے کار ہے)

''نگار، تم سے بھی، کسی ڈھنگ کی بات کی توقّع کرنا فضول ہے۔''

شیما نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

OO

جمعہ کے روز، فلیگ والی گاڑی سے D.C صاحب نکلے۔سفید جھک شرٹ، ہلکا گرے سوٹ، گہری میرون ٹائی، سنہری فریم کی عینک۔۔۔سلیقے سے جمے ہوئے بال اور چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔۔۔

شیما نے اعلان کیا۔

''خواتین و حضرات اور عزیز طالبات۔۔۔مہمانِ خصوصی تشریف لا چکے ہیں۔''

پھر اس کا دل چاہا کہ بھاگ کر جائے اور نگار سے کہے کہ عنابی لپ اسٹک لگا لے اور خود ہی اس خیال سے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

اوائل مارچ کا چمکیلا دن۔۔۔درختوں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔گراؤنڈ کے اردگرد لگے Sweet peas کے پھول، فضا کو رنگین بناتے ہوئے خمار آلود خوشبو، بکھیر رہے تھے۔

''وطن کی مٹّی گواہ رہنا۔۔۔وطن کی مٹّی عظیم ہے تو، عظیم تر ہم بنا رہے ہیں۔۔۔ وطن کی مٹّی گواہ رہنا۔''

بینڈ کی دھن کے ساتھ ساتھ اناؤنسمنٹ کرتے ہوئے، شیما کو اچانک احساس ہوا کہ سنہری فریم سے جھانکتی نگاہیں، اس پر جمی ہوئی ہیں۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی، کیونکہ اس وقت سب ہی، اس کی طرف متوجہ تھے، لیکن وہ ان مخصوص نگاہوں کی تمازت کو، اپنے چہرے پر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

پرنسپل صاحبہ نے تالیوں کی گونج میں، کالج کی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد D.C صاحب کو خطاب کرنا تھا۔

''میں، نظیف ہارون، آپ سب کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے، اپنے کالج کی اتنی خوبصورت تقریب میں، مجھے مدعو کیا۔''

شستہ لہجہ، بھاری آواز، بیوروکریٹس کا مخصوص دبدبہ، شیما نے سوچا نگار تو دل تھام کر رہ گئی ہوگی۔

پریڈ کے اختتام پر، تقسیم انعامات کے وقت، شیما، پرنسپل صاحبہ کے ساتھ سٹیج پر موجود تھی۔ D.C صاحب بچّیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے، کچھ نہ کچھ کہتے ہوئے انعامات دے رہے تھے۔ آخر میں انچارج ویمن گارڈز کا انعام لینے کے لیے، شیما ان کے سامنے آئی تو انہوں نے اس پر اچٹتی ہوئی ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''تقریب بہت اچھی تھی۔ آپ انعام کی مستحق ہیں۔''

شیما نے مسکراتے ہوئے، شکریہ تو کہہ دیا لیکن وہ لڑکھڑا سی گئی۔ بظاہر اچٹتی ہوئی،

اس نگاہ میں بہت کچھ تھا، جسے شیما سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

جب مہمان اور اساتذہ، D.C. صاحب کے ساتھ چائے پینے کے لیے، ہال میں اکٹھے ہوئے تو D.C. صاحب نے، صرف چائے کی پیالی لی۔ اور اسے تھامے ہوئے تمام سٹاف ممبران سے ملاقات کرتے رہے۔ شیما کے پاس آئے تو اس کے مضمون کے بارے میں پوچھا اور کہنے لگے۔

''نفسیات صرف پڑھاتی ہیں یا انسانی نفسیات کو سمجھتی بھی ہیں؟''

پرنسپل صاحبہ، شیما کی کارکردگی سے بہت متاثر تھیں۔ اس لیے، اس کے لیے رطب اللّسان تھیں۔

''مس شیما بہت اچھی استاد ہیں اور طالبات میں مقبول بھی بہت ہیں۔'' پرنسپل صاحبہ کا انداز مشفقانہ تھا۔

''میں اندازہ کرسکتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے، وہ آگے بڑھ گئے۔

تقریب کی کامیابی کی خوشی میں، پرنسپل صاحبہ نے اگلے روز کی چھٹی دے دی۔ اتوار کو ملا کر کُل دو چھٹیاں ہوگئیں۔

سٹاف میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اس طرح، مصروفیت کی وجہ سے ہونے والی تھکن اُتارنے کا سامان ہوگیا تھا۔ ہاسٹل میں رہنے والی طالبات اور سٹاف ممبرز، فوری طور پر گھروں کو روانہ ہوگئیں۔

دو دن، شیما نے گھر میں گزارے، ہمیشہ کی طرح خوش و خرم، اماں، ابا میاں، آئمہ اور سرمد کے ساتھ۔۔۔ لیکن 'وہ' نگاہیں، تصوّر میں، مستقلاً اس کا پیچھا کرتی رہیں۔

سوموار کو کالج میں سارا دن، گذشتہ تقریب کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔

سٹاف روم میں ہر طرف 'ہائے ہائے' ہو رہی تھی۔

D.C صاحب یوں، D.C صاحب دوں۔۔۔

ربیعہ کہنے لگی۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ موصوف ابھی تک کنوارے کیوں ہیں؟ اس قدر ہینڈسم، مہذب اور سب سے بڑھ کر، ان کا D.C ہونا۔''

''تم سمجھنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ یہ معرفت کی باتیں ہیں۔'' نگار چہکی ''اور اگر بے چارے بیاہے ہوئے ہوتے تو تب بھی تمہیں ہی اعتراض ہوتا کہ اب، انہیں یہاں تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تم اپنی کہو نگار، تم نے کون سی لپ اسٹک لگائی تھی؟ میں مصروف تھی، دیکھ ہی نہیں سکی۔'' شیما نے پوچھا۔

''ظاہر ہے گہری عنابی۔۔۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس سے بھی گہرا شیڈ کیوں نہ لیا؟'' مصنوعی ملال، نگار کے چہرے سے ٹپک رہا تھا۔

''بس کرو۔۔۔ بس کرو۔۔۔ نگار، وہ یہاں بَر دکھوے کے لیے نہیں آئے تھے اور یوں بھی وہ اس سے پہلے، بہت سے کالجوں میں جاچکے ہوں گے۔ اگر ان کا 'نصیب' کسی کالج میں ہی 'کھلنا' لکھا ہوتا تو اب تک ولیمہ ہوچکا ہوتا۔'' راشدہ کہنے لگی۔

صلیحہ کی ڈیوٹی چائے پر تھی۔ وہ جلی بیٹھی تھی۔

''یہ لوگ بنتے بہت ہیں۔۔۔ خالی چائے کی پیالی لیے گھومتے رہے۔۔۔ ہنہ''

''اور یہ بھی نہ سوچا کہ صلیحہ نے کتنی محنت کی تھی۔۔۔ چہ۔۔۔ چہ۔۔۔ چہ'' ربیعہ نے کہا۔

''چپ ہو جاؤ ربیعہ۔۔۔ ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گی۔۔۔ میں بہت غصّے میں ہوں۔'' صلیحہ پھنکاری۔

''قتل کرو اسے، جس نے تمہاری ڈشز کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔۔۔

یہ میرا قتل کس سلسلے میں؟"

بریک ختم ہوئی تو شیما کلاس لینے چلی گئی۔ابھی بمشکل رول کال ہی لے پائی تھی کہ چوکیدار نے آنے کی اجازت چاہی۔

"مس صاحبہ یہ آپ کی ڈاک ہے۔"

خاکی رنگ کا لفافہ۔۔۔D.C آفس کی مہر والا۔

شیما حیران سی رہ گئی۔ بڑی خوبصورت لکھائی میں لکھا تھا۔

؎ تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت ، کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں ، جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم ، وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو؟؟؟

شیما بری طرح گھبرا گئی۔ اُلٹی سیدھی کلاس لی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔اس کلاس کے بعد وہ فارغ تھی۔باقی سب ابھی کالج میں ہی تھیں۔کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے دروازہ بند کیا اور پرس میں سے وہ لفافہ نکالا؟؟؟ کا مطلب تو سمجھ میں آ گیا تھا لیکن یہ سب کیا ہے؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ چند روز کے بعد ویسا ہی ایک اور لفافہ اسے ڈاک سے ملا۔لکھا تھا:

I care not for the stars that shine, — (مجھے چمکیلے ستاروں کی پرواہ نہیں ہے
I dare not hope to ever be thine, — اور نہ ہی یہ اُمید کہ کبھی تمہارا ہو سکوں گا
I only know, I love you, — مَیں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے تم سے پیار ہے۔
Love me and the world will be mine. — تم بھی مجھ سے پیار کرو تو یہ دُنیا میری ہو جائے)

پہلا خط موصول ہونے کے کوئی دس دن بعد، کالج کے فون پر اس کے لیے کال آئی۔ ہیڈ کلرک صاحب خود بھاگے چلے آئے۔

"مس صاحبہ، آپ کے لیے فون ہے۔"

شیما فوراً اُٹھ کر ان کے ساتھ چل دی۔آفس تک پہنچنے میں، انہوں نے بتایا کہ D.C. صاحب کے P.A. کا فون ہے۔

(اچھا تو یہ صاحب ہیں، وہ خط بھیجنے والے۔۔۔ابھی ان کی طبیعت صاف کرتی ہوں۔۔۔شیما نے دل ہی دل میں، بہادری کا مظاہرہ کیا)

شیما نے فون اُٹھایا تو دوسری طرف سے، بہت مؤدب سی آواز آئی۔

"میں D.C. صاحب کا P.A. عرض کر رہا ہوں۔ D.C. صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"مجھ سے؟"

"جی ہاں۔۔۔مس شیما رحمٰن۔۔۔لکچرر سائیکالوجی۔۔۔آپ ہی ہیں نا!"

شیما کا دل چاہا کہ فون چھوڑ چھاڑ کر، بھاگ جائے۔

دوسری طرف سے، بھاری بھرکم آواز آئی۔

"میں نظیف ہارون بول رہا ہوں۔۔۔میرے خط آپ کو مل گئے ہوں گے۔اس جسارت کی معافی چاہتا ہوں۔۔۔میں بہت پہلے بات کرتا، لیکن میں آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا تھا۔مس شیما۔۔۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ مناسب نہیں ہے لیکن کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ میری زندگی کی ہم سفر بن جائیں؟"

"جی؟۔۔۔جی!۔۔۔میں کیا کہہ سکتی ہوں؟"

شیما کی تمام تر خود اعتمادی، بھک سے اُڑ گئی۔سٹیج پر چڑھ کر دھواں دار تقریریں کرنے والی۔۔۔دوستوں کی محفل میں چہکنے والی شیما۔۔۔کالج میں ٹی بریک میں سب جس کا انتظار کرتے۔جو خوبصورت گفتگو پر قادر تھی، گنگ ہو کر رہ گئی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔اگر آپ کچھ نہیں کہہ سکتیں تو مجھے کہنے کا موقعہ دیجئے۔میں آج

ہی، پروفیسر رحمان صاحب سے بات کروں گا۔'' دبی دبی ہنسی کے ساتھ، فون بند ہوگیا۔

شیما نے اِدھر اُدھر دیکھا۔۔۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ہیڈ کلرک صاحب، کب کے جا چکے تھے۔

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی، ہاسٹل میں اپنے کمرے میں آ گئی اور رلائی میں ایسا دبکی کہ شام تک منہ باہر نہ نکالا، بس پڑی کپکپاتی رہی۔۔۔ اس نے اپنی سوچ کا تجزیہ کیا۔۔۔ وہ حیران تھی۔۔۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی، جیسا کہ ایسے موقعے پر کوئی بھی لڑکی ہو سکتی ہے۔۔۔ لیکن وہ پریشان نہیں تھی۔۔۔ کیوں؟ کیونکہ پچھلے دس دن سے وہ خط، اس کے دل کو گدگداتے رہے تھے۔۔۔ وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتی۔۔۔ گہری سوچ میں۔۔۔ وہ کوئی سولہ سال کی لڑکی نہیں تھی، جو فلمی ہیروئن کی طرح ان خطوط کو اُٹھا کر ہاسٹل کے برآمدوں میں گاتی اور ناچتی پھرتی۔۔۔ لیکن وہ ایک لڑکی ضرور تھی اور عمر کے اس حصّے میں تھی، جب آنے والے لمحات کے تصوّر سے ہی گالوں میں مہتابیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں۔ اس کے پپوٹوں کی لرزش اور لبوں کی جنبش کچھ اور ہی قصہ سناتی تھی۔ جس کا تعلق براہ راست، دِل کے تاروں سے تھا۔

سٹاف روم میں وہ بہت محتاط رہتی تا کہ جن کیفیات سے وہ گزر رہی تھی، کوئی انہیں جان نہ جائے لیکن پھر بھی نگار بھانپ ہی گئی۔ کہنے لگی۔

''کس قدر ظلم ہے۔۔۔ دہائی خدا کی۔۔۔ لپ اسٹک میں میچ کرتی رہی اور ادھر شیما گئی کام سے۔''

''اونہہ۔۔۔ سٹاف روم میں ایسی گفتگو سے پرہیز کریں اور خاموشی سے اچھے بچوں کی طرح اپنی چائے ختم کریں۔'' شہلا نے حد درجہ سنجیدگی سے کہا۔ ''کمرے میں چل کر تفتیش کا سلسلہ شروع کریں گے۔''

''کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟'' شیما چور سی بن گئی۔

''نہ۔۔۔ نہ۔ میری جان۔۔۔ پریشان کیوں ہوگئیں۔۔۔ تم نے تو کچھ نہیں

کیا۔ ہاں البتہ تمہیں

ع دیوانہ کر دیا ہے دلِ بے اختیار نے

اور یہ کہ

ے کیوں اُداس پھرتے ہو، سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں

مزید برآں یہ کہ۔۔۔''

''اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ بس کرو نگار میں جانتی ہوں تمہیں بروقت چپ کروانے کا طریقہ، ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔۔۔ پھر بھی۔۔۔'' شہلا نے گھورا۔

''ویسے شیما تمھارے 'موجودہ حالات زندگی' پر مبنی ایک نظم میں نے رات کو کہی ہے۔ کمرے میں چلو، سناتی ہوں۔

تارے گننا
کلیاں رہنا
ہر پل تینوں سوچدیاں رہنا
کُجھ نہ کھانا، کُجھ نہ پینا
تیری فکر چ گھلدیاں رہنا
بے آسی وچ آس جگا کے
پانی دے وچ دیوا دھریا
کیہ کیہ آکھاں ل کے تینوں
سوچ سوچ کے سبھ کُجھ رکھنا
جے کدھرے مل جاویں سجنا
آکھ نہ سکنا جھکدیاں رہنا

OO

جمعہ کی شام کو امّاں کا فون آیا کہ اس ویک اینڈ پر گھر ضرور آنا۔ وہ ویسے بھی، گھر جانے والی تھی لیکن اماں کے فون سے کھٹک گئی۔

(تو کیا پروفیسر رحمان صاحب سے بات ہو گئی؟ خدایا یہ کیا ہو رہا ہے؟)

ہر چھوٹی سے چھوٹی بات، وہ نگار اور شہلا سے شیئر کرتی تھی لیکن یہ بات ہی ایسی تھی کہ ان سے کچھ کہنا تو دور کی بات تھی، وہ تو خود سے بھی چھپا رہی تھی۔ کسی کے بارے میں، ایک دن میں، اپنے سے زیادہ سوچنا محبت ہے؟ تو پھر؟ شیما نے ایسا ہی تو کیا تھا۔

گھر پہنچی تو آئمہ کی ہنسی روکے نہیں رُک رہی تھی۔

اس کی بادامی آنکھوں میں، ستارے ناچ رہے تھے۔

''اپیا۔۔۔ایک بات کہوں؟''

''ہوں۔۔۔کہو؟''

''اپیا۔۔۔بات یہ ہے کہ بات کچھ بھی نہیں۔''

وہ، سرے سے، مکر گئی۔

سرمد گھر آیا تو ہمیشہ کی طرح ملا لیکن ایک فرق ضرور تھا کہ اس بار، اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر، کتنی دیر تک اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ سرمد اس سے دو سال ہی بڑا تھا لیکن اس کا یہ 'بڑا پن' شیما کو بہت اچھا لگا۔

رات کے کھانے کے بعد، سب لاؤنج میں بیٹھے گپ لگا رہے تھے۔ شیما کوشش کے باوجود، تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھو سی جاتی۔ گھر میں کچھ نیا نہیں تھا۔ لیکن کوئی فرق تھا ضرور۔۔۔

اچانک، امّاں اُٹھ کر، ابا میاں کے کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ابا میاں نے سبھی کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ یہ بھی کچھ ایسا انہونا نہیں تھا۔ اسی طرح، سب گھر

والے ابا میاں کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن شیما کو، جس خاص بات کا فرق نظر آ رہا تھا، وہ ابا میاں کی بات سے ظاہر ہو گیا۔ وہ شیما سے مخاطب تھے۔

''بیٹا۔۔۔ چند روز پیشتر، آپ کے لیے ایک رشتہ آیا ہے، ہمارے ضلع کے D.C. صاحب آئے تھے، وہ خواستگار ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں معلومات کر لی ہیں۔ آپ کی اماں، آپ کو تفصیل سے آگاہ کر دیں گی۔ میں مطمئن ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں نے ہاں کہہ دی ہے۔ آخری فیصلہ آپ کا ہوگا اور میں ہر طرح کے جواب کا منتظر ہوں۔''

ابا میاں نے بہت نپی تلی بات کی۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔۔۔ دوستانہ انداز۔

آئمہ نے اس کے پاؤں کو آہستہ سے ٹھوکر ماری، اماں کا چہرہ روشن تھا، سرمد تھوڑا خاموش۔۔۔

اس کے بعد ابا میاں اُٹھ کر، اپنی رائٹنگ ٹیبل پر جا بیٹھے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ محفل برخاست ہوئی۔ سب لوگ آہستہ آہستہ اٹھ کر آ گئے۔

''آپی وہ بہت ہینڈسم ہیں۔۔۔ آپ نے تو نہیں دیکھا ہے نا! وہ بتا رہے تھے کہ کالج میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔''

امّاں آہستہ آہستہ اس سے کہتی رہیں۔

''بیٹا۔۔۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنا اچھا رشتہ ہمارے گھر آئے گا۔ ماشاءاللہ سے میری بیٹی بھی بہت اچھی، بہت پیاری ہے۔ لیکن آج کل بچیوں کے رشتے کے سلسلے میں، جو حالات جا رہے ہیں، میں تو بہت خائف اور فکرمند تھی۔۔۔ خدا کا شکر ہے، بہت مہذب بچہ ہے۔''

''خیر ایسا بچّہ بھی نہیں ہے۔ شیما سے عمر میں بارہ تیرہ سال کا فرق ہے۔ آپ لوگ ایک بار پھر سوچ لیجیے۔'' سرمد سنجیدہ تھا۔

"فرق ضرور ہے، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے اتنے اچھے رشتے سے انکار کر دیا جائے۔ بہر حال تم بہن بھائی مل بیٹھ کر، اس بارے میں بات کر لو۔ میری وجہ سے شاید شیما بے تکلّفی سے بات نہ کر سکے۔ آج رات، مجھے ان کا فون آنے والا ہے۔"

اماں کے اٹھتے ہی آئمہ نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"آپی۔۔۔ میں اماں کو بتا آؤں کہ آپ خوش ہیں۔ آپی قسم سے ایسی Dashing پرسنیلٹی ہے کہ کیا بتاؤں؟۔۔۔ آپی آپ خوش ہیں نا!"

شیما کے چہرے پر بکھرتے رنگوں کی قوسِ قزح سے مزید بات کرنے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی۔

رات کو نظیف کا ابا میاں کے لیے فون آیا۔ جواب سن کر اس نے کہا کہ کل صبح وہ اپنی بہن اور والدہ کو لے کر گیارہ بجے کے قریب آئے گا۔

شیما کے تایا ابا کا اتنی دُور سے، جلد آنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ابا میاں نے انہیں تفصیلی فون کر دیا وہ بہت خوش تھے۔ خالہ آسٹریلیا میں تھیں۔ انھیں وہاں اطلاع کر دی گئی۔

OO

صبح گیارہ بجے، وہ لوگ آ گئے۔

"آپی کیا بتاؤں؟۔۔۔ بھائی کس قدر اچھے لگ رہے ہیں۔ سکن کلر کا شلوار قمیض۔۔۔ کف فولڈ کیے ہوئے ہیں۔۔۔ براؤن کھیڑی۔۔۔ ہائے ہائے۔۔۔" آئمہ چہکی۔

"توبہ۔۔۔ تم نے یہ بھی غور کیا ہے کہ کف فولڈ کر رکھے ہیں اور اب وہ 'وہ' سے 'بھائی' ہو گئے اور وہ سگار نہیں پی رہے کیا؟ تمہارے رسالوں کا ہیرو تو سگار بھی پیتا ہے۔" سرمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جب سب چائے پی چکے تو اماں نے آئمہ سے کہا کہ شیما کو بلا کر لائے۔

شیما اندر ہی اندر، ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ یہ لمحات انوکھے بھی تھے اور

مشکل بھی۔

"آئمہ میں کیا کروں؟۔۔۔ میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ میں اندر نہیں جا سکتی۔" شیما منمنائی۔

"ایسا۔۔۔ آپ کچھ بھی مت کیجیے۔۔۔ بس ہمّت کیجیے۔۔۔ میں آپ کی ٹانگیں مضبوطی سے تھامے رہوں گی۔"

شیما بے ساختہ ہنس دی۔ پھر ساری ہمّت مجتمع کر کے، وہ دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہوئی تو نظیف اور سرمد اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ شیما نے ایک نظر میں دیکھا کہ خوشی نظیف کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"بیٹی۔۔۔ اپنی آنٹی کے پاس بیٹھ جاؤ۔"

ہلکے پیازی سوٹ نے شیما کی معصومیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اسے 'آنٹی' کی تنقیدی نظریں، اپنے جسم کے پار ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ نظیف کی بہن، رسمی جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"دیکھیں جی۔۔۔ زندگی نظیف نے گزارنی ہے۔ سو اس کی پسند، ہماری پسند ہے۔ اس لیے اب جو بھی ہے، ہم خوش ہیں۔"

اس 'جو بھی ہے' سے سبھی چونک سے گئے۔ آنٹی کی 'وضاحت' کے کُھردرے پن سے ماحول میں تناؤ آ گیا۔

اچانک نظیف اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بہت ہی پُروقار انداز میں، پروفیسر صاحب سے مخاطب ہوا۔

"سر۔۔۔ اجازت ہے؟"

جواب میں ابا میاں مسکرا دیے۔

نظیف نے جیب سے انگوٹھی نکالی، شیما کے ٹھنڈے یخ ہاتھ میں پہنائی اور ہاتھ کو

آہستگی سے دبا کر چھوڑ دیا۔

OO

شیما کو محسوس ہو رہا تھا کہ فہمیدہ ریاض کی یہ نظم، اسی کے لیے لکھی گئی ہے:

'بڑی سہانی سی رات تھی وہ
ہوا میں انجانی، کھوئی کھوئی، مہک رچی تھی۔
بہار کی خوش گوار حدّت سے رات گلنار ہو رہی تھی۔
رو پہلے سپنے، آسمان پر سحاب بن کر بکھر گئے تھے۔
اور ایسی اک رات
ایک آنگن میں کوئی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔
خموش۔۔۔تنہا۔
وہ اپنی نازک، حسین سوچوں کے شہر میں کھو کے رہ گئی تھی۔
دھنک کے سب رنگ اس کی آنکھوں میں بھر گئے تھے۔
ہزار اچھوتے کنوارے سپنے
نظر میں اس کی چمک رہے تھے۔
شریری رات اس کو چپکے سے وہ کہانی سنا رہی تھی۔
کہ آج
وہ اپنی چوڑیوں کی کھنک سے شرمائی جا رہی تھی'

اپریل کی ہوا میں، نئے پھوٹنے والے شگوفوں اور نئے اُبھرنے والے جذبوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔۔۔مدھم، جان لیوا اور حیران کُن۔۔۔اور شیما اس میں ڈولتی پھر رہی تھی۔ نشے میں جھومتی شب کی طلب انگیز مہک، رات کی سانسوں میں گھلے ہوئے جذبات اور نظیف کے گنگناتے قرب کی نرم سی آنچ، اسے دیوانہ بنائے دے رہی تھی۔ جھلمل کرتی

اوڑھنی اور جگمگ کرتے گہنوں میں سجیلی حوّا نے پہلی بار، آدم کی مضبوط بانہوں میں، اپنے وجود کو پگھلتے دیکھا تھا۔

محبت کی برکھا کے امرت رس سے، اس کا تن من بھیگ گیا۔ موسم گُل میں سانسوں میں سمائی گہری آسودگی اس کی محبّت جیسی تھی۔۔۔بے پناہ اور نشہ آور۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیسے اس جادو کو اپنی جان میں بسا لے، کیسے اسے امر بنا دے۔

اور۔۔۔آج شیما اور نظیف کا ولیمہ تھا، شیما دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس وقت اسے اپنے بے پناہ حسن کی جگر مگر سے، کچھ واسطہ نہ تھا۔ رات نظیف جو کچھ کہتا رہا تھا، آج وہ اسی کے سحر میں لڑکھڑاتی پھر رہی تھی۔ عجب وحشت انگیز بے خودی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ اڑ کر کسی پھولوں بھری شاخ پر بیٹھ جائے۔۔۔دوڑتی چلی جائے اور پہاڑ کی چوٹی پر جا کر چلّائے ''میں بہت خوش ہوں۔۔۔میں بہت خوش ہوں۔۔۔'' سمندر میں اُترتی چلی جائے اور پاتال میں جا کر سو جائے اور سوتے میں بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ سجی ہو۔ وہ کیا کرے؟۔۔۔ وہ کیا کرے؟ یہ سب کیسے ہوا؟ اس پر غور کرنے کا، نہ تو اس کے پاس وقت تھا اور نہ ہی ضرورت۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ نظیف کی بانہوں میں، اس نے خود کو کس قدر محفوظ، مطمئن اور نہال محسوس کیا تھا۔ وہ دھیمے دھیمے کہتا رہا اور یہ سنتی رہی۔

''شیما، آپ خوش ہیں؟'' نظیف نے آہستگی سے پوچھا تھا۔

اس کا دل چاہا کہ وہ کہے

''نہیں 'خوش' نہیں ہوں۔۔۔میں 'بہت خوش' ہوں۔''

لیکن یہ سب، اتنا جلد اور بے ساختہ ہوا تھا کہ وہ اس سے بے تکلّف تو کیا ہوتی، واقفیت کی حد تک بھی نہ جان پائی تھی۔

OO

رات بھر وادیوں، گھاٹیوں اور ترائیوں میں بارش ہوتی رہی تھی۔ نیلگوں دُھند

میں لپٹا ہوا منظر، دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ صبح کی تازگی میں چیڑ اور جنگلی پھولوں کی تیز باس، تیر رہی تھی۔

نظیف نے کمرے کی بڑی سی کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے۔ دریچے کے اس پار، شبنمی اُجالے اور ریشمی دُھند لکے سکون بخش تھے۔ اس کی ملازمت، بہت ذمّہ داری کی متقاضی تھی اس لیے اعصاب شکن بھی۔ شیما کی معیت اور دھیرے دھیرے برستی پھوار، اس کے ذہن پر ملائمت سے اثر انداز ہو رہی تھی۔ ہلکی سردی میں، گرم نائیٹ گاؤن سے ملنے والی حرارت، آرام دہ تھی۔

شیما ابھی سو رہی تھی۔ آسمانی کمبل کے ہالے میں اس کا معصوم چہرہ دمک رہا تھا۔ نظیف نے گرم کافی کا ایک بڑا سا مطمئن اور لاپرواہ گھونٹ بھرا، شیما پر بھرپور نظر ڈالی اور سوچا۔
’زندگی مکمّل ہے۔‘

شادی کے لیے نظیف کو صرف ایک ہفتے کی چھٹی مِل سکی تھی۔ دو دِن تو شادی کے ہنگاموں میں گزر گئے اور تیسرے روز جب وہ ہنی مون کے لیے، روانہ ہونے والے تھے تو امّی جان نے احتجاج کیا کہ گھر میں مہمان ہیں اور وہ ساری ذمّہ داری ان پر ڈال کر ’سیر سپاٹے‘ کے لیے جا رہا ہے۔ اس لیے اسے ایک دِن اور رُکنا پڑا۔۔۔ لیکن اسے حیرت تھی کہ اس کے ننھیال والوں کے علاوہ اور مہمان تو کوئی تھے نہیں، اور وہ لوگ چونکہ اکثر اوقات، ادھر ہی ہوتے تھے اس لیے ان کو مہمان نہیں کہا جا سکتا تھا۔

پُرسکون پہاڑی علاقے میں ایک اچھے ریسٹ ہاؤس کے وی آئی پی Suite کی بکنگ اس نے پہلے سے کروالی تھی۔ دُور دُور تک آبادی یا شور شرابہ نہیں تھا۔ وہ چند دِن ایسی ہی جگہ پر گزارنا چاہتا تھا جہاں صرف وہ اور شیما ہوں۔

شیما نے خواب ناک آنکھوں سے نظیف کو دیکھا اور گزرے ہوئے کچھ دِنوں پر نظر ڈال کر حیران سی ہوگئی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ لوگ پاسنگ آؤٹ پریڈ کی تیاری کر رہی

تھیں تو اس کے تو کیا، کسی کے بھی وہم و گمان میں نہ تھا کہ آج وہ نظیف کے ساتھ، اس کی بیوی کی حیثیت سے یہاں ہوگی۔ زندگی بھی کبھی کبھار کس تیزی سے کروٹ بدلتی ہے۔

’’اُٹھ جائیے، ناشتہ کرتے ہیں، زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔‘‘ نظیف اس سے مخاطب تھا۔

شیما، کسلمندی سے دوبارہ کمبل اپنے گرد لپیٹنے لگی تو نظیف، اس کا ارادہ بھانپ کر خود تیار ہونے لگا۔

پانچ منٹ کے بعد وہ واش رُوم سے برآمد ہوا، اس کے چہرے پر صابن کا جھاگ تھا اور ہاتھ میں شیونگ برش۔

’’شیما مجھے یقین نہیں آ رہا کہ جیسا میں نے چاہا تھا وہ ہو گیا اور آج آپ میری بیوی ہیں۔‘‘

شیما کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ اُبھری۔ بے پناہ بارش کے بعد نکھرے ہوئے آسمان کی طرح، روشن آنکھوں، میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

جب وہ لباس تبدیل کر کے نکلی تو میز پر پُرتکلّف ناشتہ چنا ہوا تھا۔ نظیف محبّت بھرے اصرار کے ساتھ، شیما کو ہر چیز پیش کر رہا تھا۔

’’نظیف، آپ سے ایک بات پوچھوں؟‘‘
شیما نے جھجکتے ہوئے کہا۔

’’ضرور پوچھیے، اب میں گورنمنٹ کے ساتھ ساتھ، آپ کے سامنے بھی جواب دہ ہوں۔‘‘ نظیف نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ آخر میں ہی کیوں؟ اس سے پہلے آپ کی چاہت کی حق دار کوئی اور کیوں نہ ٹھہری؟‘‘

’’پتا نہیں، میں نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا اور جب آپ اچھی لگیں تو

میں نے بے ساختہ کہہ ڈالا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں ایسے معاملات میں، نہ تو لگی لپٹی رکھی جانا چاہیے اور نہ ہی منافقت کی گنجائش ہوتی ہے۔''

''والد صاحب کی وفات کے بعد، اکلوتا بڑا بیٹا ہونے کے ناتے، مجھ پر بہت سی ذمہ داریاں آن پڑی۔ تعلیم، کیریئر، امّی جان اور چھوٹی بہنوں کا خیال رکھنا۔۔۔ اِتنا اہم تھا کہ مجھے اس طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اور جب یہ تمام معاملات طے پا گئے تو شاید میرے دِل سے یہ بات اُتر ہی گئی۔ لیکن آپ کو دیکھنے کے بعد مجھے لگا کہ میرا ایک بہت ضروری کام تو رہا جاتا ہے۔ سو وہ سب کچھ کیا جس کے نتیجے میں آپ اس وقت میرے پاس ہیں۔''

گہرے اطمینان کی لہر نے شیما کو اپنے حصار میں لے لیا۔

''جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تو میں دس سال کا تھا۔ امّی جان ان کی وفات سے، تین سال پہلے ہی میکے آ گئی تھیں۔ والد صاحب، محکمہ انہار میں سینئر انجینئر تھے۔ بہت ہینڈسم اور شاندار شخصیت کے مالک۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ ان پر پڑے ہیں۔'' شیما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نظیف نے اپنے درست کالر کو پھر سے درست کیا۔ کھنکارا اور شیما کی طرف جھک کر کہا۔

''میں آپ سے، سو فی صد اتفاق کرتا ہوں، young lady''

شیما نے چائے کا کپ بنایا اور نظیف کے سامنے رکھ دیا۔

''میرے بچپن کی یادوں میں، ان کا سراپا روشنی کے مینار کی طرح واضح ہے۔ جب میں ان کی وفات پر اپنی ددھیال گیا، تو وہ سکون سے سو رہے تھے۔ اس وقت بھی ان کے چہرے پر، محبّت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اب جب میں سونے سے پہلے آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہی تصویر، میری آنکھوں میں جم جاتی ہے۔

امّی جان، ان کے انتقال پر بھی وہاں نہیں گئی تھیں۔ ان کی طبیعت کی سختی سے تو اب میں بخوبی واقف ہوں، لیکن ان کے نہ جانے سے اس وقت، میرا دِل دُکھ سے بھر گیا تھا۔ مجھے امّی جان سے گلہ تھا کہ ایسے وقت میں بھی، وہ ابا جان کو خدا حافظ کہنے نہیں گئی تھیں۔ لیکن تب میں اِتنا چھوٹا تھا کہ اس کا اظہار نہ کر سکا بلکہ اب بھی ان سے بارہا اختلافِ رائے کے باوجود، کچھ کہہ نہیں پاتا۔ امّی جان کا موقف تھا کہ اس صورت میں، انھیں عدّت کا عرصہ اپنی سسرال میں گزارنا پڑے گا، جس کے لیے وہ قطعی راضی نہیں تھیں۔

اب میں سوچتا ہوں شاید ابّا جان صحیح تھے۔ امّی جان کے سخت رویّے سے ان کا گھر قائم نہ رہ سکا۔ لیکن بات تو یہ ہے کہ امّی جان نے کونسا سکھ دیکھا۔ میری ننھیال میں، انھیں وہ مان نہ مِل سکا جو ایک خاتونِ خانہ کو شوہر کے گھر میں نصیب ہوتا ہے۔ تینوں ممانیاں، انھیں اپنی سلطنت میں شریک نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن امّی جان کے لیے اب اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔''

''تو کیا آپ کے ابّا جان اور ددھیال والوں نے کبھی کوشش نہیں کی کہ اس صورتِ حال کو بہتر بنایا جائے؟''

شیما نے کہا:

''بارہا کی۔۔۔ میں چھوٹا تھا، اس لیے مجھے اس میں شامل تو نہیں کیا جاتا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو جاتا تھا کہ ایسا کوئی سلسلہ چل رہا ہے۔ ابا جان کے خط میرے نام آتے تھے، لیکن مجھ تک نہ پہنچتے۔ بڑے ماموں جان کا ایک پُرانا ملازم، مجھے ایسی اطلاعات بہم پہنچاتا رہتا تھا۔

مجھے اندازہ ہے کہ ابّا جان اور امّی جان کے درمیان کوئی ایسا گمبھیر معاملہ نہ تھا، جس کا کوئی حل نہ نکل سکتا۔ صرف امّی جان کا سخت اور غیر لچک دار رویّہ ہی اس کی وجہ تھا۔ میں خود کو بہت بے بس محسوس کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ میرا بھی اپنا گھر ہو، جہاں میں اپنے ماموں کے بچّوں کی طرح سے رہ سکوں، بہت مان کے ساتھ۔ میرے والد اور دیگر لوگ اسی طرح

میرے چاؤ چونچلے اُٹھائیں۔ جیسے میرے کزنز کے اُٹھائے جاتے تھے۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر امّی جان میری اس کیفیت کو سمجھتیں تو جتنی جاں فشانی سے، انھوں نے اپنے میکے میں دِن گزارے ہیں۔ اس کا عشرِعشیر بھی، ان کو اپنے گھر میں نہ کرنا پڑتا۔ کیونکہ ابّا جان اِتنے بڑے آفیسر تھے۔ اور انھیں اتنی زیادہ سہولتیں میسّر تھیں۔ سروس میں آنے کے بعد میں، ان کی ایک دو پوسٹنگز کے شہروں میں بطورِ خاص گیا اور جن گھروں میں وہ رہائش پذیر تھے وہ دیکھے اور پھر ان کا موازنہ، اپنی ننھیال سے کیا تو میرا تاسف دوچند ہوگیا۔ کتنا مزہ آتا ہم بہن بھائیوں کو، ان گھروں میں والدین کے ساتھ رہتے ہوئے۔''

لگتا تھا، نظیف خواب کی کیفیت میں ہے۔

''ابّا جان کی وفات کے دس ماہ بعد ہی، میرے دادا جان کا انتقال ہوگیا۔ چونکہ ان کی زندگی میں ہی ابّا جان وفات پا گئے تھے، اس لیے عائلی قوانین کے مطابق امّی جان کو ان کی جائیداد میں سے حصّہ نہیں مِلا، اگرچہ ہمیں جائیداد منتقل ہوگئی۔ لیکن امّی جان کو اس نہ ملنے والے حصّے کا، ابھی تک قلق ہے۔ یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی کہ جس شخص سے زندگی میں ہی ناتہ توڑ لیا جائے، اس کی جائیداد سے واسطہ کیوں رکھا جائے؟

میری ایک پھوپھی، جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں۔ ان کا کوئی بچّہ نہیں ہے۔ وہ دادا جان کے پاس ہی رہتی تھیں جب امّی جان اپنے میکے آ گئیں اور واپس جانے کا نام نہ لیا تو ابّا جان میری اس پھوپھی کو اپنے پاس لے آئے اور وہ ان کا گھر سنبھالنے لگیں۔ بہت محبّت والی خاتون ہیں۔ اب تو میں نے انھیں کبھی دیکھا نہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ بچپن میں وہ مجھے کتنا پیار کیا کرتی تھیں۔ شاید ان کے اپنے بچّے نہیں تھے اس لیے یا وہ ویسے ہی ابّا جان جیسی طبیعت رکھتی تھیں۔ محبّت کا سمندر۔۔۔ ابّا جان نے اپنی زندگی میں ہی، اپنی ذاتی جائیداد میں سے کچھ حصّہ ان کے نام منتقل کر دیا تھا۔ امّی جان اس پر بھی، بارہا برہمی کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔''

نظیف نے چائے کی خالی پیالی، دوبارہ شیما کے سامنے رکھ دی۔ جسے شیما نے

بھر کر بغیر کچھ کہے، نظیف کے سامنے رکھ دیا۔ وہ جس انداز سے بات کر رہا تھا، شیما نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس میں مخل ہو۔

''اور جب میں سول سروس میں آیا تو ممانیوں کا رویہ یکسر بدل گیا۔ بڑی ممانی نے نغمانہ کا ہاتھ مانگ لیا۔ جو میرے نہ چاہنے کے باوجود، امّی جان نے تسلیم کر لیا۔ چھوٹی ممانی، اپنی منجھلی بیٹی کے لیے ابھی تک کوشاں رہی ہیں، جسے میں مسلسل ٹالتا رہا ہوں۔ ویسے کے روز ہو سکتا ہے آپ کو اندازہ ہوا ہو، ان کی خواہش کا۔ والد صاحب کی طرف سے ملنے والی جائیداد سے، میں بخوبی بہنوں کی شادی کر سکا ورنہ امّی جان، جن بھائیوں کے سہارے میکے میں آ ئی تھیں، انھوں نے بالکل بھی ساتھ نہیں دیا۔ اگرچہ مجھے کہنا نہیں چاہیے لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ، وہ کچھ لالچی سے لوگ ہیں گاہے بگاہے، وہ امّی جان کو یہ بات جتا کر کہ ہم لوگ، ان کے پاس رہے ہیں، مختلف قسم کے مطالبات کرتے رہتے ہیں اور امّی جان یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ان کے مطالبات صرف اس لیے مانتا ہوں کہ امّی جان خوش رہیں، مجھ سے شاکی رہتی ہیں اور ان کا دِل چاہتا ہے کہ میں اپنے لیے، کچھ بنانے کی بجائے ان کی 'کفالت' کرتا رہوں، یا تو نغمانہ کی وجہ سے اور یا شاید انھیں اپنی اولاد سے زیادہ میکہ پیارا ہے۔ اب میرے پاس اِتنا نہیں تھا کہ آپ کے لیے کچھ اچھا کر پاتا۔ اُمید ہے آپ نے اس بات کو محسوس نہیں کیا ہوگا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟۔۔۔ مجھے ان چیزوں کی پرواہ نہیں ہوتی، میں انھیں اِتنی ہی اہمیت دیتی ہوں، جتنی کہ دی جانی چاہیے اور یوں بھی میرے پاس سب کچھ ہی تو ہے۔'' شیما نے خلوصِ دِل سے کہا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نظیف اِتنے سالوں کا دُکھ، جو وہ ابھی تک اپنے دِل میں سمیٹے بیٹھا تھا، اب ساتھی کے مِل جانے پر اُگل دینا چاہتا تھا۔

''والد صاحب کی شفقت کی کمی سے مجھے اپنا آپ ادھورا محسوس ہوتا ہے، جسے

میں نے شبانہ روز محنت، بہنوں کو محبّت دینے اور امّی جان کا خیال رکھنے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے،لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس اب بھی اِتنا ہی تن آور ہے۔ آپ کے چند روزہ ساتھ سے ہی مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ آپ کی رفاقت اور توجّہ کے سہارے میں اس احساس کو اپنے ذہن سے کھرچ پاؤں گا۔آپ کو مجھے مکمّل کرنا ہے۔

نغمانہ کی طبیعت میں امّی جان کے بہت اثرات ہیں۔البتہ ثانیہ بہت محبت کرنے والی بہن ہے۔اس سے ملیں گی تو آپ کو اندازہ ہوگا۔میری اس سے بہت دوستی ہے۔

شیما میں چاہتا ہوں کہ ہماری آئندہ زندگی پر میرے والدین کی زندگی کی پرچھائیں بھی نہ پڑے۔اس کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ہم روایتی میاں بیوی،کی بجائے اچھے دوست بن کر رہیں گے۔ہم ایک مثالی جوڑا (Ideal Couple) بنائیں گے۔

ہم اور ہمارے بچّے۔۔۔آپ سن رہی ہیں نا!۔۔۔ہمارے بچّے۔۔۔''نظیف نے شیما کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

شیما گلابی پڑ گئی۔

''ماں اور باپ دونوں کی،بے پناہ محبّت کے زیرِ سایہ پلیں،بڑھیں گے۔''

نظیف جذباتی ہو رہا تھا۔اس کی آواز گلوگیر تھی۔

شیما نے نظیف کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نظیف آپ کو مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوگی،مجھے بھی پرسکون گھرانہ ہی چاہیے۔ میں نے ابّا میاں اور امّاں کے ساتھ،اور،بہن بھائیوں کے پیار،کو بہت enjoy کیا ہے۔ میں چاہوں گی کہ ہم۔۔۔''

''اور ہمارے بچّے۔۔۔''نظیف نے شرارتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''اور ہاں،آپ کی ایک امانت میرے پاس پڑی ہے،وہ لے لیجیے گا۔''

نظیف نے ایک دم موضوع بدلا۔

''امانت؟ کیسی امانت؟''شیما نے پوچھا۔

''ولیمے کے روز پروفیسر صاحب نے فرنیچر کے لیے مجھے ایک چیک دیا تھا۔میں نے اپنی سی کوشش کی تھی منع کرنے کی لیکن وہ نہیں مانے۔۔۔''

''آپ رکھیئے اسے۔۔۔فی الحال تو مجھے ضرورت نہیں ہے اور یوں بھی آپ کے پاس ہوا یا میرے پاس۔۔۔ایک ہی بات ہے۔''

''ہوں۔۔۔تو پھر ایسا ہے کہ۔۔۔اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا ہوں۔دراصل شادی کی تیاری کے لیے میں نے اوورڈرافٹ لے رکھا ہے۔جب ضرورت ہوگی،آپ مجھ سے لے لیجیے گا۔۔۔''

''ضرور۔اجازت لینے کی اس میں کیا بات ہے؟''

شیما نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا۔

OO

''کتنے اچھے دِن گزارے ہیں ہم دونوں نے!اب پھر وہی مصروفیت ہوگی اور وہی ذمّہ داریاں۔میں تو اِتنے دِن اسے بھلائے ہی رہا،تا کہ آپ کے ساتھ،اور ایسی خوبصورت جگہ پر چھٹی کو،پوری طرح سے enjoy کر سکوں۔''

نظیف نے،گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

ان لوگوں کا ہنی مون ختم ہو چکا تھا اور وہ واپس جا رہے تھے۔شیما کی چھٹی ابھی باقی تھی۔

''میری job کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جاری رکھنی چاہیے یا۔۔۔''

شیما نے بغیر کسی تمہید کے نظیف سے پوچھا۔

''یہ سراسر آپ کا معاملہ ہے۔میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ اس کا فیصلہ تو آپ ہی کو کرنا ہے۔''

نظیف نے شیما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب ہمیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے، مل جل کر ہی کرنا ہے۔ مجھے یہ سب اکیلے ہی کرنا تھا تو پھر یہ شادی وادی کا چکّر کیا ضروری تھا؟''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں صرف اس لیے کچھ نہیں کہہ رہا کہ معلوم نہیں آپ اسے کیسے لیں؟''

''میں سمجھی نہیں۔''

''بیگم صاحبہ، اگر میں کہوں کہ سروس جاری رکھیں، تو ہو سکتا ہے، آپ یہ سمجھیں کہ خدانخواستہ میں آپ کی ذمّہ داری اُٹھانے سے گریز کر رہا ہوں اور اگر کہوں کہ چھوڑ دیں تو آپ کے ذہن میں یہ بات آئے کہ شاید میں آپ کو دست نگر رکھنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے، آپ بتایئے۔''

''تو پھر یوں کیجیے کہ چھٹی ختم ہونے پر کالج جانا شروع کر دیں اور دیکھیں کہ job کے ساتھ ساتھ آپ گھر داری نبھا سکتی ہیں یا نہیں؟ پھر فیصلہ کریں۔ جلدی میں ہو سکتا ہے، آپ صحیح نتیجے پر نہ پہنچ پائیں۔''

شیما نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ جانتی ہیں، ہمارے معاشرے میں جاب کرنے والی خواتین کو دوہری ذمّہ داریاں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ ابھی ہمارے ہاں، مردوں کا گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹانے کا رواج نہیں ہوا۔ میری جاب کی وجہ سے آپ کو بہت سہولتیں میسّر ہوں گی، ۔۔۔اگرچہ میں ذاتی طور پر آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا، اس لیے گھر داری کی مکمل ذمّہ داری تو آپ ہی کی ہوگی۔'' نظیف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔۔۔ان معاملات پر بحث، مباحثہ اکثر ہمارے سٹاف روم میں ہوتا رہتا ہے۔''

''گھر داری میں رخنہ آنے جیسی وجوہات کی بنا پر اکثر مرد حضرات، خواتین کی جاب کے خلاف ہوتے ہیں۔ ویسے تو یہ سوچ صرف متوسط طبقے میں پائی جاتی ہے۔ نچلے اور اُوپر کے طبقے میں، کوئی اس بات کی پرواہ نہیں کرتا۔ میرے ایک دوست ہیں، ان کی بیوی ڈاکٹر ہیں۔ بچّوں کے امراض کی ماہر ہیں، لیکن نہ پریکٹس کرتی ہیں نہ جاب۔ کیونکہ ان کے میاں صاحب کہتے ہیں کہ جب میں ذمّہ داری اُٹھا سکتا ہوں تو تمہیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے آپس کی بات ہے کہ وہ 'ذمّہ داری' بھی 'فضلِ ربّی' کے بل بوتے پر ہی اُٹھا رہے ہیں۔''

نظیف نے طنزاً کہا۔

''ہم دوستوں نے بہتیرا سمجھایا ہے کہ اگر ایسا ہی تھا تو کسی میٹرک پاس لڑکی سے شادی کر لیتے لیکن نہیں، ان کی 'غیرت' گوارا نہیں کرتی کہ بیوی کی 'کمائی' کھائیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ خواتین کی ملازمت کے بارے میں، اچھی رائے رکھتے ہیں۔''

''جی ہاں۔۔۔ بہت اچھی رائے رکھتا ہوں۔ آپ شاید جانتی ہوں گی کہ میری بیوی بھی ورکنگ وومن ہے۔'' نظیف نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں، خواتین کو کام کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ کسی طرح بھی، ذہانت اور قابلیت میں مردوں سے کم نہیں ہیں، اور اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح سے خاندان کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور پھر فراغت ہو جانے سے ضروریات آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں۔ یہ الگ بات کہ ہمارے معاشرے میں خواتین، دوہری ذمّہ داریوں کو پورا کرنے کے چکّر میں پس جاتی ہیں۔''

''جی ہاں، میری شادی شدہ کولیگز بعض اوقات کافی پریشان ہو جاتی ہیں۔'' شیما نے کہا۔

''تو پھر میں اپنی جاب جاری رکھوں نا!'' شیما نے پُر اُمید نظروں سے نظیف کی طرف دیکھا۔

''بیگم صاحبہ، مجھے فخر ہے کہ میری بیوی پڑھی لکھی ہے اور معاشرے کا کارآمد حصّہ ہے۔ جاب کرنے سے آپ کی اپنی ایک حیثیت ہوگی اور میں نہیں چاہوں گا کہ آپ صرف میری ذات میں گم ہو کر رہ جائیں۔۔۔ محض بیگم نظیف ہارون، مینا بازاروں کا افتتاح فیتہ کاٹ کر کرنے والی۔۔۔ لیکن بات وہی ہے کہ فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا۔''

شیما بہت خوش تھی کہ نظیف اس کی خوشی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

OO

شادی کے تین ہفتے کے بعد، آئمہ اور سرمد، شیما سے ملنے کے لیے آئے تو وہ انھیں لے کر امّی جان کے پاس چلی آئی۔ انھوں نے اپنے مخصوص کھردرے اور خشک لہجے میں ان سے بات کی تو شیما، جو اتنی چاہت سے انھیں ملانے لائی تھی، بجھ سی گئی۔

اتنی دیر میں باہر گیٹ کھلنے کی آواز آئی امّی جان نے نصیباں سے کہا۔

''صاحب کو ادھر ہی بلا لاؤ، ان کا سالا اور سالی ملنے کے لیے آئے ہیں۔''

رِشتہ اگرچہ یہی تھا لیکن انھوں نے، ایسے چبا چبا کر کہا کہ سرمد کو یوں محسوس ہوا، جیسے گالی دے رہی ہوں۔

شیما کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔

نظیف نے آتے ہی، سرمد کو دیکھ کر نعرہ لگایا۔

''اوہو۔۔۔ بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔''

اس پر شیما، ابھی کچھ دیر پہلے کی بدمزگی کو بھلا بیٹھی۔

''کتنی خوشی ہوتی ہے بہنوں کو، بھائی ملنے کے لیے آئے تو۔ ثانیہ تو ملک سے باہر ہے اور نغمانہ بیچاری، انتظار ہی کرتی رہتی ہے۔ نظیف کی نوکری ایسی ہے کہ اسے وقت نہیں

ملتا اور جو ملتا ہے، اس میں وہ گھر میں ہی بہت 'مصروف' ہو گیا ہے۔''

امّی جان نے طنزاً کہا۔

شیما دِل مسوس کر رہ گئی۔

'ایک تو نظیف کو 'مصروف' ہوئے دِن ہی کتنے ہوئے ہیں، دوسرے یوں بھی، نغمانہ باجی ہر دوسرے دِن تو خود آئی رہتی ہیں، پھر امّی جان ایسے کیوں کرتی ہیں؟ چلیں، کوئی بات نہیں۔۔۔ نظیف تو سب سمجھتے ہیں نا!' شیما نے سوچا۔

OO

نظیف آفس سے واپس آیا تو شیما چپ سی تھی۔ نظیف نے تشویش سے پوچھا۔

''خیریت؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا!''

''جی۔۔۔ بالکل۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''اوہ۔۔۔ ہو، میں سمجھ گیا، آپ اُداس ہو رہی ہیں۔ پچھلے وِیک اینڈ پر ہمارا پروگرام تھا، امّاں کے ہاں جانے کا، لیکن میری مصروفیت آڑے آئی۔ اب اس وِیک اینڈ پر آپ ایک آدھ چھٹی لے کر ہو آئیں۔ آئمہ تو بے تکلفی سے اظہار کر دیتی ہے، لیکن مجھے اندازہ ہے کہ سبھی آپ کی کمی محسوس کر رہے ہوں گے۔''

''آپ بھی ساتھ چلیں گے نا!'' شیما چہکی۔

''بیگم صاحبہ، میرا جانا تو مشکل ہے۔ میں یہیں رہ کر آپ کو miss کروں گا اور واپسی کا اِنتظار۔''

جمعہ کے روز، شیما نے پرنسپل صاحبہ سے، ایک دِن کی چھٹی لی، دوستوں کو خدا حافظ کہا، گھر آ کر اپنا بیگ لیا، جو اس نے رات کو ہی پیک کر لیا تھا۔ پھر فون پر نظیف سے، آفس میں بات کی اور ڈرائیور اسے امّاں کے ہاں چھوڑ آیا۔

وہ ایک ماہ کے بعد آئی تھی۔ لیکن اسے لگ رہا تھا کہ سالوں بعد لوٹی ہے۔ آئمہ

اسے دیکھتے ہی، خوشی کے مارے چیخنے لگی۔

''آپی، آپ بغیر بتائے چلی آئیں اور نظیف بھائی ساتھ کیوں نہیں آئے؟''

''اپنے گھر میں بتا کر آنا ضروری ہوتا ہے کیا؟ اور نظیف کیوں نہیں آئے؟۔۔۔ وہی قصّہ پرانا ہے۔۔۔ مصروفیت۔۔۔''

''تمھاری امّی جان کیسی ہیں؟'' امّاں نے پوچھا۔

''وہ نغمانہ باجی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ ویسے ٹھیک ہیں۔۔۔ خوش باش۔''

ان کی 'خوش باشی' کا حال تو شیما بخوبی جان گئی تھی لیکن اب اور کیا کہتی؟

ابا میاں، دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کر رہے تھے۔ شام کی چائے پر ان سے ملاقات ہوئی۔ سرمد بھی آفس سے آچکا تھا۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔ ہنسی، شور اور قہقہے لیکن شیما کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد، کسی کی کا احساس ہوتا۔ ایسے جیسے وہ کوئی ضروری چیز، کہیں رکھ کر بھول گئی ہو۔ کیا میں نظیف کی کمی محسوس کر رہی ہوں؟۔۔۔ لیکن وہ اس وقت کونسا گھر پر ہوتے ہیں۔۔۔ پھر؟

امّاں نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''شیما، تم کھوئی کھوئی کیوں ہو؟ خیریت ہے نا!''

''جی، بالکل خیریت ہے۔''

''امّاں، آپی، نظیف بھائی کو یاد کر رہی ہیں۔'' آئمہ نے کہا تو شیما کا چہرہ، شرم سے سرخ ہو گیا۔

(ابا میاں کیا سوچیں گے؟ یہ آئمہ بھی حد کرتی ہے۔)

رات کو نظیف کا فون آیا۔ اس نے باری باری سب سے بات کی اور جب شیما سے بات کر رہا تھا تو وہ صرف ہوں۔۔۔ ہاں کرتی رہی۔ اس کی بے تابیوں کے جواب میں، وہ بھلا اور کیا کہتی؟

اتوار کو وہ واپس آئی۔ نظیف نے صبح ہی گاڑی بھجوا دی تھی لیکن آئمہ نے کہا کہ دوپہر کا کھانا کھائے بغیر، اس کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ رکھی نے بہت مزیدار کھانا بنایا تھا۔ رُخصت ہوتے وقت، چاچا فیروز نے بالکل ابا میاں کے انداز میں، اس کے سر پر ہاتھ رکھا، دُعا دی اور فی امان اللہ کہا۔

گھر پہنچی تو امّی جان واپس آچکی تھیں۔ حسبِ سابق، ان کا موڈ خراب تھا۔ جس کی وجہ ابھی تک شیما کو معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ امّاں کے بھیجے ہوئے سلام کے جواب میں بھی، انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ نظیف کسی تقریب میں مدعو تھا اور اس کی واپسی دیر سے ہونے والی تھی۔

شیما اپنے بیڈروم میں آئی تو امّی جان کے رویّے سے دِل گرفتہ تھی۔ اچانک اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی، جس کے شیشے پر ایک خوبصورت کارڈ لگا ہوا تھا۔

''I miss U''

شیما کا دِل خوشی اور اطمینان سے بھر گیا۔ خوشی اس بات کی کہ نظیف نے اس کی کمی محسوس کی اور اطمینان اس بات کا کہ امّی جان انگریزی پڑھنا نہیں جانتیں، ورنہ ایک نیا فضیحتہ شروع ہو جاتا۔

OO

کلاسز سے فارغ ہونے کے بعد، شیما گپ شپ لگانے کے لیے ہوسٹل آئی تو نگار لوگوں نے اسے کھانے کے لیے روک لیا۔ نظیف چونکہ شہر سے باہر تھا، اس لیے شیما آسانی سے مان گئی۔ یوں بھی اس کا اپنا دِل چاہ رہا تھا، ان لوگوں کے ساتھ مِل بیٹھ کر کھانا کھانے کو۔۔۔ گزرے ہوئے دِنوں کی طرح۔

شیما کہنے لگی۔

''رات نظیف کے دو دوست کھانے پر آئے، تو میں نے خود کھانا بنایا۔ ان لوگوں نے بہت تعریف کی۔ کھانا بنا بھی بہت اچھا تھا۔ خاص طور پر پلاؤ اور شاہی ٹکڑے۔''

"اچھے بن گئے تھے یا تم نے بنائے تھے؟" نگار نے پوچھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میرا، اچھا کھانا بنانے میں تمہیں کوئی شک ہے کیا؟ نظیف کے ایک دوست، کامران بھائی، ان سے بہت بے تکلف ہیں۔ وہ کہنے لگے۔

"بھابھی، دیر آید، درست آید والی بات یہاں بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ نظیف نے شادی کرنے میں دیر تو کر دی لیکن ہے بڑا خوش قسمت، اور وہ جو کہتے ہیں کہ

'A mean woman cannot cook well'

بالکل صحیح ہے۔ آپ خود جتنی اچھی ہیں، اتنا ہی اچھا کھانا بنایا ہے۔" اس پر نظیف کے چہرے پر جو چمک تھی، کبھی تم دیکھتیں۔"

شیما کے لہجے میں فخر جھلک رہا تھا۔

"نظیف بھائی کے وہ دوست بھی مجھے 'ایک دانشور' لگتے ہیں۔ بالکل صحیح کہا انھوں نے۔ اگر اس بات کی مزید تصدیق کرنا ہے تو تمہاری ساس سے کھانا بنوا لیتے ہیں۔ حلق سے نیچے اُتر گیا تو میرا نام بدل دینا۔"

نگار نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ تم ہر بات میں آنٹی کو کیوں گھسیٹ لیتی ہو؟"

شہلا نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

"جب کامران بھائی واپس جا رہے تھے تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے بھابھی سے بھی ملوایئے تو کہنے لگے۔

"جی، ضرور اگلی بار بیگمات کو لے کر آؤں گا۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے نظیف سے پوچھا کہ ان کی دو شادیاں ہیں؟ تو وہ ہنسنے لگے اور بتایا کہ شادی تو ایک ہی ہے لیکن بھابھی صاحبہ اتنی بھاری بھر کم ہیں کہ کامران انھیں بیگمات کہتا ہے کہ دو کے برابر ایک ہی ہیں۔" شیما ہنسی۔

"سلسلہ اب یوں ہے شیما، کہ میں بہت خوش ہوں کہ تم اپنے گھر کی ہو گئیں اور میرے کندھوں سے تمہارا بوجھ اُتر گیا۔ ورنہ تم جانتی ہو، جوان دوست بیٹھی ہوں تو میرے جیسوں کی راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے۔"

نگار نے بطورِ خاص دوپٹے کی بکّل مار کر بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"یہ شیما کی ذمہ داری، کب سے تمہارے کندھوں پر آن پڑی تھی؟ اللہ تعالیٰ، انکل آنٹی کو زندگی دے۔ تمہاری پریشانی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔" ثوبیہ نے نگار کو گھورتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، یہ والدین کے علاوہ، دوستوں کی بھی ذمہ داری ہے۔ بات صرف محسوس کرنے کی ہوتی ہے۔ اللہ نے اگر تمہیں 'توفیق' نہیں دی تو میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"فرض کرو، مجھے توفیق حاصل ہو چکی ہے۔ اب تم بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

شہلا نے کہا۔

"میرا؟ مجھے ابھی کسی سے محبت ہی نہیں ہوئی۔"

"تمہیں؟ تمہیں تو ہر تیسرے دن، کسی نہ کسی سے محبت ہوئی رہتی ہے۔ کبھی ریڑھی کھینچتے ہوئے مزدور سے، کبھی ہانک لگاتے ہوئے بس کنڈکٹر سے، کبھی چابک لہراتے ہوئے تانگے والے سے۔۔۔ سارا وقت ہائے ہائے کرتی رہتی ہو۔" شہلا نے کہا۔

"نہیں یار، یہ وہ محبت نہیں ہے۔ میں تو اس محبت کا ذکر کر رہی ہوں جو تمہیں اپنے 'منگیترِ معظم' جناب شہزاد حسن سے ہے، جو آسٹریلیا میں Ph.D کر رہے ہیں۔"

"تمہیں کس نے کہا کہ مجھے ہے؟ ماموں زاد ہونے کے ناتے، ابھی ایک ماہ پہلے تک تو شہزاد کو بھائی جان کہتی رہی ہوں۔ بلکہ اس دن، گھر جاتے ہوئے، بس میں ایک خاتون میری منگنی کی انگوٹھی دیکھ کر کہنے لگیں کہ بہت خوبصورت ہے۔ کس جیولر سے لی ہے؟ تو میں نے کہا کہ شہزاد بھائی نے آسٹریلیا سے بھیجی ہے۔"

"تمہارا ستیاناس۔۔۔ شکر ہے نکاح نہیں ہوا ورنہ ستر (۷۰) فقیروں کو کھانا کھلانا پڑتا۔ ایسے کرو گی تو شادی کے بعد، شہزاد بھائی کی آدھی کمائی پر تو فقیر موج کیا کریں گے۔

پتا ہے، تمہارے جیسے ایک نئے شادی شدہ میاں بیوی، آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بیوی نے پوچھا:

"آپ کو کون سا رنگ پسند ہے؟"

شوہر نے جواب دیا۔

"زرد۔"

"مجھے بھی۔۔۔ اور موسم؟"

"برسات۔"

"مجھے بھی۔۔۔ اور کھانا۔"

"پلاؤ۔"

"مجھے بھی۔۔۔ ہائے اللہ۔۔۔ آپ تو میرے ہی بھائی ہیں۔"

اس طرح، ان کا نکاح مکروہ ہو گیا اور ستر (۷۰) فقیروں کو کھانا کھلانا پڑا۔ شوہر پہلے شادی اور پھر اس کھانے پر اتنا خرچ اُٹھ جانے پر، پریشان بیٹھا تھا۔ ادھر بیوی کو اپنی غلطی کا احساس تھا، اس نے سوچا ذرا اظہارِ ہمدردی کروں کہ تھوڑا غم غلط ہو جائے۔ اس نے بڑے پیار سے کہا۔

"مجھ سے غلطی ہوئی اور آپ کو پریشانی اُٹھانا پڑی، معافی چاہتی ہوں۔"

شوہر نے چڑ کر کہا۔

"چلی جاؤ۔۔۔ اب پھر آ گئی ہو، اپنے باپ کو چھیڑنے کے لیے۔"

"۔۔۔ پھر وہی ستر (۷۰) فقیر۔" نگار نے کہا۔

"میری بات چھوڑو۔۔۔ میں خود ہی کھانا کھلانے کا بندوبست کر لیا کروں گی۔۔۔ میرا خیال ہے میری تنخواہ میں یہ کام ہو جایا کرے گا۔ تم کہو۔۔۔ کیا محبت اس قدر ضروری ہے؟"

"ہاں، اسی قدر۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔۔۔ لیکن شیما کے شوہر نامدار کی طرح بھی نہیں کہ 'وہ آئے' انھوں نے دیکھا، اور فتح کر لیا اور یہ کچے دھاگے سے بندھی چلی گئیں۔"

"خیر، کچھ برا بھی نہیں کیا میں نے۔۔۔ نظیف بہت اچھے ہیں اور میں بہت خوش ہوں۔"

"اور تمہاری 'امی جان' کتنی خوش ہیں۔۔۔ اس کا اندازہ تو مجھے پہلی ملاقات میں ہی ہو گیا تھا۔"

نگار نے جل کر کہا۔

"اب سارے خاندان کی ذمہ داری تو کوئی بھی نہیں لے سکتا اور جب شوہر کا برتاؤ اچھا ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

شیما نے کہا۔

"بالکل پڑتا ہے میری جان۔ 'ایک دانشور' نے کہا ہے کہ پانی کی دھار پتھر پر پڑتی رہے تو اس میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔"

نگار ایسی موشگافیاں بزبانِ 'ایک دانشور' ہی کیا کرتی تھی۔

OO

نظیف رات گئے گھر لوٹا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ شہر میں امن و امان کا مسئلہ گمبھیر

صورت اختیار کر گیا تھا۔ وہ کمرے میں آیا، ٹائی اُتار کر پھینکی اور جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے علاوہ کوفت کے آثار تھے۔

''امّی جان کی طبیعت اتنی خراب تھی لیکن نہ تم انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اور نہ ہی ڈاکٹر کو گھر پر بلایا۔۔۔ میں مصروف تھا۔۔۔ لیکن تمہیں تو اپنی ذمّہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔''

نظیف بغیر کسی تمہید کے بولتا چلا گیا۔۔۔ اس کی نگاہیں اجنبیت لیے ہوئے تھیں۔ (تو نظیف میں یہ گُن بھی ہے؟ اجنبی بن جانے کا)

'' امّی جان کی طبیعت خراب ہے؟ ابھی دس منٹ پہلے ہی تو میں، ان کے پاس سے آئی ہوں۔''

شیما نے حیرت سے کہا۔

''اچھا۔۔۔ تو تمہیں یہ بھی معلوم نہیں؟ حد ہوتی ہے لاپرواہی کی۔'' نظیف کے لہجے میں، امّی جان والا ہی کھردراپن تھا۔

شیما جلدی سے امّی جان کے کمرے میں گئی تو وہ زور زور سے خرّاٹے لے رہی تھیں۔ شیما نے واپس آ کر، اپنی دانست میں نظیف کی تسلی کروانی چاہی۔

''امّی جان آرام سے سو رہی ہیں نظیف۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔''

''میں فکرمند نہ ہوں تو اور کون ہوگا؟ وہ ماں ہیں میری۔۔۔'' نظیف نے غرّاتے ہوئے اسے 'معلومات' بہم پہنچائیں۔

''اب بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' (کیا؟؟؟)

وہ پہلی رات تھی جب نظیف نے اسے خدا حافظ نہیں کہا۔ وہ دوسری طرف منہ موڑ کر، بے سدھ سو رہا تھا۔ شیما کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی نظیف ہے اور نہ ہی وہ یہ سمجھ پائی تھی کہ ایسا کیوں ہوا؟ امّی جان بالکل ٹھیک تھیں پھر؟

صبح کی ہلکی دھوپ میں اس کا چہرہ اور بھی زرد لگ رہا تھا۔ سوجی ہوئی آنکھوں میں سرخی تھی۔ نظیف رات کی پوری نیند کے بعد، صبح تازہ دم تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ رات امّی جان کی طبیعت 'کس قدر' خراب تھی۔

ناشتے کی میز پر وہ چہکا۔

''آیئے بیگم صاحبہ۔۔۔ ناشتہ کیجیے۔۔۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم آپ کے بغیر ناشتہ نہیں کرتے۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' شیما نے کسلمندی سے کہا۔

''بھوک نہیں ہے یا موڈ خراب ہے۔۔۔ اور اگر خراب ہے تو کیوں خراب ہے؟ بھئی ہم سے یہ برداشت نہیں ہوگا ویسے خیریت تو ہے؟'' وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔

''ڈاکٹر کے پاس چلیں۔۔۔ شاید وہ ہمیں کوئی 'اچھی خبر' دینے والی ہوں۔''

(انھیں یہ بھی احساس نہیں کہ میرا موڈ کیوں خراب ہے۔ نہ ہی یہ یاد ہے کہ ہم دونوں نے طے کیا تھا کہ ہماری ناراضگی کے درمیان رات نہیں آئے گی۔۔۔ چلو، خیر۔۔۔ بے چارے سخت ذہنی دباؤ میں تھے۔۔۔ کیا کرتے؟۔۔۔ مجھے دِل برا نہیں کرنا چاہیے۔ شیما نے سوچا۔)

OO

نظیف، تین روز سے ایک ٹریننگ میں شمولیت کے سلسلے میں گھر پر نہیں تھا۔ یہاں سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن شیما کو یوں لگتا تھا، جیسے کوئی بچّہ، میلے کی بِھیڑ میں گم ہو گیا ہو۔ عام دنوں میں بھی، نظیف اپنی مصروفیت کی وجہ سے دن کا بیشتر حصّہ گھر سے باہر گزارتا تھا، لیکن صرف یہ احساس ہی کہ نظیف اس وقت شہر میں موجود نہیں ہے، شیما کو بے چین کرنے کے لیے کافی تھا۔ رات کو گھر میں مکمّل طور پر محفوظ ہونے کے باوجود، اس کی آنکھ بار بار کھل جاتی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس احساس سے متعارف ہوئی تھی کہ مرد کی موجودگی، عورت

کے لیے کس قدر تحفظ کا باعث ہے۔

اگلے روز وہ کالج گئی تو نگار، شہلا اور ثوبیہ اسے کھینچ کر اپنے کمرے میں لے گئیں اور ہپی برتھ ڈے، ٹو یو شیما، کا کورس با آواز بلند گاتے ہوئے، اس سے کیک کٹوایا اور کلیاتِ ن۔م۔راشد تحفے میں دی۔ یہ شادی کے بعد، شیما کی پہلی سالگرہ تھی۔ پھر وہ کیک سب سٹاف ممبرز نے ٹی۔ بریک میں کھایا۔ دوستوں کی محبت، اس کے لیے نئی نہیں تھی لیکن یہ جذبہ ہمیشہ اسے ایک نئی خوشی سے ہمکنار کرتا تھا۔

ابا میاں، اماں، آمنہ اور اللہ رکھی باجی کے تحائف کا پارسل اسے رات ہی مل گیا تھا۔ لیکن اس سب کے دوران، ایک ہی خیال اس پر حاوی رہا۔

’کاش، نظیف یہ دن بھول نہ جائیں۔‘

اس کے میکے میں، ہمیشہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو سادگی لیکن بے حد محبت سے منایا جاتا تھا۔ وہ سب یہ جانتے تھے کہ اس سے زندگی میں جو رنگ بھر جاتے ہیں وہ تمام عمر، ساتھ نباہتے ہیں۔ شیما چاہتی تھی کہ یہی انداز اسے اپنے گھر میں، نئی زندگی میں بھی ملے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر نظیف کو یاد نہ رہا تو اسے کتنی مایوسی ہوگی۔

اسی خیال میں گم، شیما کالج سے واپس آئی اور امّی جان کے کمرے میں گئی تو وہ ’ناسازیٔ طبع‘ کے باعث، سر سے پاؤں تک چادر لپیٹے، دیوار کی طرف منہ کیے، لیٹی تھیں۔ اس کے پاؤں کی چاپ سن کر بھی وہ بے خبر رہیں۔ اب شیما میں تو اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ ان کی خیریت دریافت کرتی۔ اگر چہ وہ جانتی تھی کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں، حالات زیادہ خراب ہو سکتے تھے۔ وہ متفکر سی، اپنے بیڈ روم میں گئی اور وہاں اس نے جو دیکھا، وہ اسے خوشی سے ناچنے پر اکسا رہا تھا۔

میز پر ڈھیر سارے سرخ گلاب، چاکلیٹ کا بڑا سا خوبصورت ڈبّہ اور ایک ملفوف کارڈ پڑا تھا۔ جس میں نظیف نے اس کی سالگرہ پر نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے

ہاتھ سے ’ڈینیل ہاگن‘ کی نظم لکھی تھی۔

(یہ ممکن ہے	Even
کہ ایک ایسا دن	If a day
گزر جائے	should go by
جب میں نہ کہہ پاؤں کہ	when I don't say
’’مجھے تم سے محبت ہے‘‘)	"I Love You"
(لیکن کبھی ایسا نہ ہو	May never a
کہ ایک لمحہ بھی گزرے	moment go by
تمہیں یہ	without you
نہ جانتے ہوئے کہ	knowing I do.

’’مجھے تم سے محبت ہے‘‘

شیما جہاں خوش تھی، وہاں پریشان بھی تھی کیونکہ امّی جان کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ وہ جان گئی تھی لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو، امّی جان کی ’ناسازیٔ طبع‘ کی کیا وجہ بتائے گی؟

OO

آج، کافی دِن کے بعد دونوں اکٹھے باہر نکلے تھے۔ کیونکہ ایک تو نظیف بہت مصروف رہا تھا اور دوسرے شیما کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جب سے ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی تھی، کسلمندی اور اُبکائیوں نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ نظیف سے کہتی۔

’’اُف نظیف دِل بہت متلا رہا ہے۔‘‘

نظیف کہتا ’’اونہوں۔۔۔ چُپ۔۔۔ تعمیرات، اسی طرح سے ہوا کرتی ہیں۔‘‘

’’تعمیرات؟‘‘

"ہاں بھائی، جنّت تعمیر ہو رہی ہے نا۔"

اور وہ طبیعت کی خرابی بھول کر، خوبصورت خوابوں کی دُنیا میں کھو جاتی۔ اس وقت بھی، وہ جاگتی آنکھوں سے سپنا دیکھ رہی تھی۔

"میرے بچّے تم کیا جانو؟ تم نے مجھے کیا سے کیا کر دیا ہے۔ رین کے پیاسے میرے تن پر، پہلی برکھا برسی ہے۔ محبت کی بوند سے جیون پھوٹا ہے، جو میری کوکھ سے جنم لے گا۔ قطرۂ نیساں، جو موتی میں ڈھلے گا۔ یوں میں نے زندگی کے ذائقے کو چکھا ہے۔ میرا جسم تمہاری روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ اس میں کِھلے گلاب کی باس ہے۔۔۔ نارنجی اور گلاب رنگ اُفق۔۔۔ کمل کنجوں میں مہکتے، بہار کے بسنتی پھولوں کی سوگند۔۔۔ جل ترنگ بجاتی بوندیں۔۔۔ چاندنی کی پھوار میں چٹکتی کلیاں۔۔۔ رات کی اوس میں بھیگا سبزہ اور اس پر بہتی پُروا۔۔۔ سنن سنن۔۔۔ محبّت کا بانکپن اور تخلیق کا غرور۔۔۔ حسن۔۔۔ نیکی۔۔۔ خدا، آج سب پر مجھے یقین آ گیا۔ اعتبار کی طاقت نے مجھے سرخرو کر دیا ہے۔ یہ ازل سے ہوتا آیا ہے، زندگی کی بقا کا راز یہی ہے لیکن مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں کوئی انوکھا اور اچھوتا کام کرنے جا رہی ہوں، جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔

اگر وہ امّی جان کی خواہش کے مطابق بیٹا ہوا تو وہ کیسا ہو گا؟۔۔۔ نظیف کہیں گے یہ مجھ پر پڑا ہے، میں کہوں گی یہ ہو بہو میرے جیسا ہے۔ ہم دونوں اس بات پر جھگڑا کریں گے۔۔۔ لیکن نہیں، اگر وہ نظیف سے مشابہ ہوا تو مجھے اس پر اور زیادہ پیار آئے گا۔ وہ نظیف ہو گا، سرمدی پرچھائیں، ابا میاں کا سایہ۔ اس گھر میں ایک اور مرد ہو گا۔

اور اگر بیٹی ہوئی، جیسا کہ نظیف چاہتے ہیں، تو میرے ہنستے بستے آنگن میں، میرا بچپن پھر سے مسکرائے گا، میرے گزرے برسوں کا عکس جھلملائے گا۔ وہ میری دُنیا ہو گی، میری گیتی۔۔۔ میری جان سے سوا۔۔۔ میری رُوپ متی۔۔۔ میری نین تارا۔ میری ممتا اسے دیکھ کر کھلکھلائے گی۔ میری کوکھ جائی۔۔۔ اسے اپنی بانہوں میں جُھلاتے ہوئے میں

ویسا ہی محسوس کروں گی جیسا کہ اماں نے مجھے بانہوں میں لیتے ہوئے کیا ہو گا۔

لیکن شیما کے مقابلے میں نظیف کا رنگِ احساسِ تفاخر دو چند تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ شیما کو کسی اُونچے سنگھاسن پر بٹھا دے، جہاں وہ ہلے جلے بغیر، دھیرے دھیرے مسکراتی رہے، کسی ڈبیا میں بند کر کے 'لاکر' میں رکھوا دے، جہاں وہ زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رہے۔ بے اِنتہا مصروفیت کے باوجود، وہ بار بار آفس سے فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرتا رہتا اور اگر شیما پوچھتی "آپ کب تک آئیں گے؟" تو کہتا:

"بیگم صاحبہ، دِل تو چاہتا ہے کہ چوبیس گھنٹے آپ کے پاس رہوں، لیکن کیا ہے کہ

ع دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے"

اور تب شیما، اپنی تصوّراتی دُنیا سے باہر نکل آئی، جب اچانک چلتے چلتے، گاڑی کی بریکیں چرچرائیں اور وہ ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ نظیف نے شیما کو بانہوں کی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ پھر ڈرائیور سے بھی زیادہ تیزی سے نظیف گاڑی سے باہر نکلا۔ اچانک سامنے آ جانے والے رِکشہ کا ڈرائیور، بدتمیزی کے موڈ میں تھا۔ لیکن گاڑی کی نمبر پلیٹ دیکھ کر، ٹھنڈا پڑ گیا۔

نظیف بری طرح چنگھاڑ رہا تھا۔ پھر ڈرائیور کو رِکشہ کا نمبر نوٹ کرنے کا کہہ کر خود گاڑی میں آ بیٹھا۔ وہ متفکّر تھا۔ شیما کہنے لگی۔

"نظیف آپ اس طرح Shout کر سکتے ہیں، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ آخر ہو کیا گیا ہے؟ خدا کا شکر ہے، خیریت گزری اور یہ اس کا نمبر کیوں نوٹ کروا رہے ہیں؟"

"اتنا زور کا جھٹکا لگا ہے اور آپ کہہ رہی ہیں ہو کیا گیا ہے؟۔۔۔ اگر خدانخواستہ، آپ کو کچھ ہو گیا تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"شیما کے تن من پر اطمینان کی ٹھنڈی پھوار برسنے لگی۔ چاہے جانے کا احساس، کتنا دِل خوش کن تھا۔

ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر بیٹھا تو نظیف نے اسے واپس گھر چلنے کے لیے کہا۔

گھر پہنچتے ہی نظیف نے لیڈی ڈاکٹر کو فون کیا۔ وہ آئیں اور شیما سے تفصیل سننے اور معائنہ کرنے کے بعد کہنے لگیں:

"D.C صاحب تو اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ مجھے بھی پریشان کر دیا۔ ان کا تو دِل چاہتا ہے کہ آپ کو کانچ کی گڑیا کی طرح شوکیس میں سجا دیں۔ کہتے ہیں کہ عورت ماں بن کر بہت خوش ہوتی ہے لیکن میرا تجربہ تو یہ ہے کہ مرد، ایک تو باپ بننے پر خوش ہوتا ہے اور دوسرے اپنی مردانگی کو تقویت ملنے پر۔ اس کے لیے یہ ایک معرکہ سَر کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ بہر حال۔۔۔ فکر کی کوئی بات نہیں، سب خیریت ہے۔ خدانخواستہ کوئی تبدیلی محسوس کریں تو مجھے اطلاع کیجیے گا۔ اب آرام کیجیے۔"

رات کو شیما نے نظیف سے پوچھا۔

"آپ میرے لیے اِتنے پریشان تھے یا بچّے کے لیے؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟۔۔۔ ظاہر ہے آپ کے لیے۔۔۔ آپ ہیں تو بچّہ ہے۔"

شیما یہی سننا چاہتی تھی۔

وہ دِل ہی دِل میں، امجد اسلام امجد کی نظم دُہرا رہی تھی۔

محبّت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے!
کہ یہ جتنی پرانی، جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اسے تائیدِ تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے
یقین کی آخری حد تک دِلوں میں لہلہاتی ہو!
نگاہوں سے ٹپکتی ہو، لہو میں جگمگاتی ہو!
ہزاروں طرح کے دِل کش، حسین ہالے بناتی ہو!

اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے۔
محبّت کی طبیعت میں عجب اقرار کی خُو ہے
کہ یہ اقرار کے لفظوں کو سننے سے نہیں تھکتی
اسے بس ایک ہی دُھن ہے
کہو۔۔۔ "مجھ سے محبّت ہے۔"
کہو۔۔۔ "مجھ سے محبّت ہے۔"

OO

شیما کالج سے واپس آئی تو بیگم A.D.C.G. کا فون آیا۔

"السلامُ علیکم۔ مسز نظیف! کیسی ہیں آپ؟ میں نے، آپ کو پہلے بھی فون کیا تھا لیکن آپ کالج تشریف لے جا چکی تھیں۔ دراصل آپ کو زحمت دینا تھی۔ کل گیارہ بجے میں 'بادا موں کا ختم شریف' دلا رہی ہوں۔ آپ ضرور تشریف لائیے گا۔ جمعہ ہے، اس وقت تک آپ فارغ ہو جائیں گی۔ ویسے اگر آپ اجازت دیں تو میں، ابھی خود، دعوت دینے کے لیے آ جاتی ہوں۔"

"بہت شکریہ مسز قاسم! آپ ضرور آئیے لیکن اس کام کے لیے نہیں۔ آپ کا دعوت نامہ مجھے مل گیا ہے۔ میں کل کالج سے واپسی پر آپ کے ہاں پہنچ جاؤں گی۔ تھوڑی بہت دیر سویر ہو جائے، تو اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔"

شیما نے وعدہ تو کر لیا، لیکن صحیح طور پر سمجھ نہیں پائی تھی کہ یہ بادا موں کا ختم ہوتا کیا ہے؟ چونکہ یہ سراسر مذہبی معاملہ تھا اور یوں بھی وہ بحیثیت بیگم ڈی۔ سی۔ اپنی کم علمی کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے اس نے سوچا کہ کل سٹاف روم میں بات کرے گی، کیونکہ کالج میں تو وہ لوگ نہایت سادگی اور بے تکلّفی سے، ایک دوسرے سے کسی بھی بات پر Discussion کر لیتی تھیں۔

لیکن جب وہاں بھی سب نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ اسی مخمصے کی کیفیت میں، کالج سے واپسی پر ختم میں شرکت کے لیے چلی گئی۔

بیگم .A.D.C.G نے گیٹ کھلتے ہی، پورٹیکو تک آ کر اس کا استقبال کیا۔ بیگم .A.C اور چند اور خواتین بھی ساتھ تھیں۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ کسی طرح سے بیگم .D.C کو گود میں اُٹھا کر کمرے تک لے جائیں۔ ان کے بچھ بچھ جانے کے مصنوعی انداز سے، شیما کو بہت اُلجھن ہو رہی تھی۔ کمرے میں قالین پر سفید چاندنی بچھی تھی اور وہ خواتین جن کے شوہر 'دوسرے درجے' کے آفیسر تھے، مودّب کھڑی تھیں۔

شیما نے کاٹن کا ہلکا فیروزی سوٹ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں سادہ سی چپل، دائیں کلائی میں گھڑی اور بائیں ہاتھ میں منگنی والی انگوٹھی۔۔۔ بیگمات کو ناک بھوں چڑھانے کا تو یارانہ تھا، ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے ہی دیکھ پائیں۔ وہ خود تو یوں بجی سنوری تھیں کہ شیما کو گمان ہوا کہ شاید 'باداموں کے ختم' میں داخلے کی شرط 'چوتھی کا جوڑا' رکھی گئی ہے۔ رنگ و بو کا طوفان تھا۔ مصنوعی پن اور بے جا تکلّف۔ شیما کا تو تھوڑی دیر میں ہی دم گھٹنے لگا۔ (خدا کا شکر ہے میں نے سروس منقطع نہیں کی۔ میں تو یہاں بہت Miss Fit ہوں۔ اس نے سوچا)

وہاں شیما کا ہی انتظار تھا۔ سبھی خواتین چاندنی پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئیں تو مشروب پیش کیا گیا۔ شیما کا تجسّس برقرار تھا کہ آخر 'باداموں کا ختم شریف' ہے کیا؟ تھوڑی دیر کے بعد خوب صورت ٹوکریوں میں تھوڑے تھوڑے بادام ڈال کر سب کے سامنے رکھ دیے گئے۔

بیگم .A.D.C.G نے وضاحت ضروری سمجھی۔

"پچھلی بار میں نے کاغذی بادام منگوائے تھے لیکن آپ جانتی ہیں کہ ان کا چھلکا، بھربھرا ہوتا ہے۔ اس سے ہاتھوں پر یونہی کھردرا پن آ گیا تھا۔ اس لیے، اس بار عام بادام منگوائے ہیں۔ ان پر آیت کریمہ پڑھنا ہے۔ بسم اللہ کیجیے۔"

چکنے چکنے باداموں میں ہاتھ چلاتے ہوئے بیگم .A.C نے، بیگم .A.D.C.G

کے خیالات کی تائید کی۔ پھر سب لوگ پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔ ایک بار آیت کریمہ پڑھ کر ایک بادام الگ کر دیا جاتا۔ ایک خاتون بہت جلدی جلدی بادام ہٹاتی جا رہی تھیں۔ شیما نے بھی محسوس کیا لیکن خاموش رہی۔ آخر تحصیلدار صاحب کی سادہ سی، قدرے عمر رسیدہ بیگم نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

"آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟"

"وہی جو سب پڑھ رہے ہیں۔۔۔ آیت کریمہ"

"وہ کیسے؟"

"آیت کریمہ۔۔۔ آیت کریمہ۔۔۔ آیت کریمہ۔"

ان خاتون نے تیزی سے بادام ہٹاتے ہوئے کہا۔ تمام تر تقدّس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، بیگمات کا زوردار قہقہہ گونجا۔

بمشکل آدھ گھنٹے میں 'باداموں کا ختم شریف' تمام ہوا۔ ان 'انجان بیگم' کا حال دیکھتے ہوئے شیما کو یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ باداموں پر گن کر پڑھنے سے اس ختم کی افادیت میں نعوذ باللہ کچھ اضافہ ہو جاتا ہے؟ یہ عمل تو تسبیح کے دانوں یا انگلیوں پر بھی ہو سکتا تھا۔

ختم سے فارغ ہو کر سب خواتین ڈائننگ روم میں آ گئیں، جہاں نہایت پُرتکلّف چائے پیش کی گئی۔۔۔ ان گنت لوازمات اور بے بہا تعریفیں اور ساتھ میں کسی اور ختم شریف میں پیش کی جانے والی چائے کی بدتعریفی۔

بیگم .A.D.C.G نے شیما کی خصوصی خاطر داری کے لیے اس کے پاس کھڑے ہو کر باتیں شروع کر دیں۔

"مسز نظیف! چکن تکّہ لیجیے۔ بہت اچھا ہے۔ ہمارے ہاں مرغی اور بکرے کا گوشت ہی پکتا ہے۔ بڑا گوشت تو ہم چھوتے بھی نہیں۔" انہوں نے نخوت سے کہا۔

پھر وہ ایک ڈش لے کر آئیں اور شیما کو پیش کرنے لگیں۔

''مسز نظیف! یہ ہنٹرز بیف چکھیے۔ سن شائن بیکری والے کمال کا بناتے ہیں۔ میں تو گھر میں ختم ہی نہیں ہونے دیتی۔'' لہجہ، بے پناہ تفاخر لیے ہوئے تھا۔

(شاید یہ بیف کے معنی نہیں جانتیں۔ شیما نے سوچا)

کھانے کے لوازمات سے انصاف کرنے کے بعد سب خواتین چائے کی پیالیاں ہاتھ میں لیے ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ یہاں ہونے والی گفتگو سے شیما کو اندازہ ہوا کہ بیگم A.D.C.G. نے فرنیچر تبدیل کیا ہے اور یہ ختم بھی دراصل اسی کی رونمائی کے سلسلے میں تھا۔

شیما دل ہی دل میں نظیف کی شکر گزار تھی کہ اس نے اسے نوکری چھوڑنے کے لیے نہیں کہا تھا، ورنہ وہ بھی اسی ماحول کا ایک حصّہ ہوتی۔ جس میں اس کی اپنی کوئی پہچان نہ ہوتی۔ وہ بھی نظیف کے جونیئر افسران کی بیگمات کی بلاوجہ کی خوشامد اور چاپلوسی کی عادی ہوجاتی اور جواباً ایسی ہی حرکات اسے نظیف کے سینئر افسران کی بیگمات کے ساتھ روا رکھنا پڑتیں۔ اب اس کی اپنی ایک شناخت ہے۔ مختلف علوم سے متعلقہ خواتین، اس کے حلقۂ احباب میں شامل ہیں جن سے بات چیت کرکے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کے رویّے بھی یکسر مختلف ہیں۔ ظاہری نام ونمود کا نشان نہیں۔۔۔ آپس کے تعلقات میں بناوٹ کا عنصر بالکل بھی نہیں ہے۔ سادگی، خلوص اور محبت۔۔۔ زندگی میں اور کیا چاہیے؟

OO

لیبر روم میں شیما کو ہوش آیا تو ڈاکٹر صاحبہ اس کے پاس کھڑی تھیں۔

''کیسی طبیعت ہے آپ کی مسز نظیف؟''

''مَیں ٹھیک ہوں۔'' شیما نے نقاہت بھرے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا

''اور۔۔۔؟''

''اللہ تعالیٰ نے بہت پیاری بیٹی دی ہے آپ کو۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ مَیں نے اپنے اتنے سالہ تجربے میں پہلی بار، کسی بیٹی کے باپ کو اتنا خوش دیکھا ہے، جتنا کہ

D.C. صاحب ہیں۔''

(تو نظیف کی خواہش پوری ہوگئی!)

شیما، گیتی کو لے کر گھر آئی تو امّی جان نے 98°F. بخار کی حالت میں، پھولے ہوئے منہ کے ساتھ، اسے پہلی بار دیکھا۔ کیونکہ ہسپتال جانے کی تو انھوں نے زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔

شام کو امّی جان کی ایک پرانی دوست بچّی کو دیکھنے آئیں تو انھیں مجبوراً، دوبارہ شیما کے کمرے میں آنا پڑا۔۔۔ وہ اب بھی پہلے والے موڈ میں تھیں۔

''بہت بہت مبارک ہو، ماں کو بھی اور دادی کو بھی۔'' مہمان نے گیتی کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

''مبارک؟'' امّی جان نے تلخ لہجے میں کہا ''مَیں تو پوتا چاہتی تھی۔''

''وہ بھی خدا دے دے گا، پہلے اس کا تو شکر ادا کرو۔ کیا ہوگیا ہے تمھیں؟ یہ نعمت تو۔۔۔ دُور کیوں جانا؟ نعمانہ کی طرف ہی دیکھ لو اور پھر تمہارے اکلوتے بیٹے کی پہلی اولاد ہے۔ تمھیں تو چاہیے کہ سجدے سے سَر نہ اُٹھاؤ۔''

(''اے میوہ تے نہ لکھیں نہ ہزاریں'' شیما کو مسز عالم کی نانی جی کی بات یاد آئی۔)

لیکن امّی جان، اپنی دوست کی بات سمجھنے کی بجائے تنتناتی ہوئی چلی گئیں۔

''یہ عورت سمجھنے والی نہیں ہے۔ بیٹی، تم خیال نہ کرنا۔''

پھر انھوں نے گیتی کے سر پر پیار کیا اور دُعا دی۔

امّی جان کے رویّے سے، شیما ایک دم بجھ سی گئی۔ نصیباں اس کی پائنتی میں بیٹھ کر اسے دبانے لگی اور ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگی۔

''بیگم صاحبہ، دِل برا نہ کریں۔ گاؤں میں تو بیٹی پیدا ہونے پر لوگ 'پھوڑی' ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں، لیکن یہاں پر تو ایسے نہ ہو، نا! اور پھر لوگ تو ایسے کرتے ہی ہیں پر اپنے تو

نہ کریں۔ جب ریحانہ پیدا ہوئی تو جو عورت اسے دیکھنے کے لیے آتی ٹھنڈا 'ساہ' بھر کے کہتی۔

''اچھا۔۔۔ ہنیری آئی ہے مینہ بھی آئے گا۔''

پر مجھے تو ریحانہ ہنیری نہیں لگتی تھی۔ میری ساس کہتی تھی۔

''نصیباں ہمارے گھر رحمت آئی ہے۔ دُعا کیا کر نیک ہو، نیک نصیبوں والی ہو۔''

انھیں اپنی زینب سے بھی بہت پیار تھا۔ ارشد کے ابّے جنّتی کی ایک ہی بہن ہے۔ سارے گھر کی لاڈلی تھی اب تو اپنے گھر میں اڈّی گڈّی (قائم دائم) ہے۔ جب بھی آتی ہے میرے گلے لگ کر بہت روتی ہے۔ بھرا کو بڑا یاد کرتی ہے۔ بیگم صاب ہم میں ساری عمر نان بھرجائی (نند بھاوج) والی کوئی بات نہیں ہوئی۔ مجھے بھی وہ اپنی دِھی ہی لگتی ہے اور اس نے بھی مجھے بڑی عزّت دی ہے۔ جب میں بیاہی آئی تو وہ چھ سات سال کی تھی۔ رمضان میں روز کہتی میں نے روزہ رکھنا ہے اور سرگی کے وقت سو کر نہ اُٹھتی اور جب دِن چڑھے اُٹھتی تو رونا شروع کر دیتی۔ ایک دِن سرگی کے وقت اُٹھ گئی اور اُونگھتے اُونگھتے روٹی کھانے لگی، جب سرگی ختم ہونے کا ٹیم ہوا تو ارشد کے ابّے سے چھوٹا میرا دیور باہر جا کر کھڑا ہو گیا۔ مُلّا نا اِدھر سے گزر کر مسجد میں اذان دینے جاتا تھا، جیسے ہی وہ نظر آیا اس نے جا اس کو جپھا مارا۔ کہنے لگا۔

''ہماری کُڑی ابھی روٹی کھا رہی ہے اور تم اذان دینے لگے ہو؟''

اور اس کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک زینبے نے اندر سے پکار کر نہیں کہا۔

''بھا۔۔۔ میں نے روٹی کھا لی ہے۔''

میرے سوہرے کو پتا چلا تو اس نے میرے دیور کی بڑی 'کُتّے کھانی' کی۔

زینب کھانے پینے میں بڑے نخرے کرتی تھی۔ جب اِتنے لاڈ کرنے والے ہوں تو خواہ مخواہ ہی بندہ ایسا ہو جاتا ہے سالن تو کھاتی ہی نہیں تھی۔ بے بے کہتی۔

''دھیئے، اسے 'بھولا باندر' بنا دے۔ ویسے یہ کچھ نہیں کھائے گی۔''

''بھولا باندر؟''

''ہاں، میں دیسی گھی گرم کر کے، اس میں گڑ کوٹ کر ڈال دیتی تھی۔ اس کے ساتھ روٹی کھاتی تھی۔ بے بے اسے بھولا باندر کہتی تھی، پتا نہیں کیوں؟ یا پھر، جب چاول اُبالتے تھے تو چاولوں پر شکر کی تہہ جما کر اُوپر سے گرم دیسی گھی ڈال کر 'پریہا' (پنجاب میں اس انداز سے بنائے گئے چاولوں کو کہتے ہیں) بنا کر دیتی تو خوش ہو جاتی۔ وہ تو خیر سارے ہی کھاتے تھے۔ ان چاولوں کی مہک ہی 'وکھری' ہوتی تھی، گرم گرم 'سوات' (سیدھا سادہ سا باورچی خانہ) میں بیٹھ کر کھانے کا مزہ آ جاتا تھا۔''

''نصیباں، کسی دِن بنائیے گا، میرے تو منہ میں پانی آ رہا ہے۔''

''نمک والی چیز، تو لگتا تھا، حکیم نے زینب کو منع کر رکھی تھی۔''

نصیباں ماضی میں کھوئی ہوئی تھی۔

''کبھی کہتی، گڑ اور تل کی 'چانڈ' (گڑ کو اتنا گرم کیا جاتا کہ وہ پگھل جاتا، پھر اس میں تل مِلا دیئے جاتے۔ وہ ٹھنڈا ہو کر دوبارہ جم جاتا) بنا دو۔''

شیما، بڑے غور سے نصیباں کی باتیں سن رہی تھی۔

''جب گندم پک جاتی تو بے بے اس میں سے جو الگ نکال لیتی اور 'جھیری' (بھٹیارن) سے بھٹی پر بھنوا لیتی اور پھر چکی پر پیس لیتی اور روز شام کو شکر کے شربت میں یہ ستّو مِلا کر ہم سب پیتے۔ زِینبے، ستوؤں میں تازہ مکھن اور شکر مِلا لیتی اور کھاتی پھرتی۔ بے بے کچھ جو 'چھڑ کر، کوٹ کر' چھلکا اُتار کر رکھ لیتی اور جب ارشد کا ابا چھٹی پر آتا تو یہ سلیٹی رنگ کے جو، دالیں، چاول اور گوشت مِلا کر 'ست ناجا' (سات اناج) پکاتی۔ ارشد کے ابّے کو بہت پسند تھا۔ وہی جسے صاب لوگ 'لحیم' کہتے ہیں۔''

''نصیباں لحیم نہیں، حلیم۔'' شیما نے تصحیح کی۔

''ہاں، ہاں، وہی۔۔۔ اور جب ریحانہ پیدا ہوئی تو میرے سوہرے میں تو دم

ہوتا تو لُڈّیاں ڈالتا۔ فہیم نے اسے بے دم کر دیا تھا لیکن وہ سیانا بہت تھا۔ ریحانہ کو گود میں لے کر بڑی باتیں کرتا۔

"تو بڑی ہو گی۔۔۔ میں خود تمہیں سکول چھوڑنے جایا کروں گا۔۔۔ تو میرے لیے چاء بنایا کرنا، مجھے گولی لا کر دیا کرنا۔"

میری ساس ہنستی۔

"خدا کے لیے اسے اب اس کام پر نہ لگا لینا۔ اسے تو بتانا بھی نہ، بے چاری اپنی سہیلیوں کے سامنے شرمندی ہو گی۔"

"بابا، ریحانہ کو گود میں بٹھا لیتا اور پوچھتا، دِھی رانی تو 'بی بی' ہے کہ 'گولی'۔"

ریحانہ بڑے پیار سے کہتی:

"بی بی" تو بابا اسے گلے سے لگا لیتا اور جب بھی ریحانہ شرارت کرتی تو کہہ دیتی:

"میں گولی ہوں، بابا جی۔"

تو بابا ہنستا اور کہتا "ابھی ٹھیک کرتا ہوں تجھے۔" یہ کھیل وہ دِن میں کئی بار کھیلتے تھے۔

شیما پڑھے لکھے اور اَن پڑھ لوگوں کا موازنہ کر رہی تھی۔

○○

نظیف، دوپہر کو آفس سے دیر سے گھر لوٹا، تو اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ یوں تو اب یہ معمول بن گیا تھا۔ اگر کسی دِن وہ خوشگوار موڈ میں ہوتا بھی، تو امّی جان کوئی قصہ چھیڑ دیتیں اور بالکل ویسی ہی بات ہو جاتی کہ

؎ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذِکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اور شیما، سوچتی ہی رہ جاتی کہ یہ واقعہ کب ہوا تھا؟ جس کا اِتنا تفصیلی ذِکر امّی جان کر رہی ہیں۔ شیما اپنے ناکردہ گناہ پر سہم جاتی، لیکن ماحول کو مزید خراب ہونے سے بچانے

کے لیے اپنے دفاع میں کچھ کہہ نہ پاتی۔ اب بھی اس نے ڈرتے ڈرتے، نظیف سے پوچھا۔

"آپ آج کھانے کے لیے نہیں آئے؟"

"تمہارے ہی کیے پر، پریشان ہوتا رہا۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟" شیما نے حیرانی سے کہا۔

"میرا اور تمہارا جو Joint account تھا اس کی رقم کہاں گئی؟ تم نے یہ پیسے کب نکلوائے اور کیوں؟"

نظیف ایک سان بولتا چلا گیا، مانو کسی ملزم سے بات کر رہا ہو، اسے صفائی کا موقعہ دیئے بغیر۔

"میں نے کوئی رقم نہیں نکلوائی۔ میرے پاس چیک بک ہی نہیں تھی، مجھے تو آپ نے صرف بتایا تھا کہ کچھ رقم اس اکاؤنٹ میں رکھوائی ہے آپ نے۔"

شیما نے آہستگی سے کہا۔

"تو پھر وہ رقم کیا ہوئی؟ تمہیں ضرورت تھی تو مجھ سے 'مانگ' لیتیں لیکن یہ تو کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے۔"

نظیف کی آواز کمرے سے باہر تک جا رہی تھی۔

(اس قدر بد اعتمادی۔۔۔ مجھے اپنا آپ، انتہائی کم تر لگ رہا ہے۔ میں پیسوں کے لیے ایسا کروں گی؟ جن کو میں نے کبھی، بے جا اہمیت ہی نہیں دی۔ نظیف کی تنخواہ میں سے مجھے صرف اِتنا ملتا ہے کہ بمشکل گھر چل سکے۔ اس سے زیادہ کی، نہ میں نے کبھی چاہ کی اور نہ فرمائش۔ بلکہ میری اپنی تنخواہ بھی گھر میں ہی خرچ ہو جاتی ہے، لیکن میں نے کبھی اس پر بھی توجّہ نہیں دی، پھر میں ایسا کیوں کروں گی؟ شیما نے سوچا۔)

شیما، دو دِن سہمی سہمی پھرتی رہی اور نظیف منہ پُھلائے۔۔۔ غضبناک نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

تیسرے دِن وہ ہنستا ہوا گھر آیا۔

''اس رقم کا پتا چل گیا ہے۔ میں نے ہی نکلوالی تھی۔ چیک بُک، میرے کاغذوں میں سے مِل گئی ہے۔ لیکن یہ تمہارا موڈ کیوں خراب ہے؟''

''میرا موڈ کیوں خراب ہونے لگا؟ یہ بھی بھلا کوئی بات ہے موڈ خراب کرنے والی۔'' شیما نے طنزاً کہا۔

''بس بس۔۔۔ زیادہ تقریر کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک تو تم عورتوں کی یہ عادت بہت بُری ہے کہ چھوٹی سی بات کو دِل پر لے لیتی ہو۔'' نظیف کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

('چھوٹی سی بات'۔۔۔ اس چھوٹی سی بات کے نتیجے میں، دِل کی کرچیاں چنتے اِک عمر بیت جائے گی میری۔۔۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں انسان محبّت کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں اور روپیہ استعمال کرنے کے لیے۔۔۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ انسان استعمال کیے جاتے ہیں اور روپے پیسے سے پیار کیا جاتا ہے۔

نظیف آپ خود تو واقعتاً 'چھوٹی چھوٹی باتوں' کا بُرا مانتے ہیں اور میری اُن باتوں پر دِل آزاری کرتے ہیں جو میں نے کی ہی نہیں۔۔۔ کیوں؟ آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟۔۔۔ پیار کا رِشتہ اِتنا نازک ہے کہ ایسی غلط فہمیوں سے، زندگی کی شاہراہ پر چلتے چلتے دِل برے ہو جاتے ہیں۔۔۔ ٹوٹ جاتے ہیں۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ انجانے میں ہاتھ بھی چھوٹ جائیں۔

بڑے بڑے جھگڑوں سے تعلقات ختم ہو جاتے ہیں، لیکن چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں، تعلقات میں تلخیاں پیدا کر دیتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرح برباد ہو جانے والے تعلق، ختم ہو جانے والے تعلقات، سے زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں اور کچھ لوگ جب اسے نہیں سمجھتے تو زندگیاں جہنّم بننے میں دیر نہیں لگتی۔

شیما، نظیف کی نظروں سے دُور، پچھلے برآمدے میں اکیلی بیٹھی خیالوں میں گم

تھی اور آنسو خاموشی سے اس کی گالوں پر پھسل رہے تھے۔

چھوٹے چھوٹے گھریلو معاملات میں، جب کبھی مشاورت کی ضرورت ہوتی اور شیما کچھ کہتی (بڑے معاملات کی تو اسے کبھی ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی تھی۔) تو نظیف ہتھّے سے اُکھڑ جاتا۔

''Dont dictate me''

شیما کہنا چاہتی، لیکن اس کا لہجہ سمجھ کر کہہ نہ پاتی کہ اس وقت آپ D.C نظیف ہارون نہیں ہیں، جسے اس ضلع میں کوئی dictation نہیں دے سکتا۔ آپ وہ نظیف ہارون ہیں، جس نے مجھے اپنی زندگی کا ہم سفر بنایا ہے۔ وہ دِل مسوس کر رہ جاتی کیونکہ اسے محسوس ہوتا تھا کہ نظیف اسے ایک باشعور اور پڑھی لکھی خاتون نہیں سمجھ رہا بلکہ اس کے نزدیک، وہ گھٹے ہوئے ماحول کی پروردہ، وہ عورت ہے جس کے بارے میں ایک عام جاہل مرد بھی یہ سمجھتا ہے کہ اس کی عقل چُٹیا کے پیچھے ہے۔ یوں شیما کو اپنا آپ، بہت گھٹیا لگتا۔

OO

''یہ سب بہانے ہیں نظیف، تم ان لوگوں کو نہیں سمجھتے، میں جانتی ہوں۔ یہ سارا 'چکّر' صرف اِس لیے چلایا گیا ہے کہ تمہاری ممانی جان آ رہی ہیں اور 'بیگم صاحبہ' ان سے ملنا نہیں چاہتیں۔'' امّی جان زہر اُگل رہی تھیں۔

''لیکن۔۔۔ امّی جان، سرمد کا دو بار فون آیا ہے کہ پروفیسر صاحب پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں۔ اس لیے شیما کو بھیج دیں۔''

''بھیج دیں، کیا مطلب؟ آتا اور لے جاتا، اگر ایسی ایمرجنسی تھی تو۔''

''وہ کہہ رہا تھا کہ ہسپتال میں ان کے پاس اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے وہ نہیں آ سکتا۔ اب میں، شیما کو ڈرائیور کے ساتھ بھجوا سکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے، مجھے خود بھی جانا چاہیے۔''

''شاباش ہے بیٹا! مَیں تمہیں کیا کہہ رہی ہوں اور تم سمجھنا ہی نہیں چاہ رہے۔ ٹھیک ہے جاؤ اور بیگم صاحبہ کو بھی لے جاؤ۔ اس نے تو تمہاری سوچنے سمجھنے کی حِس ہی ختم کر دی ہے۔ نوکری پتا نہیں کیسے کرتے ہو، وہ بھی اسی سے پوچھ کر، کرتے ہو گے؟ مَیں تمہیں ایک بار پھر بتا رہی ہوں کہ وہ صرف اور صرف تمہاری ممانی جان سے ملنا نہیں چاہتی۔ باقی تم خود جانو۔''

امی جان نے واش رُوم میں جا کر دروازہ دھڑ سے بند کر لیا تو نظیف فکر مند سا اپنے بیڈ رُوم میں آیا۔

شیما نے پوچھا۔

''خیریت؟ آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں؟''

''ہاں۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے سرمد کا فون آیا تھا۔ پروفیسر صاحب کو فالج ہوا ہے۔ ہسپتال میں داخل ہیں۔''

''کب سے؟ سرمد نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ وہ کیسے ہیں؟'' شیما بہت گھبرا گئی تھی۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ شیما ایک دم پریشان ہو جائے گی آپ اسے آرام سے بتا دیجیے گا۔''

''الٰہی خیر۔۔۔ تو نظیف پھر چلتے ہیں۔ میں ایک ہفتے کی چھٹی لے لیتی ہوں۔ آپ شام کو واپس آ جائیے گا۔''

''نہیں شیما۔ کل شام ممانی جان آ رہی ہیں۔ اگر آپ یہاں نہ ہوئیں تو انھیں برا لگے گا۔ آپ جانتی ہیں وہ پہلے ہی میرے رِشتہ کی وجہ سے ناراض ہیں۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے، لیکن وہ ایک ماہ کے لیے آ رہی ہیں۔ میں واپس آ کر ان سے مِل لوں گی۔ میں ابھی جانا چاہتی ہوں۔''

شیما نے بے تابی سے کہا۔

(تم تو نوکری بھی اسی سے پوچھ کر کرتے ہو گے؟۔۔۔ تمہاری تو سوچنے سمجھنے کی

حِس ہی اس نے ختم کر دی ہے۔)

نظیف کا موڈ یک دم بدل گیا۔

''تم ہر وقت مجھے Dictate نہ کیا کرو۔ میں نے جو کہا ہے وہ تمہیں سمجھ نہیں آیا۔''

''لیکن۔۔۔ ابا میاں۔۔۔'' شیما بے اختیار رو دی۔

''یہ ٹسوے بہانے بند کرو۔ میں تم لوگوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ سب بہانہ بازی ہے۔ تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ لیکن یہ سوچ لو، تم جاؤ گی میری مرضی کے بغیر اور آؤ گی میری مرضی سے۔ اگر میں چاہوں گا تو۔۔۔''

نظیف غصّے میں تنتناتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

شیما کا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا۔

اس نے گھر پر فون ملایا۔

''آمنہ، ابا میاں کیسے ہیں؟''

''آپ ابھی تک روانہ نہیں ہوئیں؟ جلدی آئیں نا! ابا میاں کے جسم کا دایاں حصہ متاثر ہوا ہے۔ ادویات کے زیرِ اثر، نیم بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ بار بار آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر پُراُمید ہیں، بہرحال پریشانی تو بہت ہے۔ اماں، آپ کو جلد آنے کا کہہ رہی ہیں۔''

''وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ میرے پاؤں میں زبردست قسم کی موچ آئی ہے۔ چل بھی نہیں پا رہی، ایک دو دِن تک آؤں گی۔''

''آپی، اب ایسا بھی کیا ہے؟۔۔۔''

شیما نے فون بند کر دیا۔ اس کے بعد گھنٹی مسلسل بجتی رہی لیکن وہ دوبارہ فون اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکی۔

رات کیسے کٹی؟ دِن کیسے گزرا؟ وہ کالج بھی نہ جا سکی۔ دوپہر کو پتا چلا کہ نظیف کی

ممانی کی فلائیٹ لیٹ ہے اور وہ کل دو پہر پہنچ رہی ہیں لیکن امّی جان نے تو کیا کہنا تھا، نظیف نے بھی جھوٹے منہ اسے جانے کے لیے نہیں کہا۔ اُلٹا منہ پھلائے، پھرتا رہا۔

اگلے روز، صبح صبح تایا ابا آ گئے۔ شیما انھیں دیکھ کر بھاگتی ہوئی آئی اور ان کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ابا میاں کیسے ہیں؟ آپ کب آئے تایا ابا؟''

''پہلے سے بہتر ہیں بیٹی۔ مَیں رات ہی پہنچا ہوں۔ آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں، اس لیے مَیں آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔''

وہ شیما کے پاؤں کو ٹھیک دیکھ کر حیران ہوئے لیکن اس کا اُجاڑ حلیہ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر، سب سمجھ گئے۔

شیما نے رحم طلب نظروں سے نظیف کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔ ممانی جان کا کیا ہے؟ تم نہیں ملو گی تو۔۔۔'' نظیف نے طنزاً کہا۔

تایا ابا خاموش تھے، کسی گہری سوچ میں گم۔

OO

موڑ کاٹتی ہوئی سڑک کے برابر میں، ذرا اُونچائی پر سرخ رنگ کا بڑا سائٹینٹ لگا ہوا تھا۔ اردگرد، رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے' قطار اندر قطار' خوش رنگ کرسیوں کی قوسِ قزح تھی۔ دہکتے کوئلوں کے بڑے سے دائرے کے گرد، مرغ کی سجّی تیار ہو رہی تھی۔ کڑاہی گوشت کباب اور تکّے کے سٹال تھے۔

نظیف نے گاڑی روک دی۔

دُور دُور تک پہاڑ، بادلوں میں گم تھے۔ ہلکی پھوار، جسے پھوار بھی نہیں کہنا چاہیے، چہرے سے ٹکراتی تو خوشبودار ٹھنڈک، دِل میں اُتر جاتی۔ جنگلی کوسموس کے پھولوں کا ایک چھوٹا سا Garland سر پر ٹکائے، اِدھر اُدھر بھاگتی ہوئی گیتی، خود ایک متحرک پھول لگ رہی تھی۔

''اچھی صاف ستھری جگہ ہے۔ کھانے کا وقت بھی ہو رہا ہے۔ یہیں رُک جاتے ہیں۔'' نظیف نے کہا۔

''بالکل۔۔۔ یوں بھی آپ کو اب رُکنا چاہیے۔ راستہ بے حد خوبصورت ہے لیکن دشوار گزار، ڈرائیونگ نے آپ کو تھکا دیا ہوگا۔۔۔'' شیما نے تائید کی۔

''گیتی تو تھکی ہوئی معلوم نہیں دیتی لیکن آپ 'دونوں' کو آرام کی ضرورت ہے۔'' نظیف نے معنی خیز انداز میں کہا۔

کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو نظیف نے بھی بمشکل چار دِن کی چھٹی لی اور وہ لوگ پہاڑ پر چلے آئے۔ نظیف کا کہنا تھا کہ شدید گرمیوں میں پہاڑ پر گزارے ہوئے چار دِن ہی، اسے سارا سال کام کرنے کے لیے توانائی دے دیتے ہیں۔ شادی کے بعد بھی اس نے یہی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ شیما تو سدا سے ان علاقوں کی دیوانی تھی۔ ابا میاں بھی ہمیشہ چھٹیوں میں انھیں گھمانے لاتے تھے۔ وہ بچّوں کو، ہوم ورک جلد ختم کرنے کا کہتے تو بچّے بھی سیر کے شوق میں، اس پر تیزی سے عمل کرتے۔

اس سال، امّی جان ان کے ہمراہ نہیں آئی تھیں۔ نظیف کی ماموں زاد کینیڈا سے آئی ہوئی تھی اور وہ اس کے پاس، رہنے کے لیے اپنے بھائی کے گھر چلی گئی تھیں۔ شیما، اپنی اس سوچ پر شرمندہ تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں، وہ خود کو کتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہے۔ وہ 'ساس بیزار' خاتون نہیں تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ ان کی طنزیہ گفتگو، بلا وجہ کی نوک ٹوک اور سخت طبیعت کی وجہ سے، وہ کسی بھی موقع پر بجھی بجھی سی رہتی تھی۔

نظیف نے کھانے کا آرڈر دیا تو شیما بھٹّی کے پاس جا کر، کڑاہی تیار ہوتے دیکھنے لگی اور ساتھ ساتھ باورچی سے، اس میں ڈالنے والے مصالحوں کے بارے میں پوچھنے لگی جو وہ اتنے فخریہ انداز میں بتا رہا تھا، جیسے ایٹم بم کا نسخہ منتقل کر رہا ہو۔

اتنے میں ایک اور، بہت قیمتی جیپ آ کر رُکی۔ ایک متموّل خان صاحب برآمد

ہوئے اور لمبا چوڑا آرڈر کرنے لگے۔ جیپ میں پردے لگے تھے اور چادروں میں لپٹی ہوئی
گوری چٹی خواتین اور ماڈرن لباس پہنے انگریزوں جیسے بچّوں کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

''بکرے کی ران روسٹ کرنے کا میں نے کہہ دیا ہے اور کڑاہی 'دیسی چوچے' کی
بنانا۔۔۔ اور ہاں دیر بالکل نہ لگے۔''

''نہیں صاحب، دیر بالکل نہیں لگے گی۔ چوچا پریشر کُکر میں گلالیں گے۔''

''او مڑا۔۔۔ چوچا ذرا کھڑا رکھنا۔۔۔ 'گیسٹرو ککّر' نے بھی کچھ کام کرنا ہے یا
نہیں۔'' خان صاحب نے ہدایات دیں۔

شیما لوگوں کا کھانا تیار ہو گیا تھا اور بے حد لذیذ تھا۔ گرم گرم، بھاپ اُڑاتا اور
خوشبودار۔ موسم کی خوب صورتی، ٹھنڈک اور مسحور کن گردوپیش نے اس کا مزا دوبالا کر دیا تھا۔

''یہی کھانا ہم اپنے گھر میں، کھانے کے کمرے میں کھاتے تو کبھی ایسا مزا نہیں
آتا۔'' شیما نے کہا۔

''اور تم اللہ کی کون کون سی نعمتوں کو ٹھکراؤ گے؟۔۔۔ چھُٹّی! شیما بیگم، چھُٹّی!۔۔۔
آپ کی جاب میں تو، سال بھر میں، چھ ماہ چھٹیوں کے ہوتے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ کبھی
کبھار لی جانے والی چھُٹّی کی میرے نزدیک کیا وقعت ہے؟ میری تو ہفتہ وار چھُٹّی بھی
مصروفیت میں ہی گزرتی ہے۔''

''جناب، ڈی سی صاحب بھی تو آپ ہی ہیں نا! ادھر ہم بے چارے، بے توفیقے
محکمہ تعلیم، کے جاں نثار۔۔۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔۔۔ ورنہ میری جگہ، میری عمر کا کوئی پروفیسر ہوتا تو کبھی
آپ کو نہ پاسکتا۔ میں اپنی جاب کا شکر گزار ہوں۔''

کھانے کے بعد انھوں نے چائے پی اور سفر جاری رکھنے کے لیے گاڑی میں آ
بیٹھے۔ ابھی انھیں کافی دُور جانا تھا۔

OO

پرہینا کاٹیج میں پھول بھرے پڑے تھے۔ دریا ساتھ لگ کر بہہ رہا تھا۔ پانی کے
بہنے کی آواز، ہوا میں نغمگی بکھیر رہی تھی۔ شیما گیتی کا ہاتھ پکڑے کمرے سے باہر نکلی۔
نظیف لان میں بیٹھا تھا۔ فضا میں رومان انگیز خنکی تھی۔ شیما بیٹھ گئی تو نظیف نے کہا۔

''ابھی ایک صاحب آنے والے ہیں۔ یہاں کے مقامی ہیں، لیکن پڑھے لکھے۔
سکول ماسٹر ہیں۔ کافی دِل چسپ آدمی ہیں۔ میری ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے ان
سے کہا ہے کہ ہمارے ساتھ چائے پئیں۔ آپ، مقامی تہذیب اور لوگوں کے روزمرّہ کے
بارے میں جاننے کا شوق رکھتی ہیں۔ ان سے گفتگو رہے گی۔''

تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر صیاد حسین چلے آئے۔ گٹھا ہوا جسم، چھوٹا قد، باریش،
تانبے جیسی رنگت اور بولتی ہوئی آنکھیں۔ ان کے ہاتھ میں مچھلی پکڑنے کی چھڑی تھی اور اس
کے ساتھ لٹکتی ہوئی ایک صحت مند ٹراؤٹ۔ سلور گرے رنگ کی مچھلی پر گلابی رنگ کے نقطے
تھے۔ ماسٹر صاحب نے مچھلی گیتی کو تحفتاً دی اور شیما سے اپنا تعارف کرانے کے بعد بے تکلفی
سے بیٹھ گئے۔

جب شیما نے بتایا کہ وہ بھی محکمہ تعلیم سے متعلّق ہے تو انہوں نے بہت خوشی کا
اظہار کیا۔

شیما ان سے، ان کے سکول کے بارے میں پوچھنے لگی۔ انہوں نے بتایا کہ پرائمری
سکول ہے۔ سوا سو کے قریب طالبِ علم ہیں جن میں بچّیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔
ماسٹر صاحب کے اپنے پانچ بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں اور وہ خود اپنی بچّیوں کو سکول بھیجنے کے حق
میں نہیں ہیں۔ وجہ صرف یہ بتائی کہ

''کیا کرنا ہے جی انھیں پڑھا کر؟''

ماسٹر صاحب نے بتایا کہ مچھلیاں پکڑنا ان کا شوق، بلکہ جنون ہے۔

''میں روزانہ اتنی ٹراؤٹ پکڑتا ہوں کہ مجھے ناشتے میں مِل جائے اور جو زیادہ ہو وہ بچے کھا لیتے ہیں۔''

شیما نے سوچا کہ ٹراؤٹ چھوٹی سی مچھلی ہے۔ ماسٹر صاحب، یقیناً مچھلیوں کی کافی تعداد روزانہ پکڑتے ہوں گے۔ جوان کے ناشتے سے بچ جانے کے بعد، ان کی کرکٹ ٹیم میں تقسیم ہوتی ہوگی۔۔۔بہر حال۔۔۔

''ماسٹر صاحب یہاں سردیوں میں کیا صورتِ حال ہوتی ہے؟''

''بس جی سردیاں تو عذاب ہی ہیں۔ ہر طرف برف ہی برف۔۔۔سردیوں کے لیے راشن جمع کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔ گرمیوں میں یہاں ٹماٹر بہت ہوتا ہے۔ وہ سکھا کر رکھ لیتے ہیں۔ سردیوں میں ان کا پوڈر اور نمک پانی میں ڈال کر اُبال لیتے ہیں اور تھوڑا سا مکّھن۔۔۔اگر گھر میں گائے ہو تو۔۔۔پھر صاحب لوگوں کے سوپ جیسی، جو چیز تیار ہوتی ہے وہ پیتے ہیں۔ ساتھ میں اخروٹ اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی۔ جنگلی پودینہ گرمیوں میں سکھا کر رکھ لیتے ہیں اور اخروٹ کا درخت تقریباً ہر گھر میں ہوتا ہے۔ کسی کسی دِن، گھی میں گُڑ گرم کر کے اس کے ساتھ روٹی کھاتے ہیں۔ وہ دن سمجھیں، ہمارے لیے عید کا دِن ہوتا ہے۔

گرمیوں میں شلغم کے قتلے اور گوبھی سکھا کر ہار سا پرو لیا جاتا ہے۔ ساگ بھی کاٹ کر سکھا لیتے ہیں۔ سردیوں میں ان کا سالن بناتے ہیں۔

گرمیوں میں، کبھی کبھار جنگلی بکرے کا شکار بھی مِل جاتا ہے، اگر مِل جائے تو پکا بھی لیتے ہیں اور سکھا کر سردیوں کے لیے بھی رکھ لیتے ہیں۔''

''اڑیال؟''

''نہیں جی، یہ اور چیز ہے۔ میں چھٹی والے دِن شکار کے لیے جاتا ہوں۔ کبھی تو کچھ مِل جاتا ہے اور کبھی سارا دِن، بھاگ دوڑ کر کے شام کو خالی ہاتھ، واپس آ جاتا ہوں۔

کچھ لوگ جو ہمّت رکھتے ہیں، وہ سردیوں کے لیے راشن جمع کر لیتے ہیں مثلاً میرے جیسے، جن کو تنخواہ ملتی ہے۔ باقی لوگوں کی زندگی تو بہت مشکل ہے۔ ہمارے گھروں میں راشن بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے کہ نجانے کب تک برف باری ہوتی رہے؟ ہم لوگ بھوک کے حساب سے نہیں کھاتے، راشن کی مقدار کے حساب سے کھاتے ہیں، جو کبھی بھی وافر نہیں ہوتا۔''

''اور گھر کیسے ہوتے ہیں؟'' شیما نے دِل ہی دِل میں پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''گھر؟ گھر کیا جی بس۔۔۔میرے پاس ایک ذرا بڑا کمرہ ہے۔ وہی میرا گھر ہے۔ اسی میں گائے کو باندھتے ہیں۔ اسی میں ایندھن رکھا جاتا ہے اور اسی میں ہم سب سوتے ہیں۔''

(اور اسی میں گیارہ بچّے پیدا ہوئے۔۔۔شیما حیران تھی۔)

''پانی کے کنارے رہتے ہوئے بھی پانی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ پینے کا پانی بھی برف پگھلا کر حاصل کیا جاتا ہے۔ کپڑے دھونے اور نہانے کا تو سردیوں میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''پوری سردیاں؟''

شیما کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔

''اور گھروں میں روشنی کا کیا انتظام کرتے ہیں؟''

''بس جی، Torch جلاتے ہیں۔۔۔'' ماسٹر صیّاد حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹارچ؟ لیکن وہ تو بہت مہنگی پڑتی ہوگی اور روشنی بھی ایک جگہ تک محدود رہتی ہوگی۔''

''ٹارچ کہاں جی۔۔۔میں نے تو یونہی مذاق میں کہا تھا۔ یہ دیار اور بیار کے درخت کی شاخ ہوتی ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں نا یہ سبھی درخت۔۔۔اس شاخ کو ہم 'دِلی' کہتے ہیں۔ اس پر ہمارا کچھ خرچ نہیں اُٹھتا۔ ہمارے گھروں میں مفت کی روشنی ہوتی ہے۔

صرف ماچس کا خرچ ہوتا ہے۔

روایت ہے کہ تنے سے الگ ہو جانے والی شاخ، درخت کی یاد میں جلتی ہے لیکن گھر کو روشن رکھتی ہے۔ دراصل اس میں تارپین کا تیل وافر مقدار میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ آسانی سے جلتی رہتی ہے لیکن اس سے دھواں بہت اُٹھتا ہے۔ اب، دِل جلے گا تو دھواں تو اُٹھے گا نا!'' ماسٹر صاحب نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اپنے شاعرانہ خیالات کا اظہار کیا۔

''سردیوں میں تو زندگی آسان ہے نا موت۔ سردیاں آنے سے پہلے لوگ لکڑی کو چیر کر تختے بنا لیتے ہیں اور بعض تو تابوت بھی بنوا کر رکھ لیتے ہیں کہ اگر برف باری کے دوران کوئی موت واقع ہو جائے تو میّت کو اس میں ڈال کر برف میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اُوپر سے اور برف گرتی رہتی ہے اور یوں لاش، سمجھیں سردخانے میں پڑی رہتی ہے، جب گرمیاں آتی ہیں اور برف پگھلتی ہے تو پھر اس تابوت کو زمین کھود کر اس میں دبا دیا جاتا ہے۔ لوگ تعزیت کے لیے بھی اسی وقت آتے ہیں کیونکہ سردی میں تو سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔''

شیما نے اس صورتِ حال کا تصوّر کر کے جُھرجُھری لی۔

''اور جب کوئی بیمار پڑتا ہے تب؟''

''بس جی جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔ اگر تندرستی ہو گئی تو ٹھیک ورنہ اللہ کی رضا۔۔۔ شکار کرتے ہوئے اگر کسی کے ہاتھ میں ریچھ لگ جائے تو اس کے مزے ہو جاتے ہیں۔ کافی پیسے کما لیتا ہے وہ۔''

''کھال سے؟''

''کھال سے بھی اور گوشت سے بھی۔''

''گوشت سے؟ ریچھ کا گوشت کھاتے ہیں؟'' شیما کو اُبکائی آئی لیکن اس نے اس پر قابو پالیا۔

''ریچھ تو گوشت خور جانور ہے پھر اس کا گوشت کھانا تو۔۔۔'' شیما نے بات کو دانستہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''وہ جی، خوراک کے طور پر نہیں کھاتے۔ علاج کے لیے کھاتے ہیں، دوائی کے طور پر، ٹی۔ بی کے مریض کو دیتے ہیں اور ریچھ کی چربی کو پگھلا کر رکھ لیا جاتا ہے۔ جوڑوں کے درد میں اس کی مالش کی جاتی ہے۔''

شیما کا دِل مالش کرنے لگا۔ اس نے موضوع بدلنے کو پوچھا۔

''شادی بیاہ کی تقریب کیسی ہوتی ہے؟''

''بہت رونق ہوتی ہے۔ جشن مناتے ہیں۔ عورتوں کی محفل الگ ہوتی ہے۔ گانے گاتی ہیں، ناچتی ہیں۔ مرد اپنے طریقے سے جشن مناتے ہیں، شراب پیتے ہیں۔'' ماسٹر صیّاد حسین نے بالکل بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

''نمازیں تو آپ پوری پڑھتے ہیں، پھر یہ شراب۔۔۔ اسلام میں۔''

''کس اسلام کی بات کر رہی ہیں آپ؟ مجھ سے پوچھیے، اس کاٹیج میں ٹھہرنے والے صاحب لوگ کیا کرتے ہیں؟ اکثر کے ساتھ عورتیں تو ہوتی ہیں لیکن وہ ان کی بیویاں نہیں ہوتیں اور جب وہ لوگ یہاں سے جاتے ہیں تو ان کے کمرے سے اتنی خالی بوتلیں نکلتی ہیں کہ بیرا انھیں بیچ کر مہینے بھر کی سگریٹ خرید لیتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم لوگ کبھی کبھار پیتے ہیں اور چھپاتے نہیں ہیں۔''

شیما نے خاموش ہو جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

ماسٹر صاحب کو بھی احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ بول گئے ہیں۔

''آپ کی یہ فشنگ لائن بہت اچھی ہے اور قیمتی بھی۔'' نظیف نے کہا۔

''یہاں پر فرانس سے ایک صاحب آ کر ٹھہرے تھے۔ میں نے انھیں بہت گھمایا پہاڑوں میں اور ٹراؤٹ مچھلی بھی بہت کھلائی۔ میری، ان کے ساتھ، دوستی ہو گئی تھی۔ واپس

جا کر انھوں نے یہ فرانس سے مجھے بھیجی تھی۔"

"بیٹا وہ دیکھو پری، گائے چرا رہی ہے۔" انھوں نے اِشارہ کر کے گیتی سے کہا۔

"اور ساتھ میں جنّ ہے؟" ایک جھڑوس سا آدمی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"نہیں، یہ جنّ کا باپ ہے۔" ماسٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا اور جانے کی اجازت چاہی۔ شیما نے ماسٹر صاحب کو، کھانے پینے کی چیزوں کا ایک بڑا لفافہ، ان کے بچوں کے لیے دیا۔ یہ چیزیں، وہ گیتی کے لیے ساتھ لائی تھی، لیکن وہ فکر مند تھی کہ شاید گیارہ بچوں کے لیے اتنی بڑی مقدار بھی ناکافی ہوگی۔

OO

پچھلے کئی دِن سے ایک نئی عورت کپڑے دھونے کے لیے آرہی تھی۔ نصیباں نے شیما کو بتایا تھا کہ سروری کی ساس بہت بیمار ہے، اس لیے وہ اپنے گاؤں گئی ہے اور کسی دوسری عورت کو اپنی جگہ پر چھوڑ گئی ہے، جو شیما کے کالج جانے کے دوران آتی اور کپڑے دھو کر چلی جاتی۔ اس لیے شیما اس سے مِل نہیں پائی تھی۔ آج کالج میں چھٹی تھی اور وہ پچھلے برآمدے میں بیٹھی ن۔م۔راشد کی شاعری سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

بنّو، صحن کے کونے میں کپڑے دھو کر الگنی پر پھیلا رہی تھی۔ ۳۰ سال کی دراز قد، شاندار عورت۔ واقعتاً ہرنی جیسی خوب صورت آنکھیں اور یہ لمبے بال۔ اس نے شلوار کے پائینچے چڑھا رکھے تھے اور گاؤدم پنڈلیاں جھانک رہی تھیں۔

وہ، شیما کو دیکھ کر ادھر چلی آئی۔

"سلاما لیکم بیگم صاب! آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ میرا نام بنّو ہے جی! آپ کیسی ہیں؟ آپ کالج میں پڑھاتی ہیں نا، جی۔۔۔ میں آپ کو آتے جاتے دیکھتی رہی ہوں۔۔۔ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ سروری خالہ آ بھی جائے، تو بھی مجھے فارغ نہ کرنا۔ میں ضرورت مند بھی ہوں اور خدمت گذار بھی۔ میری دو بچّیاں ہیں جی!"

بنّو بِنا توقّف بولے چلی جا رہی تھی۔

"اور میاں؟"

"وہ میرا خرچا نہیں اُٹھاتا جی۔"

"کیوں؟"

"اب اس کا میں کیا جواب دوں جی؟ لیں، میں آپ کو شروع سے ساری بات بتاتی ہوں۔" بنّو سب کام چھوڑ کر سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔

"بیگم صاب! شادی سے پہلے، پتا نہیں اس نے کب سے میرے پہ 'اکھ' رکھی ہوئی تھی اور پھر وہی جانے کیسے اس نے اپنے ابّے کو منایا۔ اُس جین جوگے نے ہماری 'دھلیز' گھسا دی۔ پر اس کی ماں کا تو کبھی ماتھا ہی نہیں کھلا۔ مجھے تو ہمیشہ ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتی ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے بیگم صاب! آنکھ ہے بھی ٹیڑھی۔" بنّو کھلکھلائی۔

"میری ماں نے اس کے ابّے کو کہا کہ بھائی جی، میں نے بیٹی شکور کو دینی ہے تو سارے ٹبّر سے تعلق رکھنا ہے۔ تمہاری بیوی کا تو منہ ہی سیدھا نہیں، اس لیے مجھے تو معافی دو۔ وہ بے چارہ رونے لگ گیا۔ کہنے لگا بہن جی اس کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ اس نے میری ساری زندگی برباد کر دی۔ اب بیٹے کی کرنے پر تلی ہے۔ اپنے جیسی کوئی لے آئے گی تو میرا گھر تو ختم ہو جائے گا نا! میری آپ سے 'مِنت' ہے۔ سچّی بیگم صاب! اس نے میری ماں کے گوڈے پکڑ لیے۔ پھر میری ماں مجبور ہو گئی۔ جب ماں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کیا کہنا تھا پر میں دل میں بہت خوش تھی کہ یہ میرا اتنا چاہ مند ہے۔ جب میں ویاہ کے گئی تو یہ آتے جاتے مجھے کھنگورا مارتا،

"ویکھیا۔۔۔ بازی جِت لئی نا۔"

میں بھی بہت خوش تھی۔ بیگم صاب! تب یہ کچھ دیر چنگا بھی بہت رہا۔ اس کی ماں کی میں ساری باتیں 'جھَل' لیتی تھی کہ چلو شکورا تو میرا خیال رکھتا ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ

ٹھیک ہوں تو اس کی ماں کے 'وہاڑ' سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟ لیکن بیگم صاب! بہت فرق
پڑتا ہے جی۔'' بنّو ایک سان بولے جا رہی تھی۔

''میری پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو یہ بہت خوش تھا لیکن اس کی ماں کے منہ کی طرف
دیکھ کر تو ڈر لگتا تھا اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ پتھر پر پانی کی دھار پڑے تو اس میں بھی سوراخ
ہو جاتا ہے۔ وہی ہوا، دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو ماں پُتّر دونوں کے دماغ خراب ہو گئے۔ اور
اب شکورا تو دو سال سے دِین کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔'' بنّو زور سے ہنسی۔

''دِین کی خدمت میں؟''

''وہ جی ہمارے دِین میں ہے نا کہ بیوہ عورتوں اور یتیموں کا خیال رکھنا چاہیے۔
وہ یہی کرتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ یوں جی! کہ کام، میرا خصم جو بھی کرے، اندر سے حرامزادہ کباڑیا ہے۔ اسے
'ورتی ہوئی' چیزوں سے بڑا پیار ہے۔ عورت بھی ویسی ہی، نہ اسے 'نویں نکور' چیزیں اچھی لگتی
ہیں، نہ میں اچھی لگی۔ پرانی چیزوں کو جانچنے، پرکھنے اور بھاؤ تاؤ کرنے میں مزہ لیتا ہے۔''
بنّو نے بے باکی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''پارسال اس کے چاچے کا پتّر مر گیا تھا۔ اس غریب سے اس کی دوستی بھی بہت
تھی۔ آج کل اس کی بیوہ کی 'خبر گیری' کرتا ہے۔ یہاں پاس ہی گاؤں میں رہتی ہے۔ جب
اس سے ملنے وہاں جاتا ہے تو جا کر مسجد میں دو روپے چندہ دیتا ہے، پھر 'ملّانا' سپیکر پر اعلان
کرتا ہے۔ 'رانا شکور نے دو روپے سے مسجد کی خدمت کی ہے آپ جناب کا شکریہ۔ اللہ
تبارک ان کے کام میں برکت ڈالے۔'

یہ اعلان، اصل میں اس 'گشتی' کو بتانے کا طریقہ ہے کہ میں گاؤں میں موجود
ہوں۔ پھر وہ بتائی ہوئی جگہ پر ملنے چلی آتی ہے اور ایسے شکورے کے 'کام' میں 'برکت' پڑتی

ہے۔ میں نے تو ایک دن شکورے سے کہا تھا، کہ مان لیا اس کا حق بنتا ہے، اس کا خصم تیرا
دوست تھا اور وہ تیری بھرجائی بھی ہے لیکن روپیہ پیسا تو ہوا اب اس کی ساری 'ضرورتیں'
پوری کرنا تو تیرا 'فرض' نہیں ہے۔ اس پر اس نے بہت دنگا کیا۔''

شیما کتاب میز پر رکھ کر دلچسپی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

''دو تین مہینے پہلے وہ میرے گھر آئی، تو میں نے اس کی بہتیری خاطر خدمت کی
تھی۔ میں تو جی صاف دل کا بندہ ہوں' مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ اس کے ساتھ
ساتھ میرے بچّوں نے بھی اچھا کھانا کھایا۔ جب جانے لگی تو شکور نے اس کے بچّوں کے
ہاتھ پر پیسے رکھ دیے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ کہنے لگا ''کبھی کبھی بچّوں کو ملا لیجایا کر''

پھر تو مجھے چڑھ غصّہ گیا۔ میں نے شکورے سے کہا کہ تو ان کا ابا لگتا ہے جو
ایسے کیرنے (نوحہ خوانی) ڈال رہا ہے۔ مجھے تو ہر تیسرے دن اپنے گھر سے نکالنے کی تڑی
لگاتا ہے۔ اس وقت تو تجھے اپنی بچّیوں کا خیال نہیں آتا۔ ان سے ملنے کا تو تیرے پاس 'ٹیم'
نہیں ہے۔ اس پرائی 'رن' کے بچّوں کی جدائی تجھ سے 'برداش' نہیں ہوتی۔''

شیما نے سوچا شکورا کتنا بدنصیب انسان ہے جو اتنی پیاری بیوی اور بچّیوں کی محبت
کو ٹھکرا رہا ہے۔

''بیگم صاب! اگر آپ اس عورت کو دیکھیں تو کہیں گی کہ ضرور شکورے کی آنکھیں
خراب ہیں جبھی تو اسے بنّو میں اور اس میں فرق نظر نہیں آتا۔ میں نے تو شکورے سے کہا تھا
کہ بے غیرتی ہی کرنی ہے تو کسی 'چج' کی چیز پر کر۔ منہ نہ متھا تے جن پہاڑوں لتھا'' بنّو نے
حقارت سے کہا۔

'ایک دن 'صاب'! اس کے 'پنڈ' کا دورہ کر کے آیا تو غصّے سے میرا 'بلڈ چڑھ'
گیا۔ میں بڑا بولی، میں نے کہا کہ نہ تو مجھے خرچہ پانی دیتا ہے اور نہ ہی میرے ساتھ کوئی تعلق
واسطہ رکھا ہوا ہے تو پھر مجھے اپنی بیوہ ہی سمجھ لے۔ بیگم صاب! اور بیوہ کیسی ہوتی ہے؟ شاید

بیوہ جان کر ہی تو مجھے کسی قابل سمجھے یا پھر تیرا کوئی دوست خدا خوفی کرے اور میری خبر گیری کر لے۔ اس بات کا اسے بڑا دھکا لگا۔ کہنے لگا کہ تو مجھے مار کر راضی ہے؟ اب بیگم صاب! ---۔ مار مُکا تو اس نے مجھے دیا ہے اور الٹا میرے کندھوں پر سواری کرتا ہے۔

اس رات اس نے مجھے بہت مارا جی! میرا سارا 'پنڈا' نیلا 'کچ' ہو گیا تھا۔ وہ تو کچھ دنوں کے بعد ٹھیک ہو گیا لیکن دل پہ جو داغ پڑے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہوئے۔ بات یہ ہے بیگم صاب! کہ جب 'تیر تکّے' سے گزارا ہو جائے تو پھر بیوی کی ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ ہے نا!'' بنّو نے شیما سے تائید چاہی۔

''آج رات کو مجھ سے کہنے لگا کہ میرے دو جوڑے کپڑے تیار کر دے۔ میں نے کہا کیوں؟ 'صاب' نے 'دورے' پر جانا ہے۔ کہنے لگا نہیں حج پر جانا ہے۔''

''حج؟ آج کل کون سا حج ہوتا ہے؟'' شیما نے حیرت سے کہا۔

''اس کا ہو جاتا ہے جی۔ بڑی دور کسی بزرگ کے عرس پر جاتا ہے ہر سال۔ کہتا ہے کہ سات بار جاؤ تو حج ہو جاتا ہے۔ اس بار اس کا ساتواں پھیرا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''
شیما نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بیگم صاب! وہ تو اس بات پر پکّا ہے کہ ہو جاتا ہے۔ میں نے تو اس سے کہا تھا کہ تُو تو 'ڈریکٹ' مکّے مدینے جائے، پھر بھی تیرا حج نہیں ہوگا۔ 'گیڑے' لگانے سے حج ہونے لگے تو سارے پیسے والے، شرابی کبابی، بخشے جائیں۔'' بنّو اتنی بھری بیٹھی تھی کہ سب کچھ انڈیل دینا چاہتی تھی۔

''خیر سے عرس سے واپس آتا ہے تو وہاں سے تبرک لاتا ہے۔ 'مکھانے' اور رنگ برنگی 'مچھیاں' وہ بھی لا کر ماں کو دیتا ہے۔ وہ اکیلی 'چپ' جاتی ہے۔ پوتیوں کو نہیں دیتی۔ ویسے بھی شکورا کونسا انہیں کچھ لا کر دیتا ہے۔ میرے سے تو دیکھا نہیں جاتا۔ پھر ادھار، سدھار

پکڑ کر بچیوں کا دل خوش کرتی ہوں۔ اس لیے مجھے کام چاہیے جی! اب سارا وقت تو کسی کے سامنے جھولی 'اڈّی' نہیں جاتی۔''

یہ کہتے کہتے بنّو کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی اور آواز رندھ گئی تو شیما جو اس کی دریا دلی پہ حیران تھی، کہ وہ اپنے خاوند کے دوسری عورت کے ساتھ تعلقات کی کہانی کیسے ہنس ہنس کر سناتی ہے، نے جانا کہ وہ دراصل کتنی دکھی ہے۔

پھر بنّو، شیما کے پاس سے یوں اُٹھ کر چلی گئی جیسے وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے دیواروں سے باتیں کرتی رہی ہو۔ اب وہ الگنی پر کپڑے پھیلا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ لہک لہک کر گا رہی تھی۔

؎ اکھاں بے قدراں نال لڑیاں
اساں لائیاں تے توڑ نہ چڑھیاں

میریا وے ماہیا
کوئی کلی اتے پگ ہووے
دکھیا بندیاں دا کوئی شہرا لگ ہووے

بنّو کی آواز پاٹ دار اور آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔

○○

''یہ تو میری گیتی رانی کا وِیر ہے۔
؎ دُوروں تے ویکھاں، میرا وِیر پیا آوے
میرا آیا اے ساہ وِچ ساہ''

نصیباں بچے کو گود میں جھلاتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ شیما کو نصیباں کا گیتی کا وِیر کہنا اتنا اچھا لگا کہ اس نے بیٹے کو 'وِیرُو' کہنا شروع کر دیا۔

سبھی بہت خوش تھے۔ اللہ نے نظیف اور شیما کو دونوں نعمتوں سے نوازا تھا۔

لیکن امّی جان کے سوچنے کا انداز وہی تھا۔ وہ خوش ہونا نہیں جانتی تھیں اور نہ ہی دوسروں کو خوش ہوتا دیکھ سکتی تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں نغمانہ سے بات کر رہی تھیں۔

''اللہ کی مرضی ہے۔ میں تمھاری اولاد دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ یہی بچّہ، وہ تمھیں دے دیتا تو کیا تھا۔ مَیں مانتی ہوں، مَیں نے غلطی کی اور پوتے کی خواہش کر بیٹھی۔ اب تو ان بیگم صاحبہ کے نخرے سنبھالے نہیں جائیں گے اور نہ ہی نظیف بیٹے کو کھونا چاہے گا۔ مَیں جتنی کوشش میں ہوں اتنا ہی معاملہ اُلجھتا جا رہا ہے لیکن بندے کو آس نہیں چھوڑنی چاہیے۔''

OO

شیما کالج سے واپس آ کر ابھی اپنے بیڈ روم میں گئی ہی تھی کہ نصیباں اجازت لے کر کمرے میں آئی۔

''بیگم صاب، آپ کو امّی جان بلا رہی ہیں۔ ان کے کمرے میں کچھ مہمان آئے بیٹھے ہیں۔''

شیما نے جلدی سے پاؤں میں چپل اُڑسی اور چل دی۔ نصیباں کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جو وہ سمجھ نہ پائی تھی۔

امّی جان کے کمرے میں نغمانہ کے میاں، ساس اور نظیف کے دوسرے ماموں کا بڑا بیٹا بیٹھے تھے، جس کی بہن بیگم نظیف بننے کی اُمیدوار رہی تھی۔

شیما نے السلام علیکم کہا لیکن کسی کے منہ سے جواب برآمد نہ ہوا۔

''بیٹھ جاؤ۔۔۔ سلام۔۔۔ سلام۔۔۔ سلام کی ضرورت نہیں ہے۔'' امّی جان 'باآوازِ بلند' بڑبڑا رہی تھیں۔

شیما کو ماحول بہت ناساز گار لگ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر بے ساختہ پوچھا۔

''سب خیریت ہے نا!''

''تمھارے ہوتے ہوئے خیریت کیسے ہو سکتی ہے؟'' امّی جان نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کل نغمانہ کو تم نے اِتنی باتیں سنائی ہیں کہ میرا تو دِل چاہتا ہے کہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں۔''

''نغمانہ باجی سے تو میری ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟'' شیما نے حیران ہو کر کہا۔

''وہ بے چاری مجھ سے ملنے آتی ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، وہ ضرور آئے گی۔ تم یہ بات کان کھول کر سن لو۔ ایک تو اس پر خدا مہربان نہیں ہوا، اُوپر سے تم جیسوں نے اس کا جینا حرام کر رکھا ہے۔'' امّی جان، اَنگارے چبا رہی تھیں۔

نغمانہ کی ساس بولیں۔

''نغمانہ میری بہو ہی نہیں، بیٹی بھی ہے۔ کل، جب وہ مجھے یہ سب بتاتے ہوئے رو رہی تھی تو مَیں تو اسی وقت آنا چاہتی تھی لیکن سرفراز گھر پر نہیں تھا۔''

''انھوں نے آپ سے کہا کیا ہے؟ مجھے بتائیے تو سہی۔'' شیما نے امّی جان سے پوچھا۔

''اس بدنصیب نے تو مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں کہ اس سے میں پریشان ہوں گی۔ گھر جا کر اپنی ساس اور میاں کو بتایا ہے۔''

امّی جان نے شیما کو بُری طرح سے گھورتے ہوئے کہا۔

''میری بیوی، میری عزّت ہے اور میرے لیے قابلِ احترام، اس کے ساتھ بدتمیزی کرنے والے کی تو میں زبان کھینچ لوں گا۔'' سرفراز کی آواز اِتنی بلند تھی کہ شیما کو پریشانی ہونے لگی کہ اگر ملازمین سن لیں گے تو کتنی سبکی ہوگی۔

سرفراز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سچ مچ اس کی زبان کھینچ لیتا۔

''میں اپنی بہو کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتی۔'' نعمانہ کی ساس نے قطعی انداز میں کہا۔

(نظیف کے گھر آنے کا اگرچہ یہ وقت تو نہیں ہے لیکن کتنا اچھا ہو کہ وہ آ جائیں۔ یہ لوگ تو پتا نہیں کیا کہہ رہے ہیں؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ شیما نے سوچا۔)

اور ساتھ ہی نظیف کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

نظیف کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور وہ سخت غصّے میں تھا۔ شاید اسے آفس میں فون پر، ان لوگوں کے آنے کی اطلاع کر دی گئی تھی اور وہ صورتِ حال سے باخبر تھا۔

شیما نے پُراُمیّد نظروں سے نظیف کی طرف دیکھا، لیکن اس کی آنکھوں میں پہچان کی کوئی رمق نہیں تھی۔

''شیما بیٹھ جاؤ'' نظیف نے رُکھائی سے کہا ''تم نے میرے گھر کو جہنّم بنا دیا ہے۔ امّی جان نے پہلے بھی مجھ سے بہت بار کہا تھا تب میں یہ سوچ کر چپ رہا کہ شاید تم خود ہی سمجھ جاؤ، لیکن تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو۔ بہر حال، سمجھانا مجھے آتا ہے۔ تم، امّی جان، ممانی جان، سرفراز اور ریاض بھائی سے ابھی معافی مانگو اور پھر نعمانہ کے گھر جا کر اس سے۔''

''سوری'' شیما نے اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگی تو اسے رافعہ یاد آئی۔

''یہ کونسا طریقہ ہے؟'' امّی جان نے طنزاً کہا۔

''مجھے معاف کر دیجیے۔'' شیما ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بلکی۔

''نظیف، میں آج تک چپ رہا کہ نہ جانے تم اسے کس طرح سے لو گے؟ لیکن اب، جب کہ پانی سر سے گزر چکا ہے تو میرے لیے چپ رہنا ناممکن ہے۔ تمہیں میں بتاتا ہوں اس کے کرتوت۔۔۔''

اب ریاض بھی شاملِ گفتگو ہو گیا تھا۔

''نہیں، ریاض بھائی رہنے دیں۔ نظیف بھائی کے سامنے نہیں۔ کبھی الگ سے اسے اس کی اوقات بتائیں۔''

سرفراز نے بظاہر اسے منع کیا، لیکن اس کا انداز ترغیب دِلانے والا تھا۔

''جی نہیں، ابھی بتایئے، نظیف میرے شوہر ہیں انھیں میرے 'کرتوتوں' سے لاعلم نہیں رہنا چاہیے۔''

شیما کا دماغ اُبل رہا تھا اور اب انتہائی غصّے کی حالت میں بات کرتے ہوئے اس کی آواز بلند ہو گئی تھی اور اسے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ ملازم سن لیں گے تو کیا ہو گا؟

''نظیف، آپ ان سے پوچھتے کیوں نہیں کہ آخر مَیں نے کیا کیا ہے؟ اور میرے 'کرتوت'۔۔۔''

''شیما کو اس لفظ سے گِھن آ رہی تھی۔

''بکواس بند کرو اور میری بات غور سے سنو۔ مَیں اب تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ آج سے تمہارا راستہ الگ ہے اور میرا الگ۔۔۔ تم اپنے لیے کوئی اور تلاش کر لو۔''

نظیف کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔

شیما کے ذہن میں اس کے گھر کی عمارت اُڑا اُڑا دھم کر کے زمین بوس ہو گئی اور اس سے اُڑنے والی دھول مٹّی سے اس کا دم گُھٹنے لگا۔ اس کا چہرہ یوں تھا۔ جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ اس نے بے یقینی سے نظیف کی طرف دیکھا، وہ اسے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

شیما کے لیے وہاں اور کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان لوگوں کے چہروں پر پھیلی فاتحانہ مسکراہٹ ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر گر کر اپنی بے بسی اور بے عزّتی کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب دراصل تھا کیا؟ کیونکہ اسے آخر دم تک یہ پتا نہیں چل

سکا تھا کہ اس نے نعمانہ باجی سے کیا کہا ہے؟ اور ریاض بھائی اس کے کن کرتوتوں کا ذکر کر رہے تھے۔ سرفراز بھائی کے لیے بیوی قابلِ احترام ہے اور ممانی جان اپنی بہو کے خلاف کچھ نہیں سن سکتیں تو پھر نظیف اور امّی جان کے لیے یہ سب کچھ روا کیوں ہے؟ انھوں نے اپنی بیوی اور بہو کے کرتوتوں کے بارے میں بات کو کیسے برداشت کر لیا؟

عورت کے کردار پر الزام تراشی، ہمارے معاشرے کا آسان ترین کام ہے اور پھر اس پر یقین بھی اسی آسانی سے فوراً کر لیا جاتا ہے۔ کبھی بعینہٖ اور کبھی یہ کہتے ہوئے کہ 'دِل تو نہیں مانتا' لیکن آخر کچھ تو ہوگا، لوگ یونہی تو نہیں کہہ دیتے۔' پھر بھی شیما کو نظیف پر اعتماد تھا کہ وہ ایسی کسی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ لیکن اے بسا آرزو۔۔۔ کہ اس کا ردِّ عمل تو شیما کو خاک میں ملا گیا تھا۔ اس نے لفظ 'طلاق' استعمال نہیں کیا تھا، لیکن یہ تھا تو علیحدگی کا پروانہ ہی۔۔۔ (خدا کا شکر ہے کہ طلاق صرف عربی میں ہی ہوتی ہے، اُردو میں نہیں۔)

شیما کی رات تو جو گزری سو گزری، نظیف منہ موڑے بے خبر سوتا رہا۔ صرف ایک بار اس کی سسکی سن کر دانت پیستے ہوئے کہا۔

''کیوں رو رہی ہو؟ میں مر تو نہیں گیا ہوں۔''

(اگر زندہ ہو، تو مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس کیوں نہیں دِلاتے؟)

اگلے روز کالج میں، نہ چاہنے کے باوجود، شیما کے چہرے پر اُداسی تھی۔ کلاسز کے بعد نگار اور شہلا اسے اپنے ساتھ ہاسٹل میں لے آئیں۔

''شیما، تم چپ چپ کیوں رہنے لگی ہو؟'' نگار نے پوچھا۔

''چپ چپ تو نہیں رہتی البتہ تمھارے برابر بولنا میرے بس میں نہیں ہے۔'' شیما نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''پہلے تو عین بس میں تھا، ابھی کچھ نیا ہوا ہے۔''

نگار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کوئی پریشانی ہے کیا؟ آخر تم بتاتی کیوں نہیں؟''

شہلا نے کہا۔

''نہیں تو، کوئی پریشانی نہیں ہے۔ پتا نہیں تم لوگوں کو کیا محسوس ہوا ہے؟''

نگار جلدی سے کچن سے بیلن اُٹھا لائی۔

''دیکھو شیما، مجھے تشدّد پر مجبور نہ کرو۔ میں اچھے، اچھوں سے اُگلوا لیا کرتی ہوں۔ تم تو ایک بھولی سی فاختہ ہو۔ چلو شروع ہو جاؤ۔''

''نئیں تے میں اِک لائی اے پُٹھے ہتھ دی۔''

شہلا نے بھی دھمکایا۔

شیما بے ساختہ ہنس دی۔

''بات تو کوئی خاص نہیں، اگر کہوں گی تو شاید محسوس ہوگا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کرنا، حد درجہ کی کمینگی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سے میں سارا وقت ذہنی دباؤ کا شکار رہتی ہوں۔ امّی جاں کا موڈ ہر وقت خراب رہتا ہے۔ بلاوجہ بڑبڑاتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھار تو اچانک اِتنی کڑک دار آواز آتی ہے کہ میں اپنی جگہ پر اُچھل پڑتی ہوں معلوم کرنے پر پتا چلتا ہے کہ وجہ کچھ اِتنی خاص نہ تھی کہ اس کے لیے اہلِ زمین کو یوں دہلا کر رکھ دیا جائے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ ان کی تو شاید ہوا سے بھی مخاصمت رہتی ہے۔ اِدھر ہوا ذرا زور کی چلی اور اُدھر انھوں نے اس کے ساتھ اعلانِ جنگ کیا۔ امّاں تو چونکہ سکون امن و آشتی کی علمبردار ہیں اس لیے یہ سب بہت تکلیف دہ ہے میرے لیے۔ ملازم بے چارے سہمے پھرتے ہیں آنے جانے والوں کی خیریت یوں معلوم کی جاتی ہے، جیسے باز پرس ہو رہی ہو۔''

''گویا:

ع ہلاکو خاں سے اور چنگیز خاں سے ان کے ناتے ہیں۔'' نگار نے کہا۔

''یونہی سمجھ لو۔ کل مجھ سے ناراض تھیں کہ کیا سارا وقت نصیباں خالہ، نصیباں

خالہ کرتی رہتی ہو۔ نوکروں کو سر پر چڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب انھیں نوکر سمجھنا تو کجا، میں تو انھیں صرف نصیباں بھی کہنا نہیں چاہتی وہ بڑی عمر کی بہت اچھی خاتون ہیں۔ ایک روز گیتی مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''ماما، نصیباں خالہ ہماری نوکردانی (نوکرانی) ہیں۔''

''میں نے کہا نہیں بیٹا تو کہنے لگی دادی امّاں کہہ رہی تھیں۔''

''تم کیوں پریشان ہوتی ہو، تمہاری بچّی کی تو بہت 'اچھی' تربیت ہو رہی ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''اور گھورتی ایسے ہیں کہ ایک دفعہ تو میں لڑکھڑا جاتی ہوں اور غصّے کی حالت میں۔ توبہ، توبہ۔۔۔ ویسے بعض 'ناگزیر وجوہات' کی بنا پر ہر وقت 'بحالتِ غصّہ' ہی ہوتی ہیں۔ ایک اَن دیکھا سا خوف میرے سر پر سوار رہتا ہے کہ نجانے اب کیا ہوگا؟''

ان لوگوں کے چہروں پر پریشانی کے آثار دیکھے تو شیما اصل بات چھپا گئی اور اندازِ گفتگو ذرا مزاحیہ کر دیا۔

''دوسری جنگِ عظیم میں جرمن نازی جب کسی جنگی قیدی پر تشدّد کر کے کچھ اُگلوانا چاہتے تھے تو وہ اسے اس طرح، کسی جگہ پر باندھ کر بٹھا دیتے تھے کہ اس کا سر ہل نہیں سکتا تھا۔ پھر پانی کی ایک بوتل اُلٹی لٹکا دیتے تھے، ایسے کہ وقفہ وقفہ سے ایک قطرہ اس کے سر پر ٹپکتا رہتا۔ اس سے اسے جسمانی تکلیف تو نہیں ہوتی تھی لیکن وہ یہی سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتا کہ اب قطرہ گرے گا، اب قطرہ گرے گا۔ میرا خیال ہے تمہاری حالت بھی اسی قیدی کی سی ہے۔''

نگار سنجیدہ تھی۔

''ہوں۔۔۔ صحیح سمجھی ہو۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھیں کہ میرے باپ کی تین بہوئیں ہیں۔ کوئی اچھی ہے یا بری، میری ایک ہے وہ بھی اچھی نہیں۔ ادھر، میں ہر طرح سے انھیں

خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن وہ۔۔۔''

''تمہیں بہوؤں کے 'مقابلہ ہائے اچھائی' میں حصّہ لینے کا اِتنا شوق کیوں ہے؟ اگر ان کی بہو اچھی نہیں ہے تو یہ ان کا نصیب ہے۔ تمہارا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ ناشکرا انسان کبھی خوش نہیں ہوتا۔'' شہلا نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس بات کا صرف ایک حل ہے۔ تم ان سے کہو کہ نظیف کی تین شادیاں اور کروا دیتے ہیں۔ اللہ کو منظور ہوا تو ہو سکتا ہے کوئی بہو اچھی نکل آئے۔''

نگار نے کہا:

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں، نگار۔''

''یہاں کون بدبخت مذاق کے موڈ میں ہے؟ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تم خود کو بدلو، کیونکہ تم دوسروں کو نہیں بدل سکتیں۔ اور تم سارا وقت دوسروں کو خوش کرنے کے چکّر میں نہ رہا کرو۔ تم خود کو ہلکان کرتی رہو گی اور جو لوگ خود خوش ہونا نہیں جانتے وہ تمہاری خوشیوں کے بھی درپے رہیں گے۔''

''میں چاہتی ہوں۔۔۔''

''خاک چاہتی ہو تم۔۔۔ تم اپنی زندگی کو ہمیشہ دوسروں کے حوالے سے کیوں جینا چاہتی ہو؟ امّاں ابّا کے لیے، شوہر کے لیے، سسرالیوں کے لیے۔۔۔ دوستوں کے لیے۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟ تمہاری اپنی بھی کوئی زندگی ہے یا نہیں، جسے تم اپنے لیے گزار سکو۔ خدا کے لیے اس رویّے کو بدلو۔ زندگی جیو، گزارو نہیں۔ اس طرح سے تو تم خرچ ہو جاؤ گی۔ جانتی ہو، دونوں طرف سے جلنے والی موم بتّی کی زندگی ایک رات سے بھی کم ہوتی ہے۔''

''لیکن یہ بھی تو دیکھو یہ کتنی خوبصورت روشنی بکھیرتی ہے۔'' شیما بدقت مسکرائی۔

''کوئی قدر، ودر نہیں کرتا اس روشنی کی۔ اور دوسروں کے مسائل کو حرزِ جاں بنا کر، اپنی زندگی برباد کر لینا، کونسی ایسی خوبی ہے جس پر تم اس قدر فخر کرتی ہو۔'' نگار چڑچڑی ہو

رہی تھی۔

''آخر یہ سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہی کیوں ذخیرہ ہو گیا ہے؟''

''بات یہ ہے نگار کہ جو لوگ مجھ سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں، ان سے میں منہ نہیں موڑ سکتی۔ امّی جان نے اپنے گھر کا سکھ نہیں دیکھا، میں چاہتی ہوں کہ اب میری وجہ سے انھیں کوئی پریشانی نہ ہو۔'' شیما نے دھیمی آواز میں کہا۔

''کون کہتا ہے تمھیں منہ موڑنے کو؟ لیکن اگر تمہارے دُکھی ہونے سے انھیں سکھ ملتا ہے تو کیا تم ساری عمر اسی سولی پر لٹکتی رہو گی؟ --- لاحول وَلا قوۃ تمہارا یہ فلسفہ، کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے۔'' نگار تلملا رہی تھی۔

''میں تمھیں بتائے دیتی ہوں کہ یہ رویّہ تمھیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ ہاں، البتہ 'شوقِ شہادت' تمہارے سر میں سمایا ہے تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دوسروں کی پریشانی کو سینے سے لگا کر، اگر تم اپنی دانست میں 'انسانیت کی خدمت' کر رہی ہو تو دراصل تم نے احمقوں کی جنّت میں ڈیرا لگا رکھا ہے۔ میری ایک بہن ایسی ہی ہیں۔ ان کی آنکھیں بھی بات، بے بات ڈبڈباتی رہتی ہیں۔ انھیں اُداس دیکھ کر میرا چھوٹا بھائی کہتا ہے۔

''باجی لگتا ہے، آپ کو اِطلاع مِل گئی ہے کہ ہمسایوں کا بلب فیوز ہو گیا ہے۔ آؤ، دو گھڑی بیٹھو، اس کا افسوس کر لیں۔ آئے ہائے، جوانا مرگ کیسے جگمگاتا تھا۔''

نگار کے لہجے میں خلافِ معمول کڑواہٹ تھی۔

''شیما، نگار صحیح کہہ رہی ہے۔ تمھیں بے حد ضرورت ہے اپنی ترجیحات کو بدلنے کی۔ سب لوگوں کا تمہاری زندگی میں حصّہ ہے --- مان لیا، لیکن صرف حصّہ ہے، کل نہیں۔ تم اپنی زندگی میں دوسروں کو حصّہ ضرور دو، اپنی زندگی ان کے حوالے نہ کرو۔''

شیما روہانسی ہو گئی۔

''اور آنٹی جو زیادتی کرتی ہیں وہ نظیف بھائی کو ضرور بتایا کرو۔ ورنہ آہستہ آہستہ

ان کا رویّہ بے حد تبدیل ہو جائے گا۔ کہتے ہیں:

ع سنگ کٹ جاتے ہیں پانی کی جہاں دھار گرے

نگار نے کہا۔

''میں نظیف سے کچھ نہیں کہتی، اگر کہوں، تو سنیں گے بھی نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ ان کا رویّہ بے حد تبدیل ہو گیا ہے۔ ان کے حساب میں تو میں نے پچھلے چند سال سے گفتگو کی ہی نہیں 'بکواس' ہی کرتی ہوں جسے وہ وقتاً فوقتاً 'بند' کرواتے رہتے ہیں۔''

شیما نے بے چارگی سے کہا۔

''اسے پنجابی میں یوں کہتے ہیں:

'چندرا گوانڈھ نہ ہووے، تے لائی لگ نہ ہووے گھر والا۔''

شہلا نے کہا:

''چلو چھوڑو --- آج کے لیے اِتنا ہی کافی ہے۔ خدا تمھیں خوش رکھے، لیکن میری ایک بات تمھیں ضرور ماننا پڑے گی اور وہ یہ کہ تم اپنے گھر کے صحن میں 'سکھ چین' کا ایک درخت لگوا لو اور اس کے نیچے 'سکھ' سے بیٹھ کر 'چین' کی بنسری بجایا کرو۔'' نگار حسبِ سابق پھر پٹڑی سے اُتر گئی تھی۔

شہلا نے شیما کے بازو میں اپنا بازو ڈالا اور کہنے لگی:

''سب کچھ یہیں چھوڑ دو

ع چل میلے نوں چلئے

''نہیں، پہلے اسے شو کمار بٹالوی کی نظم کی پیروڈی، جو کسی ستم ظریف نے لکھی ہے، سناؤ جو کل تم مجھے سنا رہی تھیں۔''

''لو سنو:

'مائیں نی مائیں

مینوں غم دا سوٹ سواں دے

آہاں دا کالر

تے ہنجواں دی جھالر

وِچ بٹن برہوں دے لادے'

OO

گھر کی فضا پر جمود طاری تھا۔ نظیف نے اس سے بات چیت چھوڑ رکھی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا اور جب وہ کپکپاتی ٹانگوں اور دھڑکتے دِل کے ساتھ، امّی جان کے کمرے میں گئی تو انھوں نے اسے دیکھتے ہی دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔

شیما چاہتی تھی کہ یہ تناؤ کسی طرح کم ہو جائے کیونکہ ایسے ماحول میں اس کے اعصاب چٹخنے لگتے تھے۔ لیکن اس کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ یہ لوگ اسے کیسے برداشت کر لیتے ہیں؟ وہ خود تو آئے روز کے اس برتاؤ سے بیدم ہو گئی تھی۔

آج نظیف، لنچ پر گھر نہیں آیا تھا۔ شیما ڈائننگ روم میں گیتی کو کھانا کھلا رہی تھی کہ نصیباں نے آ کر بتایا۔

''صاحب کا فون ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

شیما کا دِل جیسے بند ہونے کو تھا۔

''پتا نہیں نظیف اب کیا کہنے والے ہیں؟''

اس کے منہ سے مری سی 'ہیلو' نکلی۔

''میرے دوست، نجیب احمد کے والد صاحب وفات پا گئے ہیں۔ تم چار بجے تیار رہنا۔ جنازے پر جانا ہے۔''

انھیں جانا تو جنازے پر تھا لیکن وہ یوں خوش تھی جیسے نظیف اسے ڈنر پر لے جا رہا ہو۔ اُسے اپنی اس 'کمینگی' پر شرمندگی بھی ہوئی لیکن وہ خوش اس لیے تھی کہ نظیف نے آخر

اس کی حیثیت کو جان کر ہی اسے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔

نظیف نے جب ڈرائیور سے گاڑی کی چابی لی تو شیما کو اطمینان ہوا کہ ڈرائیور کی غیر موجودگی میں وہ نظیف سے بات کر سکے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ نظیف سے اس روز والی بدمزگی کے بارے میں بات کرے، اپنی لاعلمی ظاہر کر سکے اور اپنی صفائی میں کچھ کہے۔

لیکن نظیف سارا راستہ خرگوش کی طرح منہ پھلائے بیٹھا رہا اور اسے جرأت ہی نہ ہوئی کہ کچھ کہہ پاتی۔

واپسی پر، نظیف اس راستے سے آیا جس میں، مین روڈ سے دائیں ہاتھ مڑ کر نغمانہ کا گھر تھا اور جب نظیف نے گاڑی ادھر موڑ لی تو شیما کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ظاہر ہے نغمانہ کے ہاں۔۔۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس سے جا کر معافی مانگو، لیکن تم نہیں گئیں۔ میں آج تمہیں لایا ہی اسی واسطے تھا کہ اپنے سامنے یہ سب ہوتا دیکھ سکوں۔''

''نظیف۔۔۔ پلیز۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا تو معافی کس بات کی مانگوں؟ امّی جان کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ انھیں غلط بتایا گیا ہے۔'' شیما نے دھیمی آواز میں کہا۔

''امّی جان۔۔۔ امّی جان۔۔۔ کیا امّی جان۔۔۔؟ آج کے بعد امّی جان کا لفظ بھی تمہاری زبان پر نہ آئے اور جو لوگ تمہاری پُشت پناہی کر رہے ہیں۔ انھیں تو میں دیکھ لوں گا۔'' نظیف چیخ رہا تھا۔

''کون لوگ؟''

''تمہارا باپ اور بھائی۔۔۔ اور اب یہ بکواس بند کرو اور سیدھے سے چلو۔''

نظیف کی آواز اور زیادہ بلند ہو گئی۔

(آپ کو تو اپنا ننھیال اِتنا پیارا ہے لیکن اپنے بچّوں کے ننھیال کو آپ سارا وقت

طعن وتشنیع کا نشانہ بنائے رکھتے ہیں۔ کیوں؟)

''مجھے نہیں جانا۔'' شیما میں اتنی جرأت نجانے کہاں سے آ گئی تھی۔

''کیا کہا؟۔۔۔ٹھیک ہے تو پھر تم میرے ساتھ واپس بھی نہیں جاؤ گی۔'' نظیف نے قطعیت سے کہا۔

گاڑی کی بریکیں چرچرائیں۔نظیف نے گاڑی کو فوری طور پر روکا اور دروازہ کھول کر اسے اُترنے کو کہا۔

سڑک تقریباً خالی تھی جھٹپٹے میں سنسان علاقہ۔۔۔تو کیا واقعی نظیف مجھے یہاں چھوڑ جائیں گے؟ اور جب نظیف نے دوسری طرف سے آ کر اس کا بازو پکڑا اور نیچے اُتار دیا تو وہ پھٹی پھٹی نظروں سے یہ منظر دیکھا کی۔

غیر محفوظ ہونا تو بعد کی بات تھی، اس سے پہلے تو شدید بے عزّتی کے احساس نے اسے مار ڈالا۔اس نے خواہش کی کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

(لیکن کبھی خواہشیں بھی پوری ہوئی ہیں۔۔۔' پھر اس نے سر جھکا کر ماتم کیا، جیسے کوئی اپنی ماں کا کرتا ہے: بائبل)

نظیف کی گاڑی کی سرخ لکیر کو دیکھ کر وہ بے ہوش ہوتے بال بال بچی۔ زمین گھوم رہی تھی، آسمان گھوم رہا تھا، بھڑکتے شعلے اسے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے کہ اچانک ایک گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی۔ شیما نے خوف سے آنکھیں میچ لیں۔نجانے اس گاڑی میں کون تھا اور اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا؟

''چلو، گاڑی میں بیٹھو۔'' بھاری آواز اور تحکمانہ لہجہ۔

شیما نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا۔نظیف اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

(کل جب اخباروں میں خبر آتی کہ D.C نظیف ہارون کی اہلیہ۔۔۔

نظیف یقیناً اسی سے خوفزدہ ہو کر اسے لینے آیا ہے۔چلو، اسے شیما کی عزت تو نہ سہی، اپنی عزّت تو بہرحال عزیز ہے۔شیما نے سوچا۔)

راستہ کیسے کٹا؟ شیما خالی الذہن اور سحرزدہ سی بیٹھی رہی اور اسی حالت میں، گھر پہنچ کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بچّوں کے کمرے میں چلی آئی۔ بچے سو رہے تھے۔ نصیباں پاس بیٹھی تسبیح کر رہی تھی۔

(یہی تو ہیں جن کے لیے میں برداشت کیے جا رہی ہوں۔شیما نے جیسے خود کو سمجھایا۔)

OO

اگلے روز وہ کالج جانے کی ہمت نہ کر سکی۔اس کا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔آنکھ کھل جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک سر نیہوڑائے بستر میں پڑی رہی۔جسم بے جان تھا اور ذہن مفلوج۔نظیف کے جانے کے بعد وہ بمشکل کمرے سے نکلی۔چائے کا ایک بڑا مگ پیا اور یہ سوچ کر اٹھی کہ اسے ہر صورت میں حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔

خود کو مصروف کرنے کے لیے، اس نے بچّوں کے کمرے کے پردے بدلے، الماریاں ترتیب دیں۔ان کے کھلونے ریک میں سجائے اور جب بیڈ کی چادر وغیرہ تبدیل کر کے، باہر نکلتے ہوئے کمرے پر نظر ڈالی تو گلابی اور آسمانی رنگ میں رنگے ہوئے کمرے کو دیکھ کر، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔یہ اس کے بچّوں کا کمرہ ہے۔۔اس کی کائنات۔

لیکن اپنے کمرے میں واپس آ کر اس کا کام کرنے کا موڈ پھر ختم ہو گیا۔عجب بے کلی تھی۔دل پریشان اور سہما ہوا سا تھا۔اس روز کے واقعہ کے بعد سے امّی جان اور نظیف کا رویہ، اس کے ساتھ بہت روکھا اور ہتک آمیز تھا، جو اگرچہ کچھ نیا نہیں تھا۔لیکن پھر بھی شیما کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔وجہ یقیناً ان لوگوں کی خود ساختہ ہی تھی۔کیونکہ شیما نے تو بہتیرا سر پٹکا تھا، لیکن کوئی ایسی بات اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔جس کی وجہ سے اتنا ذِلت آمیز رویہ اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو، اور جو کل ہوا تھا۔۔۔اس نے تو شیما کو ہلا کر

رکھ دیا تھا۔

چند روز پیشتر، نگار نے دوبارہ شیما سے اس کے گھریلو حالات کے بارے میں بات کی تھی اور حسبِ سابق اسے بہت مثبت اور اپنے مخصوص انداز میں سمجھایا تھا کہ ان لوگوں کی پرواہ کرنا چھوڑ دے، جو نہ خود خوش رہنا جانتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو خوش رہتے دیکھ سکتے ہیں۔ شیما نے کبھی ایسی باتیں اپنی دوستوں سے نہیں کی تھیں۔۔۔ امّاں اور آئمہ کا تو ذکر ہی کیا؟ لیکن یہ روز روز کی کشاکش اب اس کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔ اس پر اس روز، نگار نے خود ہی بات شروع کی۔

''شیما! تم مجھ سے لاکھ چھپاؤ، لیکن کچھ تو ہے جو تمہارے چہرے سے جھلکنے لگا ہے اور تمہاری شخصیت کا حصّہ بنتا جارہا ہے۔ تم بیٹھے بیٹھے کھو جاتی ہو۔ تمہارے ماتھے پر شکنیں اچھی نہیں لگتیں۔ تم مجھے بتاتی کیوں نہیں؟ اب کیا ہوا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں نگار، سچ، کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی میرا دل سہما سہما رہتا ہے۔ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔۔۔ بُرا۔۔۔ بہت ہی بُرا۔۔۔''

''اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟ مجھے بتاؤ، مجھ سے کہو، اس سے کچھ اور نہ بھی ہو، کم از کم تمہارے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔''

''نگار، دراصل نظیف کا رویّہ میرے ساتھ بہت بدل گیا ہے۔ امّی جان اور نغمانہ باجی تو شروع ہی سے ایسی ہیں۔ ان کے رویّے کو میں نظیف کی محبت میں، کسی نہ کسی طرح برداشت کرتی چلی آرہی تھی، لیکن اب نظیف بھی آہستہ آہستہ بہت مختلف ہو گئے ہیں۔ یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ مجھے کوئی کچھ بتاتا بھی تو نہیں کہ میں نے کیا کیا ہے؟ میں کہاں غلط ہوں؟''

لگتا تھا شیما ابھی رو دے گی۔

''دیکھو شیما، میں جانتی ہوں، تم یہ سب امّاں لوگوں سے نہیں کہہ سکتیں، انہیں

پریشان کرنے سے فائدہ؟ اور یقیناً تم کسی اور سے کہنا بھی پسند نہیں کرو گی۔ اس میں تمہاری سبکی ہے، اور یوں بھی بظاہر لوگ بہت مہربان ہیں، لیکن کتنے ہیں جو دکھ بانٹ سکتے ہیں؟''

جواب میں شیما کی آنکھوں سے ساون برسنے لگا۔

''نہیں شیما! ایسے نہیں، تم تو کبھی بھی ایسی نہیں تھیں، اور باقی رہے تمہارے گھریلو معاملات، تو ان کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا سیکھو۔ تم خود کو بدل سکتی ہو، دوسروں کو نہیں۔ خاص طور پر ان لوگوں کو جنہیں اکثر 98°F بخار رہتا ہو یا وہ جو 'تبخیرِ معدہ' کے جان لیوا مرض میں مبتلا ہوں۔''

شیما نے نگار کے چہرے پر پھیلی مصنوعی فکر مندی کو دیکھا تو بے ساختہ مسکرا دی۔

''تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ اس لیے سر اُٹھا کر جیو۔ معذرتوں کے ساتھ جینا کوئی جینا نہیں ہے۔ اگر کچھ لوگ تمہیں رُلانے پر تلے ہوئے ہیں تو تمہارے پاس مسکرانے کی بھی بہت سی وجوہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو میں ہوں۔'' نگار نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے، اپنے آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

شیما کی مسکراہٹ بے ساختہ قہقہے میں بدل گئی۔

''نہیں یہ مسخرا پن نہیں ہے۔ دنیا میں، رشتہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے محبت کا۔۔۔ اٹل اور انمٹ۔۔۔ اور دوستی بھی تو محبت ہی کا خوب صورت عکس ہے۔''

اُس وقت تو شیما نے، نگار کی باتوں کو دل میں سمو لیا، لیکن نظیف کی رکھائی اور توہین آمیز رویّے سے، وہ پھر بہت دل برداشتہ ہو گئی تھی۔

اسی کیفیت میں وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ باہر نظیف کی گاڑی کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور وہ تیزی سے چلتا ہوا امّی جان کے کمرے میں چلا گیا۔ شیما کا دل اُچھل کر اس کے حلق میں اَٹک گیا۔

''نظیف؟ اس وقت؟ اور ایسے؟ خدا خیر کرے۔''

امّی جان کے کمرے سے نکل کر نظیف اسی کی طرف آ رہا تھا۔ پریشان سا۔

''شیما تم جلدی سے تیاری کرلو، ہم لوگ پروفیسر صاحب کے ہاں جا رہے ہیں۔'' نظیف نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''یوں اچانک کیوں؟ خیریت ہے نا؟ ابا میاں اور اماں تو ٹھیک ہیں نا؟'' شیما نے گھبراہٹ میں کہا۔

''وہ۔۔۔ سرمد کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔''

''کیا؟'' شیما چیخی۔

(یہی تو تھا، جس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا)

نصیباں نے بچوں کے بیگ تیار کیے۔ شیما نے جیسے تیسے اپنا حلیہ درست کیا اور گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے امّی جان کو خدا حافظ کہنے کے لیے رُکی۔

وہ اپنے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔ انہوں نے شیما کی طرف دیکھے بغیر، غیر جذباتی انداز میں کہا۔

''نظیف! میں نغمانہ کے انتظار میں ہوں۔ وہ آتی ہے تو ہم لوگ بھی پہنچتے ہیں۔''

''امّی جان اور نغمانہ باجی بھی آ رہی ہیں؟ نظیف، سرمد ہسپتال میں ہے؟ وہ کیسا ہے؟ کیا زیادہ پریشانی کی بات ہے؟'' شیما نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ گھر پر ہی ہے۔'' نظیف نے دبی زبان میں کہا۔

سفر کیسے کٹا؟ شیما اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ راستے میں اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ بچے گاڑی میں بیٹھتے ہی سو گئے تھے۔ ایک گمبھیر خاموشی، دل کو دہلائے دے رہی تھی۔ شیما نظیف سے تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ لیکن ڈرتی تھی کہ نہ جانے وہ جواب میں کیا کہہ دے؟ کچھ ایسا، جو وہ برداشت نہ کر پائے۔ نظیف بالکل خاموش تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر سرمد گھر پر ہے تو یقیناً معمولی ایکسیڈنٹ ہوگا۔ پھر نظیف اتنا پریشان کیوں ہے؟ امّی جان اور نغمانہ

باجی کیوں آ رہی ہیں؟ جب ابا میاں شدید بیمار ہوئے تھے تو انہوں نے خود آنا تو کجا، شیما کو بھی جانے کی اجازت نہیں دی تھی اور اب۔۔۔

اسی ادھیڑ بن میں سفر کٹا۔ جب وہ گھر پہنچے تو باہر دو ایمبولینس کھڑی تھیں۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ خاموش اور سر جھکائے ہوئے۔ شامیانے لگائے جا رہے تھے۔ شیما گاڑی سے اُتری اور یوں چلنے لگی جیسے خواب کی کیفیت میں ہو۔ وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھی اور جو اسے نظر آ رہا تھا وہ اسے سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

ابا میاں اور سرمد، دونوں روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسے تھے۔

''وہ تمہارے پاس ہی تو آ رہے تھے۔ نظیف نے تمہیں بتایا نہیں تھا؟'' اللہ رکھی نے شیما کو کہا۔

''میرے پاس آ رہے تھے؟ مجھ سے تو کسی نے ذکر نہیں کیا۔۔۔ آپ لوگوں نے بھی اطلاع نہیں کی۔''

OO

سرمد اور ابا میاں کو دفن کیا تو شام، رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سُرمئی اندھیرا رو رہا تھا۔ ویرانی نے گھر کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اماں کے کمرے میں، شیما اور آئمہ یوں بیٹھی تھیں جیسے جنگل میں راستہ بھول گئی ہوں۔ اماں کو خواب آور ٹیکہ لگایا گیا تھا کیونکہ ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔

قبرستان سے واپس آ کر نظیف نے شیما کو باہر بلایا۔

''تمہیں خبر ہے کہ بچے اس وقت کہاں ہیں؟''

نظیف کے لہجے میں سختی تھی۔

''انھیں میں نغمانہ باجی کے پاس چھوڑ کر آئی تھی۔''

''انھیں خود سنبھالو۔۔۔ نغمانہ کو تنگ نہ کرو، اسے تو میں مشکلوں سے منا کر لایا ہوں۔''

"مناکر؟"

"ہاں مَنا کر۔۔۔ وہ ناراض تھی کہ سرمد کی موت کی اِطلاع اسے براہِ راست کیوں نہیں دی گئی۔ میرے فون کرنے سے اسے پتا چلا۔ اس سے سسرال میں اس کی سبکی ہوئی ہے۔"

"تو کیا یہ اطلاع اماں یا آئمہ کو دینی چاہیے تھی؟" شیما نے پوچھا۔

"بالکل۔۔۔ وہ نہیں دینا چاہتی تھیں تو کم از کم تم ہی خیال کر لیتیں۔ امّی جان نے اس بات کو بہت محسوس کیا ہے۔ وہ تو خود بھی نہیں آنا چاہ رہی تھیں۔ بہر حال 'آئندہ' احتیاط کرنا۔"

شیما کرچی کرچی ہوگئی۔

نظیف حکم سنا کر واپس مردانے میں چلا گیا۔ شیما بمشکل خود کو سنبھالے، پاؤں گھسیٹتی کمرے میں واپس آئی تو آئمہ نے پوچھا۔

"کیا کہہ رہے تھے نظیف بھائی؟"

"مجھے کہہ رہے تھے کہ خود کو سنبھالو۔ صدمہ یقیناً بہت بڑا ہے لیکن اماں اور آئمہ کا خیال تمہی کو رکھنا ہے۔" شیما بلک بلک کر رونے لگی۔

"آئمہ میں اِتنی مضبوط کہاں ہوں کہ آپ لوگوں کا خیال رکھ پاؤں۔ میں تو نظیف کی بات سن کر ڈھے گئی ہوں۔"

"نظیف بھائی، صحیح کہہ رہے ہیں آپی۔ ہم لوگ مضبوط ہوں گے تو اماں کو سنبھال سکیں گے۔ وقت کا تقاضہ یہی ہے۔" آئمہ نے اسے گلے سے لگالیا۔

(یہ اتنی سیانی کب سے ہوگئی؟ شیما حیران تھی۔)

نگار، شیما کو بازو میں لے کر باہر نکل آئی۔

ساتھ والے کمرے میں امّی جان، نصیباں سے پاؤں دبوا رہی تھیں۔ لگتا تھا

انھیں F-98 بخار چڑھنے والا ہے۔ انھوں نے شیما کو آواز دی۔

"شیما ذرا معلوم کرنا کہ نغمانہ اور اس کے ماموں لوگوں نے کھانا ٹھیک سے کھالیا ہے ورنہ اپنی نگرانی میں کھانا بھجوانا۔"

"یہ لوگ کسی ولیمے میں شرکت کے لیے آئے ہیں؟"

نگار تلملائی "میں پوچھ لیتی ہوں کہ اگر بوفے پہ چلنا چاہیں تو میرے ساتھ چلیں۔"

"چپ کرو نگار۔۔۔ نظیف کا موڈ پہلے ہی بہت خراب ہے۔"

شیما نے دبی زبان میں اسے بتایا کہ نغمانہ ناراض ہے۔

"تم نے کیا کہا؟ میں ہوتی تو کہتی کہ کارڈ ابھی چھپے نہیں تھے ورنہ ضرور بھجوادیتی۔ کس قدر فضول لوگ ہیں۔"

شیما کے آنسو خاموشی سے گر رہے تھے۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ لوگ نہ تو کسی کی خوشی کو خوشی رہنے دیتے ہیں اور نہ دُکھ کو دُکھ۔ ایسے ایسے اعتراضات کرتے ہیں کہ جن کے بارے میں ایک عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اِتنے سخت دِل لوگ بھی دُنیا میں ہوتے ہیں۔"

"تم کسی کی پرواہ مت کرو۔ اماں اور آئمہ کا خیال رکھو۔ میں تم لوگوں کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

نگار نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

ثوبیہ اور شہلا، ڈاکٹر یعقوب کے کلینک سے نرس کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ اسے ڈاکٹر صاحب نے بھجوایا تھا کہ اماں کے پاس ہمہ وقت موجود رہے۔ ان کا بلڈ پریشر نوٹ کرے اور ڈرپ کا دھیان رکھے۔

شیما کے چہرے پر تشکر کی پرچھائیں تھی۔ جس ہمدردی کی اسے اس وقت ضرورت تھی وہ غیروں سے مِل رہی تھی اپنوں سے نہیں تو پھر غیروں کی تعریف کیا ہے؟ اور اپنے؟

چاچا فیروز، ڈاکٹر یعقوب، اللہ رکھی باجی، نگار، ثوبیہ اور شہلا کون ہیں؟ اپنے یا غیر؟ نصیباں بھی امّی جان کی وجہ سے مجبور ہے ورنہ اس کے احساسات میں سمجھ سکتی ہوں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ سبھی اپنے ایک جیسے نہیں ہوتے، تایا ابا بھی تو ہیں۔ انھوں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر مجھے گلے سے لگایا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولے لیکن میں ان کے جذبات سمجھ رہی تھی۔ وہی ابا میاں والی ملائمت، وہی بردباری مجھے لگا تھا کہ ابا میاں زندہ ہیں۔''

خالو جان، خالہ جان اور فرید کا آسٹریلیا سے مسلسل رابطہ تھا۔ دُور بیٹھ کر وہ جتنا خیال رکھ سکتے تھے، رکھ رہے تھے۔

چاچا فیروز، بمشکل اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھے محض یہ سوچ کر کہ اب اور کون ہے جو انتظامات دیکھے اور مہمانوں کا خیال کرے۔

اللہ رکھی کے آنسو خاموشی سے گر رہے تھے، جنھیں وہ بار بار دوپٹے سے صاف کرتی، سائے کی طرح بے آواز، پھر رہی تھی۔ مہمانوں کے بستر لگواتے لگواتے وہ امّاں، شیما اور آئمہ کو بھی دیکھنے آ جاتی تھی۔

دوسرے رِشتہ دار، عزیز و اقارب، ملنے جلنے والے، ہمسائے، سبھی اشک بار تھے۔ یہ ایسی موت تھی جس پر بقول شہلا 'گلیاں دے ککھ' بھی روتے ہیں۔

OO

ابا میاں چلے گئے۔۔۔ میں تپتی دوپہر میں ننگے سر، ننگے پاؤں۔۔۔ صحرا کی آگ اُگلتی ریت میں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ آبلہ پا اور بے حال۔۔۔ نہ کوئی سراب نہ نخلستان۔۔۔ نہ دُور دُور تک کوئی آبادی۔۔۔ نہ چھپّر نہ چھاؤں۔۔۔ دم پھولا جاتا ہے۔۔۔ جسم بے جان، بے رُوح۔۔۔ ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج وانگ کرلاوندی۔۔۔ منتاں پاؤندی۔۔۔ ترلے کردی۔۔۔ میرا سائبان چھن گیا۔۔۔ میری رِدا، میری محبت۔۔۔ میرا مان تران۔۔۔

سب کچھ۔۔۔ سب کچھ۔۔۔

ابا میاں تو اب ٹھیک سے چل بھی نہیں پاتے تھے، انھیں سہارے کی ضرورت تھی لیکن میرے احساس میں وہ میری طاقت تھے۔ بیماری اور بڑھتی عمر کے ساتھ ان کا جسم کمزور پڑ گیا تھا لیکن ان کی محبت، تناور درخت بن گئی تھی جس پر میرا آشیانہ تھا۔ محفوظ۔۔۔ تیز و تند ہواؤں کی زد سے ماورا۔۔۔ وہ زندگی کی کڑی دھوپ میں چھتنار پیڑ کا سایہ تھے۔

ساتھ ساتھ چلتے لوگ کیسے راستہ بدل لیتے ہیں؟ اور وقت کے گرد باد انھیں کہاں اُڑا لے جاتے ہیں؟۔۔۔ نہ کوئی راہ گزر۔۔۔ نہ نقشِ کفِ پا۔۔۔ نہ نشانِ منزل۔۔۔ سرمد کہاں کھو گیا؟ شہرِ رفتگاں سے کوئی آئے تو اس کا پتا پوچھوں۔۔۔ میرا بھائی، میرا دوست، میرا ماں جایا۔۔۔ کا کا پٹا کا۔۔۔ ہوا کی طرح خاموش لیکن ہمیشہ میرے اِردگرد۔۔۔ وہ تو کبھی اِتنا غیر ذمّہ دار نہ تھا۔۔۔ پھر اس قدر بے اعتنائی کیسے کہ جاتے ہوئے مِلا بھی نہیں۔۔۔ میں نے کبھی اسے اپنی ذات کے دُکھ نہیں بتائے تھے لیکن اب دِل چاہتا ہے کہ وہ ہوتا تو اس سے کہتی۔۔۔ پر اس نے تو یہ بھی نہ سوچا کہ امّاں اس کے بعد کیا کریں گی؟ اس کے جانے سے گھر خالی ہو گیا۔ کہتے ہیں مرد کا جوتا ہی گھر میں آ جائے تو برکت ہو جاتی ہے۔ اس حادثے نے تو گھر کے دونوں مرد چھین لیے۔۔۔ کتنے پیارے رِشتے ہیں یہ۔۔۔

ے غلام فریدا میں تاں اونوے وِچھڑی

جیویں وِچھڑی کونج قطاراں

آئمہ اور امّاں کی حالت ایسی تھی کہ چاہنے کے باوجود، شیما ان سے یہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی تھی کہ ابا میاں اور سرمد جب حادثے کا شکار ہوئے تو وہ شیما کے ہاں کیوں جا رہے تھے؟ البتہ، اللہ رکھی کی مِنّت سماجت کر کے، وہ پوچھنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ لیکن اللہ رکھی نے جو کہا تھا وہ سن کر اسے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ ابا میاں اور سرمد وہاں بلوائے گئے تھے۔ نظیف نے انھیں فون کیا تھا کہ وہ شیما سے علیحدگی چاہتا ہے اس لیے وہ لوگ آ کر اسے

لے جائیں۔

سرمد، شدید ذہنی دباؤ کے تحت ڈرائیونگ کرتے ہوئے گاڑی پر قابو نہ رکھ سکا اور اس زور سے ایک بس سے ٹکرایا کہ گاڑی پچک کر رہ گئی اور وہ دونوں۔۔۔ان کی تو لاشیں بھی اس قابل نہیں رہی تھیں کہ۔۔۔

شیما کو ان کے جانے کا دُکھ اور یہ احساس کہ وہ اس کی گھریلو چپقلش کی بھینٹ چڑھ گئے، جیتے جی مار گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ انھیں قتل کیا گیا ہے اور قاتلہ۔۔۔وہ خود ہے۔
شام کا ملگجا اندھیرا، رات کی تاریکی میں بدل رہا تھا۔ شیما گھر کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ آنسو اس کی گالوں سے پھسل کر دامن کو بھگوئے دے رہے تھے۔ نظیف کے قدموں کی چاپ سے وہ چونکی اور آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھی۔ رونے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے سے یاسیت ہویدا تھی۔ نظیف نے اس کی طرف دیکھا اور ناگواری سے بولا۔

''تم اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو؟ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟۔۔۔ اور یہ تمہارا موڈ کیوں خراب ہے؟''

''نہیں تو۔۔۔میرا موڈ کیوں خراب ہوگا بھلا؟''

''پھر یہ نحوست ختم کرو۔۔۔مجھے یہ سب پسند نہیں۔''

انداز تحکمانہ تھا۔

(یہ نحس ہے اور تمہیں ناپسند۔۔۔تو پھر میرا دُکھ کون سمجھے گا؟)

OO

اوائل سردیوں کے دِن تھے۔ خزاں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ مالی دبے پاؤں لان میں پھر رہا تھا۔ زرد، بھورے اور قرمزی Fall Leaves اس کے پاؤں تلے چرمرا رہے تھے۔ اداس اور بوجھل ہوا، درختوں کے جھنڈ میں آہیں بھر رہی تھی۔ کھڑکی کے پٹ

کھلے تھے۔ ملگجی دھوپ، اپنی تمازت کھو رہی تھی۔ ملول روشنی کے ساتھ ہی خزاں کے نارنجی، کتھئی اور شعلہ ساں زرد رنگ بھی کمرے میں در آئے تھے۔

شیما آلکسی سے بستر میں لیٹی تھی۔ پچھلے دنوں، اسے نہاتے ہوئے سینے میں گلٹی کا احساس ہوا تھا۔ وہ خود تو شاید ڈاکٹر کے پاس جانے کی اتنی جلدی نہ کرتی، کیونکہ ابا میاں اور سرمد کی وفات سے اس کے حواس مختل اور احساس مضمحل ہو کر رہ گیا تھا لیکن جیسے ہی اس نے نگار سے اس کا ذکر کیا تو وہ اس کے درپے ہوگئی اور کھینچ کھانچ کر اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ انہوں نے چیک اپ کے بعد، کسی اچھے سرجن کو دکھانے کو کہا۔ ڈاکٹر ریاض خان نے اس کی Syringe Biopsy کی اور رپورٹ دیکھنے کے بعد، خاموش سے ہو گئے اور کہنے لگے۔

''D.C صاحب کو ہمراہ لائیے پھر اس پر گفتگو کریں گے اور دیکھئے مسز نظیف اس میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔''

شیما کو اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اس لیے اسے یہ سوچ کر ہی پسینہ آ گیا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو گیتی اور ویرو؟؟؟ بہت سے سوالیہ نشان اسے پریشان کر رہے تھے۔

ابھی تک اس نے نظیف سے اس کا ذِکر نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس کا شیما کے ساتھ، رویّہ ایسا تھا کہ آپس میں صلاح مشورے والا ماحول نہیں رہا تھا۔ اس کی طبیعت کے روکھے پن اور کرخت لہجے کی وجہ سے شیما ہمّت ہی نہیں کر پائی تھی کہ اس سے بات کرتی اور اب جب اس نے ڈاکٹر صاحب کے پاس جانے کی بات کی تو اس نے برافروختگی سے کہا۔

''اور مجھے اب بتایا جا رہا ہے؟ واہ۔۔۔میرا خیال ہے، میاں بیوی ہونے کے ناتے مجھے اس کا علم پہلے ہونا چاہیے تھا۔''

(شیما کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ پائی کہ جس دُکھ اور کرب کی کیفیت سے میں گزر

رہی ہوں، اس کا علم تو آپ کو ہے۔ پھر اس حوالے سے جس پیار، ہمدردی اور توجہ کی مجھے ضرورت ہے کیا آپ وہ دے رہے ہیں؟)

''صحیح کہہ رہے ہیں آپ، مجھے واقعی پہلے ذکر کر دینا چاہیے تھا۔ تو پھر اب کب چل رہے ہیں آپ؟'' ہمیشہ کی طرح، شیما نے مصالحت کا راستہ اپنایا۔

''یہاں تک ہو گیا ہے تو پھر رپورٹ پر بھی بات کر لو۔ میرا جانا اتنا کیا ضروری ہے؟''

نظیف کا رویہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا، وہ شیما کے ہر کام میں طریق کار کی غلطیوں کی نشان دہی کرتا رہتا تھا۔ شروع میں تو وہ مزے سے کہہ دیا کرتی تھی کہ D.C صاحب کو سرکاری کاموں میں، مین میخ نکالنے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ بیوی کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیتے۔ لیکن اب تو ایسا کہنا کسی بڑی مصیبت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔ اعتراضات کے انبار میں، اصل معاملہ دب کر رہ جاتا۔ رافعہ کی طرح، اس کا اعتماد بھی اب ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ہر کام کرنے میں اسے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی، یہ سوچ کر کہ نظیف سے کبھی بھی اس کے درست ہونے کی سند نہیں ملے گی۔ بلکہ بہت سے ان دیکھے نقائص، اس کے سامنے آ جائیں گے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے ڈھکے چھپے اظہار تشویش سے وہ جس ذہنی تناؤ کا شکار تھی اس کے حوالے سے اِس وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ نظیف اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہے،

''سب ٹھیک ہو جائے گا آپ پریشان نہ ہوں۔''

لیکن شادی کے شروع دنوں کے علاوہ، اسے اس بات کی حسرت ہی رہی تھی اور کتنی ہی ایسی آرزوئیں، روزانہ اس کے دل میں دم توڑ دیتی تھیں۔

''ڈاکٹر صاحب نے آپ کو ساتھ آنے کو کہا ہے۔''

''میں تو آج کل بہت مصروف ہوں۔ کچھ دنوں کے بعد دیکھیں گے۔''

''آپ کی مصروفیت۔۔۔'' شیما کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب نے تو جلد آنے کو کہا ہے۔''

شیما نے آہستگی سے کہا۔

''تو پھر تم بتاؤ، استعفیٰ دے دوں؟''

نظیف حسب عادت تو تڑاک پر اتر آیا تھا۔

اس رات پھر شیما کا تکیہ بھیگتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے، لفظ کینسر استعمال نہیں کیا تھا لیکن بین السطور انہوں نے اس کا اظہار کر دیا تھا۔ شیما تو یوں بھی پریشان تھی۔ اُوپر سے نظیف کا بیگانہ پن اسے مارے ڈال رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس صورتِ حال میں ابا میاں اور سرمد ہوتے تو اسے وہ مطلوبہ سہارا مل جاتا، جس کی اسے، اس وقت اشد ضرورت تھی۔

اگلے روز نگار نے اس سے بے تابی سے پوچھا:

''تم ڈاکٹر صاحب کے پاس گئیں؟ کیا کہا انہوں نے؟''

''نہیں، دراصل نظیف بہت مصروف ہیں دو تین دن بعد شاید جا سکیں۔''

''کیا؟ کیا؟ کیا؟ ایسی کون سی مصروفیت ہے، جو اس وقت بھی ان کے راستے میں حائل ہے۔ صبح کے خبرنامے میں تو تھا کہ سمندر کی آگ، جناب نظیف ہارون مدظلہ کی مدد کے بغیر ہی بجھالی گئی ہے۔ خیر چھوڑو انہیں۔۔۔ ہم خود چلتے ہیں۔ ایسا کیا ہے، جو ہمیں سمجھ نہیں آئے گا؟

''یہ بات نہیں ہے نگار، تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ اگر یہ وہی معاملہ ہے جو میں سمجھی ہوں تو پھر۔۔۔ مجھے سارا وقت نظیف کے ساتھ کی ضرورت ہوگی۔ اس کا علاج بہت لمبا، کٹھن اور مہنگا ہے اور نظیف، اس مرحلہ پر ہی ناراض ہو گئے تو میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔ ابا میاں اور سرمد کے جانے سے، اماں اور آئمہ بھی، بے دست و پا ہو گئی ہیں۔ میں بہت مشکل میں ہوں۔۔۔ پلیز نگار۔۔۔ تھوڑا انتظار کرنے میں کیا حرج ہے؟ سمجھنے کی کوشش کرو یار۔''

نگار نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہوگئی پھر اس نے شیما کو اپنے ساتھ لگالیا۔ رات بہائے جانے والے آنسوؤں سے شیما کے درد کی تشفّی نہیں ہوئی تھی، اب پھر وہ اس کی گالوں پر، خاموشی سے بہنے لگے۔

شام کو نظیف نے اچانک گھر آ کر، اسے ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا تو شیما نے سوچا۔

''میں تو یونہی بدگمان ہو جاتی ہوں، نظیف اب بھی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بس ان کی مصروفیت۔۔۔''

اور پھر ڈاکٹر صاحب نے وہی کہا جو متوقّع تھا، اسے بریسٹ کینسر تھا۔

شیما دھک سے رہ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے اس کے دماغ میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ اس کا دِل، کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ چیخنا نہ شروع کر دے۔ تھوڑی دیر کے لیے، وہ آنکھیں بند کر کے، کرسی سے سر ٹکائے، خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا بے طرح دِل چاہا کہ یہ سب محض ایک ڈراؤنا خواب ہو۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ پچھلے کچھ عرصہ سے، اس کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا تھا، جو اس نے کبھی بھی نہیں چاہا تھا کہ ہو۔

''ڈاکٹر صاحب، اس کا علاج ممکن ہے؟ کیا میں صحت یاب ہو جاؤں گی؟''

شیما نے ڈرتے ڈرتے، ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

''جی مسز نظیف، اِبتدائی مرحلے میں معلوم ہو جائے تو ممکن ہے۔ کینسر کے علاج میں اگر چہ کافی ترقی ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں نئی نئی ادویات اور ایجادات سامنے آ چکی ہیں، پھر بھی عام لوگوں میں یہ تصوّر ابھی قائم ہے کہ کینسر کے علاج کے سلسلہ میں، اگر کچھ کیا جا سکتا ہے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی لیے تو کینسر، نام ہی ہوش اُڑا دینے والی بیماری کا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

''اور میری بیماری کس مرحلے میں ہے؟''

''فکر نہ کیجیے، یہ ابتدائی مرحلہ میں ہی ہے۔ اس میں باقاعدگی سے علاج پورا کیا جائے گا تو ان شاء اللہ ہم اس پر قابو پالیں گے۔''

ڈاکٹر صاحب کا لہجہ، حوصلہ دلانے والا تھا۔

''آپ مصروف ہیں، لیکن کیا آپ اس کے بارے میں مجھے تھوڑا سا بتائیں گے؟''

''جی، جی، کیوں نہیں۔ یہ آپ کے علاج کا حصّہ ہے۔ ہم سبھی مریضوں کو، ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق، بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ اسے بہتر طور پر سمجھ سکیں گی۔

کینسر تمام عمر کے لوگوں پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ مرد، عورت اور بچّے بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ جسم کے کسی بھی حصّے میں شروع ہو سکتا ہے۔ اس کی علامات، کبھی کبھار اِتنی واضح اور صاف نہیں ہوتیں۔ اس صورت میں، اس کی موجودگی کا علم دیر سے ہو سکتا ہے۔ تب یہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب، عام فہم انداز میں معلومات دے رہے تھے۔

''اس کی وجوہات کیا ہوتی ہیں؟''

''اس کی زیادہ تر وجوہات ابھی نامعلوم ہیں۔ انھی باتوں کی بنا پر اسے ایک موذی مرض سمجھا جاتا ہے، لیکن، میں زور دے کر کہوں گا کہ بدحواس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں، کیونکہ اب یہ میڈیکل سائنس کے نرغے میں آ چکا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نظیف، خاموشی سے گفتگو سن رہا تھا۔

''اور اگر اِبتدائی مرحلہ میں اس کی تشخیص ہو جائے تو علاج ممکن ہے اور اب بے شمار لوگ علاج کے بعد، لمبی اور صحت مند زندگی گزار رہے ہیں اور ان میں اس بیماری کی کوئی نئی علامات ظاہر نہیں ہوئی ہیں۔''

شیمانے قدرے سکون محسوس کیا۔

''اس کی وجوہات کے بارے میں کی جانے والی تحقیق، ابھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچی لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ سگریٹ نوشی، پان، ماحولیاتی آلودگی اور نفسیاتی دباؤ، اس کی وجہ بن سکتے ہیں۔

میں آپ کو زیادہ تفصیل اس لیے بھی بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ آپ کی کولیگز، طالبات، D.C. صاحب کا حلقۂ احباب اور لیڈیز کلب وغیرہ میں آپ خواتین کو ابتدائی معلومات دے سکتی ہیں۔''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔''

شیمانے ڈاکٹر صاحب کی تائید کی۔

''جسم میں تمام tissues (بافتیں) عام طور پر بڑھتے رہتے ہیں اور cell (خلیے) تقسیم در تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے زخم بھرتے اور جلد کے نئے پرت بنتے ہیں۔ یہ عمل، ضرورت کے مطابق کام کرنے کے بعد، خود بخود رک جاتا ہے لیکن جب یہ بے قابو ہو جائے تو اسی کو کینسر کہتے ہیں، جس میں خلیات، بے قاعدہ اور بے ترتیب طریقے سے تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بے قابو تقسیم، مختلف اعضاء کو گھیر لیتی ہے اور ان کے کام میں دخل اندازی کرتی ہے۔

پھر یہی cell خون کی نالیوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور جسم کے کسی دوسرے حصے میں کینسر کی وجہ بنتے ہیں اور وہاں پر ایک گلٹی نمودار ہوتی ہے، جیسی کہ آپ نے اپنے سینے میں محسوس کی۔''

شیما ڈاکٹر صاحب کے لفظ، لفظ کو غور سے سن رہی تھی۔

''لیکن سبھی گلٹیاں malignent (سرطان زدہ) نہیں ہوتیں۔ عام گلٹی کو benine (غیر کینسر زدہ) کہتے ہیں۔ ان دونوں کا فرق صرف biopsy (مخصوص ٹسٹ)

سے معلوم کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ آپ کی رپورٹ میرے سامنے ہے۔''

واپسی پر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں، شیما بے حال ہوئی جارہی تھی، کیونکہ ڈرائیور کے سامنے وہ کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن گھر آ کر ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ اس کا دِل چاہا کہ نظیف اسے اپنی بانہوں میں لے کر، اسے اس مصیبت سے نپٹنے کا حوصلہ دے دے اور وہ بے فکر ہو جائے، وہ اس سے کہے کہ شیما تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے تمہیں صحت یاب ہونا ہے میرے لیے۔

''کافی مہنگا علاج ہے لیکن اب کروانا تو ہے۔''

نظیف نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

(اچھا تو یہ خاموشی، اخراجات کی پریشانی میں ہے)

OO

اگلے روز اس کا آپریشن تھا۔ رات کو اس نے امّی جان کو بتایا تو انہوں نے زور سے ہنکارا بھرا۔

''ہاں مجھے نظیف نے بتایا ہے، کہہ رہا تھا کہ بہت مہنگا علاج ہے۔''

مہنگا علاج۔۔۔ شیما دل مسوس کر رہ گئی۔ اس کے پاس اگر بینک میں رقم ہوتی تو وہ ان لوگوں کی اس تشویش کو دور کر دیتی لیکن اس کی تنخواہ تو ساتھ ساتھ ہی خرچ ہو جاتی تھی۔

اور جب کبھی اسے ضرورت ہوتی اور وہ نظیف سے کہتی تو وہ رکھائی سے جواب دیتا۔

''فی الحال، آپ کچھ بندوبست کر لیں، بعد میں، مَیں آپ کو ادا کر دوں گا۔''

لیکن چونکہ اس 'بعد' کی وضاحت، شیما نے کبھی نہیں چاہی تھی، اس لیے وہ 'بعد' کبھی نہ آتی۔

نظیف کا دوسرا، بندھا ٹکا جواب یہ ہوتا۔

''میرے پاس تو نہیں ہیں۔۔۔ دیکھیں 'کچھ' کرتے ہیں۔''

لیکن 'بعد' کی طرح 'کچھ' کی بھی نوبت نہ آتی۔ یہ الگ بات کہ شیما سے چھپائے

جانے کے باوجود اسے اندازہ ہو جاتا کہ ایک بڑی رقم، نظیف کے ماموں لوگوں کو بھجوائی گئی ہے کسی 'اشد' ضرورت کے سلسلے میں۔ اور اگر کبھی، شیما ڈرتے ڈرتے نظیف سے گلہ کرتی تو وہ جلے ہوئے لہجے میں جواب دیتا:

"میں تو یہی کر سکتا ہوں۔"

تو شیما کہہ نہ پاتی کہ:

"آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر کرنا چاہیں تو۔۔۔ کیا میں آپ کو، اپنے ننھیال کی 'دامے، درمے، سخنے' خدمت کرتے نہیں دیکھتی۔"

اور اب ان لوگوں کو مہنگے علاج کی فکر ہے یہ کسی نے نہیں سوچا کہ ان کے بچوں کی ماں بیمار ہے۔ اس بھیانک بیماری کا عفریت اسے نگل جائے تو گیتی اور ویرو کیا کریں گے؟ مزید سوچنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

اس نے نغمانہ باجی کو فون کیا، یہ سوچ کر کہ کہیں وہ دوبارہ ناراض نہ ہو جائیں کہ مجھے 'باقاعدہ' اطلاع کیوں نہیں دی گئی اور اس اُمید پر بھی کہ وہ اس کے ساتھ ہسپتال رہنے کو کہیں گی لیکن انہوں نے فوراً ہی اس کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"میری تو اپنی طبیعت بہت خراب ہے۔ تبخیرِ معدہ نے بے حال کر رکھا ہے۔ میں تو اتی جان سے کہنے ہی والی تھی کہ چند روز کے لیے میرے پاس آجائیں۔ میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ ذرا ان سے بات کروانا، میں انہیں کہوں کہ صبح ہی آجائیں۔"

اس کے بعد اس نے آمنہ کو فون کیا۔ وہ بری طرح گھبرا گئی۔

"آپی یہ کیا ہو گیا؟"

"کچھ نہیں آمنہ۔ تم پریشان نہ ہو اور نہ ہی اماں کو خبر ہونے دینا۔ کل علی الصبح آکر، تم گیتی اور ویرو کو لے جاؤ۔ چند دن تمہارے پاس رہیں گے۔ اماں سے میری مصروفیت کا کوئی بہانہ بنا دینا۔"

پھر اس نے نگار کو فون کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس تشویش کا اظہار کرتی کہ اس کے پاس ہسپتال میں کون ہو گا، نگار نے کہا۔

"میں تمہارے پاس رہوں گی ہسپتال میں۔ ایک ہفتے کی چھٹی لے لیتی ہوں۔ زیادہ کی ضرورت ہوئی، تو دوبارہ لے لوں گی۔ شہلا اور ثوبیہ باری باری آتی رہیں گی اور دیکھو تم پریشان مت ہونا۔ اللہ ہمارے حال پر رحم کرے گا۔ بچوں کو آمنہ کے پاس بھیج دو۔ چیک میں ثوبیہ کو دے آؤں گی، وہ صبح کیش کروا کے لے آئے گی اور دیکھو ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ پریشان نہیں ہونا پریشان تو وہ ہوں، جو ایسی صورتِ حال میں اکیلے ہوں اور تم ہرگز، ہرگز اکیلی نہیں ہو۔ اور باہمّت بھی ہو۔ صبح مجھے تمہارا ہنستا ہوا چہرہ نظر آئے۔ ٹھیک ہے نا!"

نگار نے اس کی بہت بڑی پریشانی دُور کر دی تھی۔

گیتی اور ویرو سو گئے تو شیما ان کے کمرے میں گئی نصیباں نماز پڑھ رہی تھی۔ اس نے جائے نماز سے اٹھ کر اسے پھونک ماری اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ شیما اس کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جاگتے میں بچوں کا سامنا کرنے کی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اسے روتا دیکھ کر گیتی جو سوال کرتی، ان کا جواب دینا بہت مشکل تھا۔ وہ تو ابا میاں اور سرمد کو یاد کر کے بھی، ان کے سامنے کبھی نہیں روتی تھی۔ آج بھی وہ کم حوصلگی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہیں پیار کر کے وہ کمرے میں واپس آئی تو نظیف گہری نیند سو رہا تھا۔

(یہ میری زندگی کا ساتھی ہے؟)

صبح شیما سو کر اٹھی تو بے چین تھی۔ رات بھی بار بار اس کی آنکھ کھل جاتی تھی اور سوچوں کے بھوت اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے تھے۔

نماز پڑھنے کے بعد وہ بڑی دیر تک جائے نماز پر بیٹھی دعا کرتی رہی اور جب اٹھی تو مطمئن تھی۔ معاملات خدا پر چھوڑ دیے جائیں تو دل کو بڑی حد تک ڈھارس ہو جاتی ہے اور پھر جو ہونا ہے اس کو روکا یا بڑھایا نہیں جاسکتا۔ یہ سوچنے کے بعد وہ سنبھل گئی۔ یوں بھی فوری

صدمے سے وہ گزر چکی تھی اور آنسو بہا دینے سے ہلکی پھلکی ہوگئی تھی، اس نے سوچا کہ وہ کسے پریشان کرے؟ بچوں کو، اماں یا آئمہ کو، اپنی دوستوں کو، چاچا فیروز، اللہ رکھی یا نصیباں کو۔ کس کو؟ باقی تو پریشان تھے ہی نہیں تو وہ ان کے لیے کیا فکر مند ہوتی؟

بچوں کی تیاری مکمل کرنے کے بعد شیما نے اپنا بیگ تیار کیا۔ بچوں کو ناشتہ کروایا۔ اتنی دیر میں آئمہ اور اللہ رکھی آ گئیں۔ آئمہ کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اللہ رکھی کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ دونوں ہی منہ سے کچھ نہ بولیں، لیکن ان کے احساسات، شیما پر عیاں تھے۔

''ارے تم لوگوں کو کیا ہوا؟ سفر تو خیریت سے گزرا؟ اور تم دونوں کیوں آ گئیں؟ اماں کو اکیلے کیوں چھوڑا؟''

شیما نے بہت سے سوالات یک دم داغ دیے اور کھلکھلا کر ہنسی۔

دونوں نے ہی اسے حیرت سے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے؟ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا اور لوگ بیمار نہیں پڑتے ہیں؟ میں نے کیا دُنیا سے انوکھا کام کیا ہے؟'' شیما پھر ہنسی۔

شیما کی اس بے وقت کی ہنسی نے ان دونوں کو دکھی کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ شیما اس وقت پریشانی پر ہنسی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔

بچے جب دادی اماں کو خدا حافظ کہنے کے لیے گئے تو انہوں نے شیما سے کہا۔

''نہیں بھیج کر اچھا کر رہی ہو، میں تو نغمانہ کے ہاں چلی جاؤں گی۔ وہ گھر پر اکیلے رہتے۔''

آئمہ اور اللہ رکھی، چائے پی چکیں تو شیما نے کہا۔

''لو آئمہ، بچوں کو ساتھ لو اور چلو، مجھے ہسپتال جانے کے لیے تیار ہونا ہے۔ اللہ رکھی باجی، اماں کو کچھ معلوم نہ پڑے، دھیان رکھیے گا۔''

''لیکن میں تو نہیں جا رہی۔ میں تمہارے پاس ہسپتال میں رکوں گی۔ ہم اماں کو

یہی بتا کر آئی ہیں کہ تمہارے گھر میں بہت سے مہمان آ رہے ہیں اس لیے تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''نہیں باجی۔۔۔آپ۔۔۔''

''بیگم صاحبہ اسے رکنے دیں۔ میں آپ کے ساتھ ہسپتال چلتی لیکن بڑی بی بی جی اجازت نہیں دیں گی۔ ویسے بھی میں آپ کے لیے پرہیزی اور باقی لوگوں کا کھانا ہسپتال بھجواؤں گی۔'' نصیباں نے بڑی ذمہ داری سے صورتِ حال کے مطابق اپنا فیصلہ دے دیا تھا۔

آئمہ نے تہہ کیے ہوئے کافی زیادہ نوٹ، چپکے سے اس کی مٹھی میں تھما دیے۔

''یہ کیا؟ میری بڑی نہ بنو، بیٹا'' شیما نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

''اگر اماں کو معلوم ہوتا، تو وہ یہی کرتیں۔'' آئمہ نے آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو بمشکل پیتے ہوئے کہا۔

بچوں کے جانے کے بعد، شیما خود تیار ہوئی۔ گہرے گلابی اور براؤن پرنٹ کا سوٹ پہنا۔ بال خشک ہونے کے لیے کھلے چھوڑے ہوئے تھے جو اس کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ لپ اسٹک اور خوشبو لگا کر وہ کمرے سے باہر آئی تو لگتا تھا کسی پارٹی میں جا رہی ہے۔

امّی جان سے ملنے گئی تو وہ حسب توقع 98°F بخار میں مبتلا ہو چکی تھیں اور چادر سر سے پاؤں تک اوڑھے ہوئے تھیں۔ شیما کے قدموں کی آہٹ سن کر بھی انہوں نے چادر نہیں ہٹائی تو اسے مجبوراً آواز دینا پڑی۔

''امّی جان میں خدا حافظ کہنے کے لیے آئی ہوں۔ ہسپتال جا رہی ہوں۔ دُعا کیجیے گا۔''

''میری تو خود طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رات سو نہیں پائی۔ نغمانہ کے فون نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ یہ تبخیرِ معدہ، بہت برا مرض ہے۔''

نظیف کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

''آپ ہسپتال پہنچیں، میں آپریشن سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے ماؤتھ پیس

پر ہاتھ رکھ کر شیما سے کہا۔

شیما ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر تیزی سے باہر نکلی۔ ڈرائیور بیگ لے جا چکا تھا۔ اللہ رکھی گاڑی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ بالکل خالی الذہن تھی۔ نہ کچھ سوچ رہی تھی اور نہ ہی کچھ سوچنا چاہتی تھی۔

ہسپتال کے استقبالیہ کے پاس نگار، ثوبیہ اور شہلا منتظر تھیں شیما کا چہرہ ہشّاش بشّاش تھا۔ اتنے پیارے لوگوں کو وہ بالکل پریشان نہیں ہونے دے گی۔ شیما نے دل ہی دل میں اپنے عزم کو دہرایا۔

''تم تو یوں سجی بنی ہو جیسے کسی کافی پارٹی میں شرکت کے لیے آئی ہو۔'' شہلا نے کہا۔

''ویسے بھی حسنِ بیمار، کچھ زیادہ ہی دمک رہا ہے شعلہ جوالا لپ اسٹک، ساحر آنکھوں کے بھاری پپوٹے،

ع تیری صبح کہہ رہی ہے، تیری رات کا فسانہ

ٹھیک سے سوئی نہیں ہو یا روتی رہی ہو۔۔۔ بہرحال بہت اچھی لگ رہی ہو۔ دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب تمہاری بجائے، آپریشن پر زیادہ توجہ دیں۔'' نگار نے حسبِ عادت لمبی بات کی۔

''بات یہ ہے دوستو کہ

ے جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں''

شیما نے لہک لہک کر شعر پڑھا۔

''فیض کے شعر کی کیا بات ہے۔ لیکن بہن کسی مقتل و قتل میں نہیں جا رہیں آپ۔ لہٰذا یہ ڈرامہ بازی اور توجہ حاصل کرنے کا یہ بہت ہی عامیانہ طریقہ، نا منظور'' نگار نے کہا۔

شیما نے آئمہ کی دی گئی رقم اسی انداز میں چپکے سے نگار کے ہاتھ میں تھما دی۔

''آخاہ تو D.C. صاحب نے آخرکار تمہارے ہاتھ میں اتنی بڑی رقم دے ہی دی۔ تمہیں آپریشن بہت، بہت مبارک ہو۔''

''فضول نہیں۔ یہ تو صبح آئمہ دے کر گئی ہے۔'' شیما نے وضاحت کی۔

''میں بھی کہوں۔۔۔ یہ اک دن میں کیا ماجرا ہو گیا کہ انڈے پہ ہاتھی کھڑا ہو گیا۔ اچھا تو D.C. صاحب نے کہا ہو گا۔

''بیگم صاحبہ، میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں آپ خرچ کر لیجیے، میں بعد میں دے دوں گا۔''

اور آپ قربان ہو گئی ہوں گی کہ نظیف کو میرا کتنا خیال ہے۔ میری مانو تو اب اس آپریشن کو دو ہاتھ مار لو اور پھر اس 'بعد' کے بارے میں معلومات کرو کہ یہ آج تک آئی کیوں نہیں اور آئندہ بھی آنے کا امکان ہے یا نہیں۔'' نگار نے جلے دل سے کہا۔

ہسپتال کا عملہ، بیگم ڈپٹی کمشنر کی 'خاطر داری' کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ جس میں D.C. صاحب کے آ جانے سے اور شدّت آ گئی۔

نظیف کو اکیلے آتے دیکھ کر نگار نے آہستگی سے کہا۔

''تمہاری ساس محترمہ نہیں آئیں۔ تمہاری نند کو پھر سے اس مہلک بیماری نے تو نہیں آن لیا۔ کیا بھلا سا نام ہے اس کا تبخیرِ معدہ''

شیما کے منع کرنے کے باوجود اسے وھیل چیئر پر بٹھایا گیا۔ آپریشن تھیٹر کے لباس، ہلکے آسمانی رنگ کے پاجامے اور اوپن شرٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

نگار نے کہا۔ ''تم خیریت سے واپس آؤ پھر تمہارے لیے ایسا ہی ایک لباس، کالج کے لیے بھی بنوایا جائے گا۔ بہت بھلا لگ رہا ہے۔''

آپریشن تھیٹر کے دروازے پر نظیف نے شیما کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستگی سے دبایا تو شیما نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور ہولے سے کہا:

''بچوں کا خیال رکھیے گا۔'' پھر وہ مڑ کر دیکھے بغیر اندر داخل ہو گئی۔

آپریشن ٹیبل پر لیٹ کر، اس نے سب کچھ، خدا کے سپرد کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

پھر جب آنکھ کھلی تو وہ ہسپتال کے کمرے میں تھی۔ نگار، شہلا اور اللہ رکھی اس کے گرد موجود تھیں اور بے تابی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

شہلا ڈاکٹر صاحب کو بتانے چلی گئی کہ شیما کو ہوش آ گیا ہے۔ اللہ رکھی نے ساری سورتیں جو وہ اس وقت پڑھ رہی تھی اس کے چہرے پر پھونکیں اور اس کا ماتھا چوم لیا۔

شیما نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور نقیہہ لہجے میں کہا،

''نگار، آئمہ کو فون کر دینا کہ میں خیریت سے ہوں۔''

اور آج اس کے آپریشن کو دس روز ہو گئے تھے۔ آئمہ بچوں کو واپس چھوڑ گئی تھی۔ اللہ رکھی واپس جا چکی تھی۔

اس کی پرنسپل صاحبہ اور کولیگز بلکہ سارا عملہ، باری باری ہسپتال میں اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آئے تھے۔ نگار، شہلا اور ثوبیہ باقاعدگی سے، فون پر اس سے بات کرتی رہتی تھیں۔ ہسپتال میں، جس طرح سے انہوں نے اس کا خیال رکھا تھا، وہ خود کو بہت توانا محسوس کر رہی تھی۔

نظیف کے ننھیال والوں نے جو شیما سے اس قدر خاطر داریاں کرواتے رہے تھے جھانک کر دیکھنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔ البتہ امّی جان اور نغمانہ ایک بار ہسپتال آئی تھیں، وہ بھی بہت رسمی طریقہ سے۔

امّی جان نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بہت مایوس لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں، بخار نہیں ہے۔''

اس پر نگار بڑبڑائی۔

''تبخیرِ معدہ بھی نہیں ہے $98^{o}F$ بخار بھی نہیں ہے۔ یہی تو دو کام کی بیماریاں ہیں

دنیا میں۔ کینسر کا کیا ہے، وہ تو ہمہ شمہ کو اکثر ہوا ہی رہتا ہے۔'' شہلا نے اسے آنکھیں دِکھائیں۔

گھر کی روزمرّہ کی زندگی شروع ہو چکی تھی۔ نظیف کی مصروفیت، امّی جان کی پس پردہ موسیقی، بچوں کی قلقاریاں اور امّی جان سے چھپتے چھپاتے، نصیباں کی شیما کے لیے خاطر داریاں اور شیما سوچ رہی تھی کہ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب اجازت دیں گے وہ کالج جانا شروع کر دے گی۔

شیما اپنی سوچوں میں گم تھی کہ نصیباں کمرے میں آئی اور بتایا کہ بیگم A.D.C.G اس کی مزاج پُرسی کے لیے آئی ہیں۔ شیما ابھی تک، ان بیگمات سے مانوس نہیں ہو پائی تھی۔ اتھلا پن، مصنوعی رویّہ اور بلاوجہ کی نمائش اسے ہضم نہیں ہوتی تھی۔ لیکن قہر درویش، بر جانِ درویش اس نے نصیباں سے کہا کہ وہ انہیں بیڈروم میں ہی لے آئے۔

شیما ابھی بمشکل اُٹھ کر کھڑی ہی ہوئی تھی کہ بیگم A.D.C.G نے اس زور سے معانقہ کیا کہ آپریشن کا تازہ زخم بلبلا اٹھا۔ ساتھ ہی انہوں نے دھائیں دھائیں رونا شروع کر دیا۔ اب شیما کی حالت دیدنی تھی کہ اپنے زخم کو سہلائے یا اپنے تیماردار کو بہلائے۔

کمرے کی تنی ہوئی فضا میں اس وقت تھوڑی کمی واقع ہوئی جب نصیباں کولڈ ڈرنک کے کھنکتے گلاس لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ شیما نے بیگم A.D.C.G کی اشک شوئی کے لیے جلدی سے ٹشو پیپر کا ڈبہ بڑھایا۔ ان کے حواس بجا ہونے میں کولڈ ڈرنک نے کافی ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ صوفے پر شیما کے ساتھ آ کر بیٹھ گئیں، شیما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر، پیار کیا اور اسے فکر مند ہونے سے بچانے کے لیے اپنی کسی ملنے والی کا قصّہ سنانا شروع کیا۔

''بس یوں سمجھ لیجیے مسز نظیف کہ آپ والا ہی کیس ہے پہلے انہیں چھاتی میں گلٹی محسوس ہوئی، آپریشن ہوا، پھر 'بجلی' لگتی رہی۔ ٹیکوں کا کورس بھی مکمل ہو گیا۔ بال وال اُتر گئے ۔۔۔۔ بہرحال وہ ٹھیک ہو گئیں۔''

شیما نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ مسز A.D.C.G گلوگیر آواز میں دوبارہ

شروع ہوگئیں۔

"لیکن اب کینسر ان کی ریڑھ کی ہڈی میں جم گیا ہے۔ بہت پریشان ہیں۔ ایک دن، مجھے خاص طور پر پیغام بھیج کر بلوایا تھا، کہہ رہی تھیں۔ مِل لو بہن سے، چند دن کی مہمان ہے۔"

بات ختم کرتے ہی انہوں نے دوبارہ چھکوں پھکوں رونا شروع کر دیا۔

"مجھے آپ کی بہت فکر ہے آپ کے بچّے تو ابھی بہت چھوٹے ہیں۔"

پتا نہیں انہیں کیوں یقین ہو گیا تھا کہ شیما کا کینسر بھی جلد ہی اس کی ریڑھ میں منتقل ہونے والا ہے۔

شیما کو اپنا تھو تھمبو کر کے سنبھالا ہوا حوصلہ، زمین بوس ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

OO

شیما کی کیموتھراپی ختم ہو گئی تھی اور اب پندرہ دِن کا وقفہ دینے کے بعد، ریڈیوتھراپی شروع ہونے والی تھی۔ آج پہلا دِن تھا۔ وہ مقررہ وقت پر پہنچ گئی تھی، لیکن ڈاکٹرز کی میٹنگ جاری تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں اکیلے بیٹھنے سے، اسے تھوڑی دیر بعد ہی وحشت ہونے لگی۔ اس لیے وہ انتظار گاہ میں آن بیٹھی۔

بہت سی خواتین جن کی ریڈیوتھراپی شروع تھی، اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

سبھی تقریباً ایک سے حلیے والی خواتین۔۔۔ سٹیرائیڈ کھانے کی وجہ سے پھولا ہوا چہرہ، بھدّا جسم، کیموتھراپی سے جلی ہوئی رنگت، سر کے بال غائب، پژمردہ اور نڈھال۔

سبھی نے بہت ماہرانہ اور 'ڈاکٹرانہ' انداز میں اس کی خیریت معلوم کی اور مختلف استفسار کیے۔ جسم کے کس حصّے کا کینسر ہے؟

علاج کس مرحلے میں ہے؟

دِل کتنا متلاتا ہے؟

میاں اور سسرال والوں کا رویّہ کیسا ہے؟

اور پھر اس طرح اسے شاملِ گفتگو کرنے کے بعد سب نے اپنی اپنی داستان سنانا شروع کی۔

"میرے 'چاچکے پنڈ' (چاچا کے گاؤں) کی سکینہ کو بھی چھاتی کا کینسر تھا۔ وہ میرے پیچھے پڑی رہتی تھی کہ تو نے اپریشن کیوں کروایا؟ تیرا تو ایک 'پاسا' (طرف) ویسے ہی 'پدرا' (ہموار) ہو گیا ہے۔ اس کے بندے نے تو اُسے اپریشن کروانے ہی نہیں دیا، کہتا تھا کہ یہی تو عورت کی 'زینت' ہے۔ اور ڈاکٹر تو قصائی ہیں۔ اللہ ان کے بس کسی کو نہ ڈالے۔ بس وہ تو دیسی علاج ہی کرتی رہی۔۔۔ نیم کے پتے اور 'نمولیاں' (نیم کا پھل) چھاؤں میں 'سکا' (خشک) کر 'گوکے' (گائے) گھی میں تل لیتی تھی اور پھر انھیں شہد میں ملا کر گولیاں بنا لیتی تھی۔ کہتی تھی:

"شہد میں بڑی شفا ہے جی!"

اس لیے وہی نہار منہ، پانی کے ساتھ کھاتی رہی۔ پرسوں، اس کے قل تھے۔ میں نے تو یہاں آنا تھا، جا ہی نہیں سکی۔ سنا ہے اس کا بندہ، میّت پر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا، کہتا تھا:

"اگر "چھڈ" (چھوڑ) کر ہی جانا تھا، تو "اینا پیار کیوں پایا سی" (تو اتنا پیار کیوں بڑھایا تھا۔) اب بے غیرت کو پیار یاد آ رہا ہے۔"

خاتون کا بس نہیں چل رہا تھا کہ 'بے غیرت' کا گلا دبا دیتی، پھر ذرا دور بیٹھی سانولی عورت، جس کے چہرے پر چھائیوں نے نقش و نگار بنا رکھے تھے، نے بتانا شروع کیا۔

"میری چھوٹی بہن کو بھی یہی مرض تھی۔ مُک گئی بے چاری۔ اس کا خاندان بہت ظالم ہے۔ علاج ہی نہیں کروایا۔ 'ڈڈواں دی پنسیری تے بے عقلاں دا ٹبّر' (پانچ سیر مینڈک اور بے عقل خاندان ایک برابر ہوتے ہیں) نہ عقل، نہ موت۔ میری بہن 'اندر پا کے مار دی' (بغیر علاج کروائے گھر میں رکھ کر ختم کر دی) میں تو تب سے 'تُوہ ٹاہ' کر دیکھتی رہی۔

میرا بندہ تو کہتا تھا تو دشمن ہے لیکن وہی ہوا جس کا ڈر تھا اور میرے بندے نے بھی وہی کیا جو میری بہن کے خصم نے کیا تھا۔ مانتا ہی نہیں تھا۔ پر میں نے تو اپریشن کرالیا 'بزور' (زبردستی) ہو کر۔ اللہ بھلا کرے یہ ہسپتال بنانے والوں کا، ورنہ میری کون سی پسلی تھی اتنا بڑا کام کرنے کی۔ پر میرا بندہ تو تب سے میرے 'نیڑے' نہیں لگا۔ کہتا ہے میں نے 'کھسرے' کے ساتھ 'ویاہ' تو نہیں کیا تھا نا!''

ٹھنڈی سانس بھرنے کے بعد عورت دوبارہ شروع ہوگئی۔

''پر میں بھی بڑی ڈھیٹ ہوں۔ شکر ہے ربّ سوہنے کا۔ ڈاکٹر کہتا ہے مجھے صحت ہو جائے گی۔ خیر سے بچے تو پال رہی ہوں۔ مرد کا کیا ہے وہ تو ویسے ہی 'بنے بنّے' پھرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں زندگی ایک ہی 'وار' ہے۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ خوش ہوں وہ اپنے 'ٹھرک' کہیں اور پورے کرلے۔ بیگم صاب آپ کے ساتھ تو آپ کے میاں کا 'وہار' ٹھیک ہے نا! پر وہ تو میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ آپ تو پڑھے لکھے لوگ ہو، آپ کا اِن باتوں سے کیا مطلب؟''

شیما جواباً مسکرادی۔

(ان باتوں سے کس کا مطلب نہیں ہوتا؟؟)

دوسرے کونے میں بیٹھی ہوئی ایک عورت بولی:

''جب میرا بڑا کاکا ہونے والا تھا تو میری طبیعت بہت خراب ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے کتنے ہی ٹیکے لگائے تھے۔ ٹیکا لگوانے کے بعد میں وہیں، ڈاکٹر کی دُکان پر ہی بیٹھ کر، بوتل پی کر گھر آتی تھی۔ خرچہ تو ''وادو'' (فالتو) ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ 'اونتری' (بے اولاد گالی)، 'تیکھے' (Straw) والی بوتل ٹھنڈ بہت ڈالتی تھی۔ پر اب تو شاید بوتلوں میں اثر ہی نہیں رہا، ان ٹیکوں کے بعد جو مرضی کرلو، آگ ہی لگی رہتی ہے۔ سگوں، ایک دِن مَیں نے اِتنا مہنگا مسمّی کے جوس کا گلاس بھی پیا پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ پھر بھی میں نے بھی بڑی ہمّت کر کے

پورے ٹیکے لگوائے ہیں کیونکہ میرے سامنے تو میرے ابّے کی 'سٹوری' ہے۔ میرا باپ دفتر میں نوکری کرتا تھا۔ اس کو 'لٹیر' ہونے کے بعد ٹی۔ بی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر کے کہنے پر اس نے ایکسرا بھی کروالیا تھا۔ پھر اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ تانگے سے اُتر کر ڈاکٹر کی دُکان میں جانے لگا تو تانگے والے نے پوچھا کہ یہاں کیوں آئے ہو؟ ابّے نے بتایا کہ مجھے ٹی۔ بی ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر نے ایکسرا کرانے کو کہا تھا۔ وہ لے کر آیا ہوں۔ تو تانگے والا کہنے لگا ذرا مجھے بھی ایکسرا دِکھاؤ۔ ابّے نے اسے دیا تو اس نے سورج کی طرف کر کے اسے اچھی طرح دیکھا اور کہنے لگا۔

''کیہڑا بھین۔۔۔ ڈاکٹر کہتا ہے تجھے ٹی۔ بی ہے، جا اپنے گھر جا۔۔۔ پیسہ برباد نہ کر۔''

''ابا جنّتی وہیں سے واپس آ گیا لیکن قبر میں جانے تک لوگڑ (پرانی روئی) کی 'اگ' کی طرح 'دھکدا' (سلگتا) ہی رہا۔''

ایک چوڑے چکلے اور مطمئن چہرے والی عورت کہنے لگی ''ساری طرح کے لوگ ہیں جی۔۔۔ میرا خاوند تو 'جیبن جوگا' میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ میرے علاج کا، میرے کھانے پینے کا۔۔۔ آرام کا، کہتا ہے تیرے ساتھ ہی یہ گھر ہے اور تیرے ساتھ ہی بچّے ہیں۔ میں تو کما کر لا سکتا ہوں۔ باقی تیرا کام ہے جو اُن کو سنبھال لیتی ہے۔ رِشتے داروں کے آنا جانا، لینا دینا، رِیت رواج، عید شبرات سب تجھے ہی پتا ہے۔۔۔ مرد کو کیا پتا ان باتوں کا۔''

اس خاتون کے لہجے میں سکون اور شکر گزاری تھی۔

''ایک دِن میری طبیعت زیادہ خراب تھی۔ اس دِن تو بڑا ہی پریشان ہوا، کہنے لگا:

''مسرّت تجھے کچھ نہ ہو۔ میں گھر میں داخل ہوتا ہوں، تو کہتا ہوں۔

''فلک شیر کی ماں، کدھر ہے تو؟ بڑی موج داری ہے، بڑا آرام ہے، اللہ تجھے

زندگی دے، ورنہ تو اور دو سال کو فلک شیر کو بیاہ دیا تو اس نے کہا کرنا ہے ''ابا ذرا کھنگ (کھانس) کر آیا کر، تیری بہو کام شام کرتی پھر رہی ہوتی ہے۔''

وہ کہتا ہے ''میں تو اَن پڑھ ہوں، مجھے زیادہ باتوں کا پتا نہیں پر اِتنا میں جانتا ہوں کہ مجھے اپنی بیوی کی زندگی چاہیے۔ میرا گھر آباد رہے، میرے بچّوں کے سر پر ماں کا سایہ سلامت رہے۔ میں تیرا ہوں اور تو میری۔ یہ گھر ہمارا گھر ہے۔ یہ بچّے، ہمارے بچّے ہیں یہ ساتھ کسی اور کے ساتھ ہو سکتا ہے بھلا؟''

میں نے کہا ''بڑی مہربانی ہے تیری، جو اس بیماری میں میرا ساتھ دے رہا ہے، تو کہنے لگا۔

''میں کوئی تیرے پر احسان کر رہا ہوں، اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو، تو مجھے چھوڑ دیتی؟''

''بڑی نصیبوں والی ہے تو بہن۔'' ایک خاتون نے جو مارے نقاہت کے فرش پر ٹانگیں سمیٹ کر لیٹی ہوئی تھی، ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''ہاں بہن خدا کا بڑا شکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو مجھے کہتے ہیں کہ تمہارے میاں کی محبت تمہیں ضرور صحت مند کر دے گی۔ اس کے دِیے ہوئے حوصلے سے، تجھے بیماری سے لڑنے کا حوصلہ ملے گا اور یہ ہے بھی ٹھیک۔۔۔ میری آدھی بیماری تو اس کی باتوں سے ہی دُور ہو جاتی ہے۔''

''شکر کر بہن، ورنہ تو دوہرا دُکھ ہے۔ میرا خصم تو صاف کہتا ہے اپنے 'بھرا' کو کہہ دے تجھے لے جائے، مجھ سے تیرا 'بھارا' نہیں 'چکیا' جاتا (ذمہ داری نہیں اُٹھائی جاتی۔) پھر کہتا ہے تو تو جانتی ہے، تیری بھرجائی کی عادت بہت 'کوڑی' (تیز مزاج ہے) ہے۔ تجھے کچھ کہے گی تو دُکھ تو مجھے ہی ہو گا، نا! بس جی چلتی آپاں گڈی کے تو سارے ہی 'جھالو' (برداشت کرنا) ہیں۔ 'ٹیشن' (سٹیشن)، پر کھڑی کس کام کی؟''

''لے۔۔۔ میرے والے نے تو منجی ہی ویڑھے میں سب کے پاس ڈالنی شروع

کر دی ہے۔''

''کیوں؟''

''کیوں کیا؟ اب میں اس کے کام کی جو نہیں رہی، جب ٹھیک تھی تو اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔۔۔ لسوڑھے دی گٹک (لیس دار، چپکنے والی) اب تو وہ بات ہے نا۔

؎ کچّی یاری لڈّواں دی

لڈّو مُک گئے۔۔۔ یارانے ٹُٹ گئے۔''

اب ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اور بچّہ پیدا نہیں کرنا تو میری ساس، سارا وقت ٹھنڈی 'ہائیں' بھرتی رہتی ہے، کہتی ہے، میرے پتّر کی تو نسل ہی نہ ودھی (بڑھی)، میں نے بھی سڑ کر کہہ دیا کہ دو پتّروں اور چار دھیئوں سے نہیں ودھی، تو پھر ودھے گی بھی نہیں۔ کہنے لگی تو اَج 'کنڈھے' (کنارے) لگ گئیے، میں اور لے آؤں گی۔ میں نے اپنے بندے کو بڑے گلے سے بتایا تو ہنسنے لگ گیا، کہنے لگا۔ میری ماں ہے میرے وَل (طرف) دی ہی گل کرے گی نا!''

''میں نے کہا، تیرے چھ بچّے ہو گئے ہیں، ابھی بھی تجھے دوسرے ویاہ کا 'چا' (ارمان) ہے، یہ کب ختم ہو گا؟''

کہنے لگا ''میں مر بھی گیا تو اپنے قلوں تک تو رہے گا۔ بعد کا پتا نہیں۔''

شیما ان کی باتوں میں اتنی مگن تھی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا، جو میں اِدھر آ گئی ورنہ اکیلے بیٹھنے سے تو پریشانی اسے گھیرے رکھتی۔

فرش پر لیٹی ہوئی عورت سے ضبط نہ ہوا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''سچی بھئی۔۔۔ دوسری شادی کے نام پر تو سب کے دانت نکلنے لگتے ہیں۔ ایک

دِن میری طبیعت زیادہ خراب تھی، مجھے رونا آ گیا۔ میں نے اپنے بندے سے کہا۔

''میرے مرنے کے بعد بچّوں کا خیال رکھنا۔''

کہنے لگا ''تو فکر ہی نہ کر، ان کی نویں ماں لاؤں گا۔ وہ رکھے گی خیال۔'' میں ساری رات تڑپتی رہوں تو کبھی پوچھا نہیں اور ایک رات کو جب خود کو تیز بخار چڑھا تو کئی کچھ بھونکنے لگا۔

''اگر کوئی 'گلتی' پھلتی ہو گئی ہو تو ماف کرنا۔''

میں نے کہا ''اگر؟ تو بتا کس کس گلتی کو ماف کروں۔''

کہنے لگا ''یہ تو میرا ربّ جانتا ہے۔ مَیں نے کوئی غلطی نہیں کی۔''

میں نے کہا ''تیرا ربّ جانتا ہے تو میرا ربّ کیوں نہیں جانتا؟ تیرا اور میرا ربّ جدا جدا ہیں تو پھر کس ربّ کو مانوں؟'' بات کرنے سے عورت کا سانس پھولنے لگا تو وہ دوبارہ لیٹ گئی۔

شیما نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کوریڈور میں آ کر وارڈ بوئے سے، ڈاکٹر صاحب کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ میٹنگ ابھی جاری ہے۔ اب اسے بہت اُکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی لیکن واپس انتظار گاہ میں، بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ایک عورت ابھی ابھی آئی تھی۔ اس نے شیما کی طرف ایسے دیکھا، جیسے قربانی کے بکرے کی طرف دیکھ رہی ہو۔ مطمئن چہرے والی خاتون نے شیما سے، اس کا تعارف کروایا تو وہ کہنے لگی۔

''بس جی ہمت سے لگی رہنا۔ بیچ میں نہ چھوڑ دینا۔ زندگی سے تو بڑی کوئی چیز نہیں۔ پر جی جسے ربّ عقل دے۔ ہمارے پنڈ کا چوہدری ہے، عاشق علی نام ہے اس کا۔ اس نے چوہدرانی کا علاج ہی نہیں کروایا۔۔۔ اسے کونسی پیسے کی کمی ہے اور جب چوہدرانی کی اخیر آ گئی تو کہنے لگا۔

''مانتے! مجھے ماف کر دے۔''

پر جی مانتے نے تو جھنڈے گڈ دیئے۔ کہنے لگی۔

''نا چوہدری اب اگلے جہاں گلاں ہون گئیاں۔ زیادہ سیانا نہ بن۔ اچھی چال کھیل رہا ہے تو میرے ساتھ۔ سِدھ بھی اپنی اور پُٹھ بھی۔''

اور پھر جب چوہدرانی مرگئی تو دیسی گھی میں دیگیں پکوا کر ختم درود دلواتا رہا ہے۔ کیا فائدہ؟ دُنیا کو چنگا بن کر دِکھا رہا ہے۔ انھی پیسوں سے اس کا علاج کروا دیتا تو اس کے بچّے تو نہ ترستے ماں کے لیے۔ پر جی یہ عقل کون دے ایسے لوگوں کو۔ کتنی سوہنی تھی چوہدرانی، لم سلمّی، سلفے دی لاٹ ورگی۔''

''بیگم جی۔۔۔ اس کی بھی سن لیں۔ یہ بڑی حرامزادی ہے، لچّی۔'' (بدمعاش عورت) ایک عورت نے دوسری کی کمر میں ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟'' حرامزادی لچّی نے آنکھیں مٹکائیں۔

''نہ۔۔۔ نہ تو نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔ پھِٹ گھنّا (لعنت ہو)، ڈب کے مرجا۔۔۔ میں بتاتی ہوں، بیگم جی پچھلی بار جب یہ چیک کروانے آئی تو ڈاکٹر نے کہا اس پھٹے پر لیٹ جاؤ۔ میں نے تمھیں چیک کرنا ہے، اس نے لیٹ کر چادر اپنے اُوپر لے لی اور منہ پر دوپٹہ ڈال لیا۔ جب ڈاکٹر نے اس کی قمیص اُٹھا کر اس کی دوسری چھاتی ٹٹولی تو اس نے منہ سے دوپٹہ اُٹھا کر اسے اَکھ ماری۔ وہ بے چارہ نیا ڈاکٹر تھا مُنڈا سا، گھبرا گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔''

''واقعی؟'' شیما اس کی بے باکی پر حیران رہ گئی۔

''کیا کرتی پھر؟ سوچ سوچ کر ویسے ہی دماغ پھٹ رہا تھا۔ میں نے تو دھیان ہٹانے کو یونہی دِل پشوری کی تھی۔ بعد میں مجھے بہت ڈر لگا کہ اگر ڈاکٹر نے میرے بندے کو بتا دیا، تو اس نے تو مجھے گھر جاتے ہی حلال کر دینا ہے۔ وہ تو پہلے ہی اس بات پر تیار رہتا ہے

کہ مرد ڈاکٹر چیک کرتے ہیں۔

میں نے اس سے کہا کہ ''اس میں غصہ کرنے والی کیا بات ہے۔ ان کا تو کام ہے۔''

کہنے لگا ''اگر میں ایسے کروں تو؟''

میں نے کہا ''تو ڈاکٹر بن جا، اس کی بیوی کو کینسر ہو گیا تو تو بھی ایسے کر لینا، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسی۔

اتنی دیر میں ایک اور خاتون کمرے میں داخل ہوئیں، پڑھی لکھی اور موڈرن انھوں نے بھی آتے ہی، وہی سوالات دُہرائے، پھر اپنے بارے میں بتانے لگیں کہ بینک میں کام کرتی ہیں۔ انھیں بھی چھاتی کا کینسر ہے۔

''خواتین میں چھاتی کا کینسر بہت عام ہے۔ ویسے بھی وہ کہتے ہیں نا کہ اگر کینسز 'کروانا' ہی ہو تو چھاتی کا 'کروائیں' کیونکہ اسے الگ کر دینے سے باقی جسم کی کارکردگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن میں تو کہتی ہوں۔

؎ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے

جب پیٹ سے چھوٹا سینہ ہے''

وہ بات ختم کر کے خود ہی کھلکھلائیں۔ لگتا تھا باتیں کرنے کی بہت شوقین ہیں۔

''اور ٹیکہ لگنے کے بعد تین روز تک اتنی قے آتی تھی کہ میں کہتی تھی 'نہلانے' سے تو مری نہیں 'نچوڑنے' سے مروں گی۔ کینسر سے تو ہو سکتا ہے بچ جاؤں لیکن جسم میں پانی کی کمی سے ضرور مر جاؤں گی۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہے نا بلّی والا۔'' وہ پھر سے کھلکھلائیں۔

''جی، سنا ہے۔'' شیما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور رنگ کتنا خراب ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے مٹی کا تیل ڈال کر تیلی دِکھا دی گئی ہے اور پھر یہ 'گنجِ گراں مایہ' وہ سر پر ہاتھ پھیر کر کھلکھلائیں۔

''آپ کو بھی ڈاکٹر نے Walk کرنے کو کہا ہے؟ مجھے تو بہت اصرار سے کہا

ہے۔ پر کیا کروں میرا تو بالکل دل نہیں چاہتا اور اگر چاہے بھی تو ٹانگوں میں جان کہاں ہے؟''

انھوں نے سوالیہ نظروں سے شیما کی طرف دیکھا۔

''آپ کو بھی ڈاکٹرز نے بتایا ہو گا کہ چہل قدمی ضرور کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ تو موٹاپے، جوڑوں کے درد، دانت کے درد۔۔۔ گرمی دانوں۔۔۔ غرض ہر دُکھ درد میں اسے ہی recommend کرتے ہیں۔ اس لیے نظریاتی طور پر تو میں اس کی قائل ہو چکی ہوں لیکن عملی طور پر ابھی کچھ نہیں کر پائی۔ میں نے ہر پینترا بدل کر دیکھ لیا ہے۔''

پھر وہ دِل کھول کر ہنسیں اور کہنے لگیں۔ ''لیکن نہیں۔۔۔ ایک پینترا ابھی میں نے نہیں آزمایا میں اپنے میاں سے کہوں گی کہ ہمسایوں کو کہیں کہ وہ اپنا کتّا میرے پیچھے چھوڑ دیں، پھر ساری کالونی میں بھاگی پھروں گی۔۔۔ ہے نا۔''

شیما نے بے اختیار اثبات میں سر ہلایا۔

''میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا تھا کہ میں کیا کروں میرا دِل ہی نہیں مانتا walk کرنے کو۔ تو وہ کہنے لگے دِل کی مت سنیں دماغ سے سوچیں۔ میں نے کہا کیسے نہ سنوں؟۔۔۔ میرا دماغ تو سب کچھ جانتا ہے لیکن میرا دِل صرف مجھے جانتا ہے اور پھر ڈاکٹرز کا کیا ہے ان کے خیال میں تو ممکن ہو تو 'آخری سفر' بھی پاؤں پاؤں چل کر ہی کیا جانا چاہیے۔''

شیما نے سوچا شاید یہ بھی نگار کی طرح فل سٹاپ اور کومے کا اِستعمال نہیں جانتیں۔

اِتنی دیر میں وارڈ بوائے نے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں تو شیما نے سب کو صحت یابی کی دُعا دے کر خدا حافظ کہا اور ڈاکٹر صاحب کے کمرے کی طرف چل دی۔

OO

شیما آج کل خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کرتی تھی۔ جانے والوں کا دُکھ، میکے کے مسائل، اپنی شدید بیماری اور نظیف کے رویّے نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

اس کا علاج تقریباً مکمل ہو گیا تھا، لیکن اس کے اثرات سے وہ بری طرح متاثر

ہوئی تھی۔ اس کے سر کے بال مکمل طور پر اُتر گئے تھے، بھنوئیں اور پلکیں بھی ہلکی ہو گئی تھیں۔ سٹیرائیڈ لینے کی وجہ سے پھولے ہوئے زرد چہرے اور موٹاپا آ جانے سے وہ بے ڈھب سی ہو گئی تھی اور سب سے بڑھ کر، اپنی بیماری کو لے کر، بچّوں کی فکر اسے مارے ڈالتی تھی، اگر اسے کچھ ہو گیا تو ان کا کیا بنے گا؟ ایسے میں نظیف کی بے رُخی دِن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ امّی جان کا رویّہ ایسا تھا جیسے اسے کوئی چھوت کی بیماری لگ گئی ہو اور وہ اس سے بچنا چاہتی ہوں۔

سارے دِن کی تھکاوٹ کے بعد، رات کو جب بچّے سو جاتے تو شیما کا دِل چاہتا کہ وہ نظیف سے جی بھر کر باتیں کرے، اچھی یادوں کو دُہرائے، اپنے دُکھوں کا ذِکر ایسے کرے کہ دِل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور حوصلہ بلند۔ وہ باتیں کرے، جو ابّا میاں اور سرمد کے ساتھ، سانجھ کی رہی ہیں۔ وہ مانتی تھی کہ نظیف کو ان سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ ویسے بھی ان کی وفات سے پہلے، نظیف کے تعلقات ان سے اچھے نہیں تھے اور پھر یہ کہ وہ شیما کے دِل کے قریب تھے نظیف کے نہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ یہ سب کس سے کہے؟ اس کے دُکھ کون سنے گا اور سمجھے گا؟ میاں بیوی کی سانجھ تو دُکھ میں بھی ہونی چاہیے۔۔۔ صرف اور صرف سکھ کا ساتھ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

یہ سب شیما سوچتی تھی، نظیف کا ان باتوں سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ شیما، اگر کبھی ابّا میاں اور سرمد کا ذِکر کرتی تو نظیف اس لاتعلقی سے 'ہوں' کہتا کہ پھر اس کا حوصلہ نہ ہوتا کہ اور کہہ سکتی۔

امّاں اور آئمہ کی بات ہوتی تو نظیف اس بات کو سمجھنے ہی کو تیار نہیں تھا کہ ان کے بھی کوئی مسائل ہیں۔

''وہ اپنے گھر میں رہ رہی ہیں۔ زمینوں سے لگی بندھی رقم جیسے پروفیسر صاحب کی زندگی میں آتی تھی، اب بھی آ رہی ہے۔ ان کی پنشن بھی مِل رہی ہے۔ سرمد کی انشورنس

کی بھی کافی بڑی رقم امّاں کو ملی ہے۔ کیا ان کی ضروریات پوری نہیں ہو رہیں؟''

شیما، چاہنے کے باوجود کہہ نہ پاتی کہ یقیناً وہ مالی مشکلات کا شکار نہیں ہیں لیکن اَتنے بڑے دُکھ کے ساتھ، زندگی کے دیگر مسائل سے کیسے نبرد آزما ہو رہی ہیں، وہ وہی، جانتی ہیں۔ چاچا فیروز اور اللہ رکھی باجی کا دم غنیمت تھا ورنہ دو عورتوں کا تنہا رہنا، اتنا آسان تو نہ تھا۔

لیکن ایک دِن، جب اچانک نظیف نے شیما سے پوچھا ''تمہاری امّاں سے بات ہوتی رہتی ہے؟''

تو اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ روزانہ ہی بات کرتی ہوں۔''

''خیریت ہے سب؟ اور باقی معاملات کیسے چل رہے ہیں؟''

نظیف کے لہجے میں اگرچہ امّی جان والی ہی کرختگی تھی، پھر بھی شیما نے خوشگوار حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''امّاں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ صدمے نے ان کو ذہنی اور جسمانی طور پر بے بس کر دیا ہے۔ آئمہ بمشکل انھیں سنبھال پاتی ہے۔ ڈاکٹر یعقوب صاحب کا دم غنیمت ہے اور باقی رہا روزمرّہ کا مسئلہ۔۔۔ چاچا فیروز اور اللہ رکھی باجی کی وجہ سے ٹھیک چل رہا ہے۔''

ذرا سی ہمدردی پا کر، شیما نے اپنا دُکھ بیان کرنے میں جلدی کی۔

''تو پھر تم جائیداد میں اپنے حصّے کی بات کرو۔''

''کیا؟؟؟؟''

''اس میں اِتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟ تمہارا حق ہے۔۔۔ شرعی بھی اور قانونی بھی۔ میں خیرات مانگنے کو تو نہیں کہہ رہا۔'' نظیف نے بے دردی سے کہا۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن۔۔۔'' شیما نے کمزور لہجے میں کہا۔

”کیا لیکن؟ میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ بیگم رحمان، جائیداد پر سانپ بن کر کیوں بیٹھی ہوئی ہیں؟ انھیں احساس ہی نہیں کہ تمہارا کتنا مہنگا علاج ہو رہا ہے۔“ نظیف کے لہجے میں تیز کٹار تھی۔

شدتِ رنج سے شیما کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ (جائیداد کا بٹوارہ۔۔۔ وہ بھی کس سے؟ چھوٹی بہن اور بیوہ، بوڑھی اور بیمار ماں سے۔۔۔ ابھی تو ابّا میاں اور سرمد کی قبروں کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی۔ اِتنی جلدی کس بات کی ہے؟۔۔۔ جائیداد کہاں بھاگی جا رہی ہے؟ باقی رہا میرے علاج پر اُٹھنے والے اخراجات کا مسئلہ۔۔۔ اس کا بوجھ تو گورنمنٹ اُٹھا رہی ہے۔ تمہاری بیوی ہونے کے ناتے۔۔۔ ورنہ شاید وہ بھی نہ ہو پاتا اور پھر بھی تم مہنگے علاج کے نام پر مجھے جائیداد کا حصّہ لینے کا کہہ رہے ہو اور میں؟۔۔۔ میں؟ ان سے کہوں کہ مجھے جائیداد میں حصّہ چاہیے۔۔۔ اتنا چھوٹا پن! نظیف، مجھے تم سے اس کی توقع نہیں تھی۔ (لیکن اب تک جو رویّہ تم نے اختیار کیے رکھا ہے، مجھے اس کی بھی تو توقع نہیں تھی۔۔۔ پھر حیرانی کیوں؟) پتا نہیں، تمہارے ترکش میں اور کتنے تیر باقی ہیں؟ کیوں نہیں تم مجھے ایک ہی بار میں ختم کر دیتے؟ رقصِ بسمل دیکھنے کا اِس قدر شوق کیوں ہے تمہیں؟)

شیما اپنی سوچوں کے گرداب سے باہر نکلی تو نظیف کے الفاظ اس کے ذہن پر ابھی تک ہتھوڑے برسا رہے تھے۔۔۔ لیکن وہ کب کا جا چکا تھا۔

OO

ابّا میاں اور سرمد نہیں رہے۔ امّاں کی تنہائی اور دُکھ، کا سوچ کر دماغ پھٹتا ہے۔ آئمہ کی ذمہ داریاں، جو امّاں کی بیماری کی وجہ سے اور بڑھ گئی ہیں۔ امّاں کے سامنے وہ اپنا دُکھ، دِل میں چھپائے رکھتی ہے۔ بیماری نے مجھے اَدھ مؤا کر دیا ہے اور مرے کی لاش پر سو درّے، نظیف اور امّی جان کا رویّہ۔۔۔ اور نغمانہ باجی۔

برے برے خیالات، خوف، وہم، بدگمانیاں، میرا دِل ان کی آماجگاہ ہے۔

ڈار سے وِچھڑی کونج وانگ کرلاوندی رُوح۔۔۔ کالے درختوں کے جھنڈ میں بھٹکتی رُوح۔۔۔ اندھیری گپھاؤں میں سرسراتی رُوح، صلیب پر لٹکتا لاشہ۔

اب کیا ہوگا؟۔۔۔ کیا ہونے والا ہے؟ ایسا تو نہیں ہوگا؟۔۔۔ ویسا تو نہیں ہوگا؟

دھک۔۔۔ دھک۔۔۔ دھک لگتا ہے کہ میں سراپا دِل ہوں اور دھڑ کے چلی جا رہی ہوں۔ خوف کی دبیز چادر، گھبراہٹ کی اوڑھنی، اَن دیکھی پریشانی، وسوسے، وہم۔۔۔ زندگی انھی کے گردم گھوم رہی ہے۔ دُور دُور تک کوئی مثبت سوچ، کوئی اُمید کی کرن، اطمینان اور سکون کا شائبہ تک نہیں، دِن میں بیسیوں باران کیفیات کا تجزیہ۔۔۔ اندر ہی اندر اپنی ذات میں کشمکش۔۔۔ کوئی کیا جانے؟

ع میں زخم زخم ہوں لیکن تجھے دِکھائی نہ دوں
نہ جانے یہ سب میں ہی کیوں محسوس کرتی ہوں؟

ے میں جانیا دُکھ مجھ کو، دُکھ سہائے جگ
اُچے چڑھ کے ویکھیا، گھر گھر ایہا اگ

ترجمہ: (میں سمجھتا تھا کہ دُکھ صرف مجھے ہے، لیکن ساری دُنیا ہی دُکھی ہے، جب میں نے دُور دُور تک نظر ڈالی، تو ہر گھر میں یہی آگ سلگ رہی تھی۔)

صحیح!۔۔۔ لیکن زیادہ تر لوگ میری طرح نہیں سوچتے۔ میں زُود حس ہوں یا پاگل؟۔۔۔ میں ایسی کیوں ہوں؟ یا لوگ ایسے کیوں ہیں؟ اپنے ساتھ ایک مستقل بحث، جو اعصاب کی تھکن پر ختم ہوتی ہے نڈھال تن، پژمردہ ذہن۔ اس صورتِ حال میں بچّوں کو پورا وقت نہیں دے پاتی۔ اور چڑ چڑے پن کی وجہ سے انھیں بلاوجہ ڈانٹتی رہتی ہوں، ان کا کیا قصور ہے؟ بعد میں خود کو کوستی رہتی ہوں، پچھتاتی ہوں۔ میرا خیال ہے مجھے سائیکاٹرسٹ کو دِکھانا چاہیے۔ شاید موجودہ صورتِ حال میں میرے لیے کوئی بہتری پیدا ہو جائے۔ شیما نے سوچا۔

اگلے روز شیما نے نگار سے ذِکر کیا تو اُس نے، اِس کی بھرپور تائید کی۔ شیما نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی اور اسی روز شام کو مقرّرہ وقت پر چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت تفصیل سے اس کا مسئلہ سنا اور ادویات کے استعمال کے بارے میں ہدایات کے علاوہ اسے مشورہ دیا کہ وہ کس طرح ان حالات میں جیتے ہوئے خود کو صحیح وسالم رکھ سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی باتوں نے اسے بہت حوصلہ دیا اور اسے لگا کہ وہ اپنی پریشانی پر قابو پانا سیکھ لے گی لیکن اگلے دِن، اس کی پھر وہی کیفیت تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ نیند سے بے حال ہوگئی۔ ادویات سے اِتنی غنودگی ہوئی کہ رات کو وہ بے خبر سوتی رہی۔ بچے نصیباں کے پاس سوتے تھے اس لیے ان کی جانب سے وہ بے فکر تھی۔ صبح اس کا سر اتنا بھاری ہو رہا تھا کہ اُٹھانا مشکل تھا۔ اس نے تیز کافی کا کپ پیا اور بمشکل کالج جانے کے لیے خود کو تیار کر سکی۔ کلاس میں بھی اس کا دِل چاہا کہ روسٹرم پر سر رکھ کر سو جائے۔ کلاس روم گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اُبکائی آ رہی تھی۔ کلاسز ختم ہوتے ہی وہ گھر آ گئی اور بے سدھ سو گئی۔

نظیف نے رات کو اس سے پوچھا کہ وہ سائیکاٹرسٹ کے پاس کیوں گئی تھی؟

''کیا مسئلہ ہے تمہارا؟ کس بات کی پریشانی ہے؟ اس طرح تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟ بہت مظلوم ہو؟ تمہارا کوئی خیال نہیں رکھتا؟'' نظیف ایک سان بولتا چلا گیا۔

''نہیں نظیف ایسی بات نہیں ہے۔ میں آج کل بہت depressed محسوس کر رہی تھی، اس لیے ڈاکٹر صاحب کو consult کرنا چاہتی تھی۔''

''اخاہ depressed؟ تمہیں کس بات کا depression ہے؟ گھر میں ہر طرح کی سہولت ہے۔ گاڑی پر آتی جاتی ہو۔۔۔ اور کیا چاہیے تمہیں؟'' (کیا یہ سب انسان کو خوش رکھنے کے لیے کافی ہے؟ کیا یہ شخص کبھی مجھے سمجھ پائے گا؟ میرے درد کو محسوس کر سکے گا؟)

اگلی صبح وہ کالج جانے سے پہلے، امّی جان کو خدا حافظ کہنے کے لیے گئی تو وہ فون پر

نغمانہ سے بات کر رہی تھیں۔

''رات، نظیف بتا رہا تھا کہ پاگلوں کے ڈاکٹر کو دِکھا کر آئی ہے، مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ نظیف بے چارے کی تو قسمت پھوٹ گئی۔ اس نے 'ہمدردی' میں ایک 'عام' سے گھرانے میں شادی کر لی، پر یہ 'نیکی' تو اس کے گلے ہی پڑ گئی ہے۔''

جب وہ کالج پہنچی، تو اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ نگار نے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

ے ''آغازِ جوانی ہے، ذرا جھوم کے چلتے ہیں
کچھ لوگ سمجھتے ہیں، ہم پی کے نکلتے ہیں''

''جی۔۔۔ جی۔ بالکل
ع کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری''

شیما بمشکل مسکرائی۔

کلاس کے بعد وہ سٹاف روم میں آئی اور دھڑام سے کرسی پر گر گئی اور ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

نگار چپکے سے اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی اور ترنّم سے شعر پڑھا:

ے ''ہم بند کیے آنکھ تصوّر میں پڑے ہوں
ایسے میں کوئی، چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو؟''

شیما نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور مسکرائی۔

''یار، 'چھم' سے تو کوئی کیا آئے گا، 'دھم' سے آتے ہیں بُرے بُرے خیالات، خوف، وہم، بدگمانیاں۔۔۔ اب کیا ہوگا؟ کیا ہونے والا ہے؟ ایسا تو نہیں ہوگا، ویسا تو نہیں ہوگا۔''

OO

شیما، صبح کالج جانے کے لیے نکلی اور گاڑی گیٹ پر دم بھر کو رُکی تو مالی نے ہاتھ

کے اشارے سے سلام کیا۔ شیما کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس نے کار کا شیشہ
اُتارا، سلام کا جواب دیا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بیگم صاب۔۔۔آپ سے کچھ عرض کرنا تھی۔''

''جی بھائی، کہیے۔''

''وہ جی آج کل میری سالی، میرے پاس رہنے کے لیے آئی ہوئی ہے میری ساس نے بھیجا ہے کہ شہر میں رہ کر کچھ طریقہ، سلیقہ سیکھ لے گی۔ اس کی منگنی، اس کے پھوپھی کے لڑکے سے ہوئی ہے۔ وہ فوج میں سپاہی ہے۔ اب میری بیوی کے پاس تو بچّوں ہی سے وقت نہیں بچتا کہ اسے کچھ سکھائے اور ویسے بھی وہ کیا سکھا سکتی ہے؟ آپ مہربانی کریں تو اسے گھر میں رکھ لیں۔ خانساماں کے ساتھ کام کرے گی تو کھانا وانا بنانا سیکھ لے گی۔ بچّوں کو سنبھالنے میں نصیباں بہن کی مدد کر دے گی۔ مرجانی، الھڑ سی ہے، میرے بچّوں کے ساتھ کدکڑے لگاتی رہتی ہے۔'' مالی نے جواب طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے بھائی۔۔۔امّی جان یہاں پر نہیں ہیں۔ میں، صاحب سے بات کرنے کے بعد ہی آپ کو بتا سکتی ہوں۔''

کالج سے دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

دوپہر کے کھانے پر نظیف موجود نہیں تھا۔ وہ کھانے کے بعد آرام کرنے کے لیے لیٹی تو نصیباں اس کے پاؤں آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ شیما آج کل خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کرتی تھی۔ حالات کی اُٹھا پٹخ سے اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔

ملازمت شیما کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ کالج میں مصروفیت کی وجہ سے وہ کچھ وقت، اچھا گزار لیتی۔ اسی لیے، اس نے زیادہ چھٹی نہیں لی تھی یوں بھی اس پر بار بہت کم تھا۔ صرف دو کلاسز پڑھانا ہوتی تھیں۔ اس کی کولیگز اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ نگار، سارا

وقت، اسے خوش کرنے کے خیال سے خرمستیاں کرتی رہتی۔ پرنسپل صاحبہ، اسے بیگم D.C ہونے کے حوالے سے نہیں بلکہ اس کی اپنی ذات کی وجہ سے بہت مہربان تھیں۔ وہ سب کو بتاتیں کہ شیما نے کبھی ڈیوٹی دینے میں کوتاہی نہیں کی تھی لیکن اب اس کی بیماری اور پریشانیوں کی وجہ سے اسے کوئی فالتو ذمہ داریاں نہیں سونپی جاتیں۔

گھر پر وہ ذہنی دباؤ کا شکار رہتی۔ امّی جان کا اللہ واسطے کا بیر۔۔۔ان کی قہر برساتی نظریں، نظیف کا رُوکھا پن۔۔۔بچے بھی پوری توجہ نہ ملنے سے ضدّی ہو گئے تھے اور سب سے بڑھ کر اس کی طبیعت میں depression کا آ جانا۔

نظیف سے بات کرنے کے بعد شیما نے مالی کو بتا دیا اور اگلے ہی روز وہ اپنی سالی، فرزانہ پروین کو لے آیا۔ پندرہ سولہ سال کی لڑکی۔۔۔میلی کچیلی۔۔۔فربہی مائل جسم۔۔۔چہرے کے آدھے رقبے پر پھیلی ہوئی ناک۔۔۔باریک ہونٹ اور پھیلا ہوا دہانہ، جو چہرے کی بے چارگی میں بے طرح اضافہ کر رہا تھا۔ بجھی بجھی، چندھی سی آنکھیں اور میلی رنگت، پاؤں میں رُلتے پائینچے۔ بس انسان کا بچّہ تھی شیما کو اسے دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ اس کی نظروں میں اللہ رکھی گھوم گئی۔ سیدھی مانگ۔۔۔سانولی رنگت لیکن اُجلا سراپا۔ فرزانہ سر کھجا رہی تھی۔ شیما نے اسی وقت ڈرائیور کو بھیج کر دوا منگوائی اور مالی کی بیوی کو کہا کہ اس کے سر میں ڈال دے۔ اتنی دیر میں اپنا ایک جوڑا نکال کر اسے دیا اور پھر نصیباں نے اسے غسل خانے کی راہ دِکھائی۔

جھانوے سے ہاتھ پاؤں رگڑنے، منہ مَل کر دھونے، بال بنانے اور پاؤں میں جوتا پہننے کے بعد وہ کافی حد تک قابلِ برداشت ہو گئی تھی۔

اگلا ہفتہ، نصیباں کو اس پر کافی محنت کرنا پڑی۔ شیما کی تو نہ ذہنی حالت ایسی تھی اور نہ ہمّت کہ اس پر کچھ وقت صرف کرتی لیکن فرزانہ، اس کی توقع سے زیادہ ہوشیار نکلی۔ بچّوں سے بات کرنے میں اس کا لب و لہجہ کافی بہتر ہو گیا تھا۔ شیما کے پرانے کپڑے

اس کے جسم پر پھنس کر آتے تھے۔ کَسی ہوئی، ہَوا میں لہراتی چُٹیا، اب بالوں کو ڈھیلا سا باندھنے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانوں پر آ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں کے ناخن ڈھنگ سے کاٹ کر، جھانوے کے اِستعمال کا فائدہ نظر آنے لگا تھا۔ چہرے کی جلد کا رُوکھاپن، دُور ہونے سے چہرہ روشن لگنے لگا تھا۔ اگرچہ، خانساماں کو اس سے سخت شکایت تھی کہ کچّے دُودھ کا نیا استعمال، اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ چہرہ بھر جانے سے ناک کی چوڑائی بھی کم لگنے لگی تھی۔ ہمہ وقت مسکراہٹ سے دہانے کی چوڑائی چھپ گئی تھی اور بے چارگی کا تاثر غائب ہو گیا تھا۔

شیما خوش تھی کہ بچّی بہت جلد تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ موقع ملے تو سارے بچّے اچھے ہو سکتے ہیں، حالات بے بس کر دیتے ہیں ورنہ دِل تو سبھی کا چاہتا ہے۔ شیما کو اس پر بہت پیار آیا کیسی گل گوتھنی سی لگ رہی ہے، پھر اس نے، اسے تھوڑے پیسے دِیے کہ اپنی مرضی سے کچھ خرید لے۔ جس کے نتیجے میں فرزانہ کی کلائیوں میں سرخ اور سنہری کانچ کی چوڑیاں سجی تھیں اور کانوں میں بالیاں۔۔۔ کتنی خواہشیں ہوتی ہوں گی جو پوری نہیں ہو پاتیں۔۔۔ شیما کا دِل بھر آیا۔

اگلے روز صبح صبح، نصیباں کا موڈ خراب تھا۔ شیما کے پُوچھنے پر وہ پھٹ پڑی۔

''بیگم صاب۔۔۔ فرزانہ کچھ زیادہ ہی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسے منع کریں اور پیسے دینے بند کریں۔ کل یہ بازار سے نہ جانے کیا اَلا بلا خرید کر لائی اور پھر غسل خانے میں گھنٹہ بھر گھسی رہی۔ سارا دِن وہاں سے بدبو آتی رہی ہے۔ میرا تو وضو کرنا مشکل ہو گیا۔ اس کے تو طور طریقے ہی بدل گئے ہیں۔ دوپٹہ سر سے پھسل کر کندھوں پر تو آیا ہی تھا اب اس سے بھی بات بڑھ گئی ہے۔ پائنچے 'گٹّوں' سے اُوپر آ رہے ہیں اور قمیص کے نیچے کا پہناوا، اس کا بس چلے تو، اُوپر سے پہن لے اور پھر ایسے تن کر چلتی ہے کہ میرا تو دِل جل کر کباب ہو جاتا ہے۔ اب تو آنکھوں سے باتیں کرنے لگی ہے۔ خانساماں شریف آدمی ہے، ورنہ یہ تو اس

طرح سے اس سے بات کرتی ہے کہ میں شرم کھا جاتی ہوں۔''

''نہیں نہیں نصیباں ایسی بات نہیں ہے۔ نہ اسے اچھا کھانے کو ملا اور نہ پہننے اوڑھنے کو۔ سبھی کے دِل میں اَرمان تو ہوتے ہیں نا! تھوڑے دِن میں ٹھیک ہو جائے گی۔ بہرحال اسے سمجھا دینا کہ خانساماں کے سامنے ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھ کر جایا کرے۔''

رات کے کھانے پر نظیف خوب چہک رہا تھا۔ آج کئی دِن کے بعد اسے اس موڈ میں دیکھ کر شیما نے اطمینان کی سانس بھری۔ بچّے بھی باپ کو اچھے موڈ میں دیکھ کر خوشی خوشی کھانا کھا رہے تھے۔

فرزانہ کچن سے ساتھ ساتھ گرم روٹی لا رہی تھی۔ گہرے میرون سوٹ میں اس کی گیہواں رنگت دمک رہی تھی۔ چہرے کا میلا پن اور رُکھائی نہ جانے کہاں اُڑنچھو ہو گئی تھی۔ شلوار اُڑس رکھی تھی اور پائنچے ٹخنوں سے ایک بالشت اُوپر تھے۔ چکنی پنڈلیوں پر ایک رواں بھی نہیں تھا۔ شیما کو نصیباں کی بات یاد آ گئی۔ فرزانہ نے واقعی ان پر کافی محنت کی تھی۔ شیما حیران تھی کہ کیا یہ وہی فرزانہ ہے؟

''شیما تمہاری نئی بھرتی تو اچھی ہے۔ بچّے اس سے بہت مانوس ہو گئے ہیں اور بے تکلف بھی، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اتّی جان بھی یہاں نہیں ہیں۔ اچھا ہے بچّوں کو ساتھی مل گیا ہے۔ وہ اکیلا محسوس نہیں کرتے۔'' نظیف نے کہا تو شیما کو اچھا لگا کہ وہ گھریلو مسائل میں دِل چسپی لے رہا ہے۔

''ماما مجھے چاول چاہئیں اور آلو بھی۔''

شیما کے بائیں طرف بیٹھی ہوئی گیتی نے اس سے کہا۔ شیما نے اس کی پلیٹ میں چاول نکالے اور جب سر اُٹھایا تو نظیف پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی میٹھی میٹھی نگاہوں کے دوسرے سرے پر فرزانہ کھڑی اِٹھلا رہی تھی۔ وہ شیما کو اپنی طرف دیکھتا پا کر غڑاپ سے کچن میں چلی گئی۔ شیما کو یہ سب بہت عجیب سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے نظیف بھی فرزانہ سے

'مانوس' ہو گیا ہے اور کافی 'بے تکلف' بھی۔ لیکن پھر اس نے خود ہی اپنی سوچ پر شرمندہ ہوتے ہوئے اسے جھٹک دیا۔

OO

شیما کی عام صحت پہلے سے بہتر تھی۔ علاج بھی مکمل ہو چکا تھا، لیکن اب اسے follow up کے لیے باقاعدگی سے جانا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ پچھلے روز ہی تمام ٹیسٹ کروا کے ڈاکٹر صاحب کو دِکھا کر آئی تھی۔ وہ بہت مطمئن تھے۔ ان کے اطمینان سے شیما کو بھی تقویت ملی تھی۔ اس لیے آج وہ کالج آئی تو کافی تر و تازہ لگ رہی تھی۔ مدحت نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"اوھو۔۔۔ یہ گلابی رنگ تم پر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ لگتا ہے تمہارا ہی رنگ کپڑوں میں جھلک رہا ہے لیکن ذرا۔۔۔ اس طرف سے تھوڑا اُونچا لگ رہا ہے۔ وہ دراصل تمہارا مسئلہ عام طور پر تو محسوس نہیں ہوتا۔۔۔ لیکن کبھی کبھار۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں۔۔۔ اللہ نے تمہیں صحت دی ہے اس لیے ایسی باتوں کو محسوس نہ کیا کرو۔"

مدحت، اکثر و بیشتر شیما کو اس کی 'جسمانی کمی' کے بارے میں کسی نہ کسی طریقے سے 'یاد دہانی' کرواتی رہتی تھی۔ اگرچہ وہ کمی مصنوعی طور پر کسی حد تک حل ہو چکی تھی اور یوں بھی شیما کسی کی بات کا برا نہیں مانتی تھی۔ کیونکہ اس نے پہلے دِن ہی اپنے دِل کو سمجھا لیا تھا کہ زندگی اور صحت کی یہ قیمت زیادہ نہیں ہے۔ جبھی تو وہ ایسی باتوں کو دِل پر نہیں لیتی تھی لیکن نگار کو مدحت کا ایسا تبصرہ بہت کھَلتا تھا۔ وہ بل کھاتی رہتی، آج رہ نہ سکی اور کہنے لگی۔

"مدحت مجھے لگتا ہے غلطی سے تمہارے چہرے پر 'مردانہ' آنکھ فِٹ ہو گئی ہے۔ تمہارا دھیان سینے سے ہٹتا ہی نہیں کبھی کسی اور بات پر بھی غور کر لیا کرو۔"

اتنی دیر میں نئی لیڈی کلرک کبریٰ کسی کام سے سٹاف روم میں آئی اور آتے ہی کہنے لگی۔

"مس شیما یوں تو آپ ہیں ہی بہت پیاری لیکن آج تو کمال کی لگ رہی ہیں۔"

مسز بلقیس بھی مدحت کی بات سے پریشان سی ہو گئیں تھیں۔ انھوں نے بڑے پیار سے کہا۔

"اب تو یہ بیمار پڑنے کے بعد ویسی نہیں رہی، کہیں تم نے اسے پہلے دیکھا ہوتا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں یہ تو اب بھی بہت ہینڈسم ہیں۔"

کبریٰ کی انگریزی کی سطح 'عوام الناس' جیسی ہی تھی۔

(ہینڈسم؟۔۔۔ ہاں ہینڈسم ہی تو ہوں میں، کسی حد تک۔۔۔ شیما نے سوچا۔)

نگار نے مدحت کو تو جواب دے دیا تھا اب کبریٰ کی انگریزی نے اسے پریشان کر دیا۔ اس نے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے کہا۔

"عرض کیا ہے:

؎ اختیارِ ترنّم سے تبسّم کی روشنی کو جلا دینا
اختیارِ ترنّم سے تبسّم کی روشنی کو جلا دینا

واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ

جب اس کا مطلب سمجھ میں آئے، تو مجھے بھی بتا دینا۔"

نگار خاموش ہوئی تو اہلِ محفل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ زریں نے بے حال ہوتے ہوئے کہا۔

"مکرّر مکرّر۔۔۔"

ربیعہ غضب ناک لہجے میں چلّائی۔

"خبردار! جو تم نے اس خرافات کو دوبارہ سے پڑھا ہو تو۔۔۔"

"اس قدر لال پیلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تمہیں شاعری سمجھ میں نہیں آتی، تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ وہ کہتے ہیں نا!

شعر سے شاعری سے ڈرتے ہیں
کم نظر روشنی سے ڈرتے ہیں"

نگار نے حسبِ عادت ڈھٹائی سے کہا۔

"میں شاعری بھی سمجھتی ہوں اور تمہیں بھی۔ کوئی معقول بات کرنا تو جیسے تمہیں منع کر دیا گیا ہے۔"

"میں بہت دُکھی ہوں جس بری طرح سے تم شاعری کا تیا پانچہ کرتی ہو۔" شہلا نے بسورتے ہوئے کہا۔

"بالکل۔۔۔ بالکل، اور اسی وجہ سے شیما کو کینسر ہو گیا ہے۔ ہے نا شیما!" توبیہ نے تاسفانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تم میری شاعری کو پسند نہیں کرتیں تو پھر غالبؔ کا تازہ کلام سنو۔"

"تازہ کلام؟؟؟"

"ہاں میں نے کل ہی ایک ٹرک پر لکھا ہوا پڑھا ہے۔

وہ لوگ بھی قسمت رکھتے ہیں اے غالبؔ
جن کے ہاتھوں کی لکیریں تو کیا ہاتھ ہی نہیں ہوتے

"دیکھو، غالبؔ 'غالباً' وفات پا چکے ہیں، اسے تم ان کا غیر مطبوعہ کلام کہہ سکتی ہو۔"

"اور یہ فضولیات تم غالبؔ سے کیوں منسوب کر رہی ہو۔ ان کی رُوح کو شدید صدمہ پہنچے گا۔"

"لیکن تمہیں کچھ تو سننا پڑے گا، لو اَب کلامِ غالب کا remix سنو۔"

غالبؔ فرماتے ہیں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی 'دوسری' نہیں ہوتی"

لیکن شیما سخت جذباتی ہو رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں یہ سب، تم لوگ مجھے خوش کرنے کے لیے کر رہی ہو۔"

"ارے واہ! تم تو 'معاملے' کی تہہ تک پہنچ گئی ہو۔ واقعی یہ ایسا ہی ہے، جیسے کسی پاکستانی فلم میں، پولیس آفیسر اپنے لمبے لمبے بالوں پر ٹوپی جماتے ہوئے، میز پر چھڑی مار کر کہتا ہے:

"میرا خیال ہے، ہمیں چوروں کو تلاش کر کے فوراً پکڑ لینا چاہیے۔"

تم اپنی 'مشہورِ زمانہ خاموشی' سے اپنے دُکھ ہم پر واضح نہیں ہونے دیتیں اگرچہ تم کچھ بھی نہیں کہتیں، پھر بھی ہم تمہیں سن سکتی ہیں، سمجھ سکتی ہیں۔ میری پیاری شیما۔۔۔ میری جان شیما۔۔۔ یہی تو دوستی ہے اور دوستی میں خاموشی بھی زبان بن جاتی ہے۔" نگار بھی جذباتی ہو رہی تھی۔

OO

ہفتہ کے روز، کالج میں اُردو مباحثہ تھا۔ اس میں حصہ لینے والی بچیوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ اس لیے تقریب کافی دیر سے ختم ہوئی۔ شیما واپس لوٹی تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ اعصابی تھکاوٹ، اسے جسمانی طور پر بھی تھکا دیتی تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ بچوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔ اپنی پریشانیوں اور بیماری کی وجہ سے وہ بچوں پر پوری توجہ نہیں دے پاتی تھی۔ اس بات کا بھی، اس کے ذہن پر بہت بوجھ تھا۔

بچے سو گئے تو اس نے بیڈروم میں آ کر آئمہ اور امّاں سے فون پر بات کی۔ پھر وہ بستر پر لیٹ کر ٹی وی دیکھنے لگی لیکن اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے؟ اسے تو سکرین پر ابا میاں اور سرمد کے مسکراتے چہرے نظر آ رہے تھے اور پھر جب وہ بھی آنسوؤں کی برسات میں دُھندلا گئے تو وہ تکیے میں منہ چھپا کر، پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

نظیف گھر پر نہیں تھا۔ اس نے رات کے کھانے کے نام پر دو لقمے زہر مار کیے اور

دوا کھانے کے بعد سونے کی کوشش کرنے لگی۔

رات کے پچھلے پہر، اسے شدید پیاس محسوس ہوئی تو اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ نظیف بستر پر نہیں تھا۔ وہ پانی پینے کے لیے اُٹھی تو اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ خواب آور ادویات کا اثر تھا۔ فرج کھولا تو ہلکی روشنی میں، اسے ڈرائنگ روم کے قالین کے پاس، نظیف کے سلیپر نظر آئے۔ اس نے جلدی سے لائٹ جلائی تو سنٹر ٹیبل کے دوسری طرف، قالین پر وہی چکنی پنڈلیاں نظر آئیں جن پر کافی محنت کی گئی تھی۔ (تو یہ اس حد تک بڑھ گئی ہے؟)

پھر لائیٹ بند ہوگئی اور شیما اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔

سمندر میں طوفان آ کر گزر چکا تھا۔ شوریدہ سر لہروں سے روشنی کا مینار گر گیا۔ جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ دو روز اسی حالت میں گزر گئے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو دُور دُور تک سناٹا تھا۔ سمندری پرندوں کے چلاّنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شیما نے آنکھ کھولی تو گیتی اس سے چمٹی ہوئی چیخ رہی تھی۔ ویرو کا کچھ پتا نہیں تھا۔ شدید نقاہت نے اسے پھر سے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بمشکل اِس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اُٹھا کر گیتی کے سر پر رکھا۔

''بیگم صاب۔۔۔ اللہ کے واسطے آنکھیں کھولیں۔۔۔ دیکھیں، بچّی، کیسے رو رو کر پریشان ہوئی جارہی ہے۔ میرے اللہ تو ہی مدد کرنے والا ہے۔ یا علیؑ مشکل کشا۔۔۔ گیتی رانی دیکھو ماما جاگ گئی ہیں۔'' نصیباں بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ ویرو ایک طرف سہما کھڑا تھا۔ شیما کو لگا نظیف نے اسے آواز دی ہے۔

''شیما آنکھیں کھولو۔۔۔ میرا پہلا خط تمہیں مِل گیا ہوگا۔۔۔ میں پروفیسر رحمان صاحب سے بات کروں گا۔۔۔ لیکن ابا میاں تو مر چکے ہیں۔۔۔ چلو، میں تمہیں ڈاکٹر صاحب کے پاس لے چلوں، شاید وہ ہمیں کوئی اچھی خبر دینے والے ہوں۔۔۔ لیکن

نظیف تمہارے پاؤں میں تو جوتے نہیں ہیں۔۔۔ تمہارے سلیپر کہاں ہیں؟۔۔۔ اور دیکھو سارے فرش پر یہ کیا اُگ آیا ہے؟ چکنا چکنا۔۔۔ شاید لائیٹ چلی گئی ہے۔۔۔ اندھیرا بڑھ رہا ہے۔۔۔ آواز اُونچی کر دو۔۔۔ شاہ حسینؒ کی کافی کون گا رہا ہے؟

آواز اُونچی کردو۔۔۔

راتیں درد دیہاں درماندی (دِن رات پریشان اور تکلیف میں ہوں)
گھاؤ متراں دے الھے (دوستوں کے دِیئے ہوئے زخم تازہ ہیں)
رانجھن یار طبیب سنیندا (رانجھن، میرا دوست، سنا ہے کہ طبیب ہے)
میں تن درد اولے (میری جان کو عجیب عجیب دُکھ ہیں)

سَر اجازت ہے؟ ابا میاں مسکرا رہے ہیں۔ نظیف میں تمہارے ہاتھ کی گرمی محسوس کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ نظیف تم نے میرا ہاتھ کیوں چھوڑ دیا؟

ے اچھا تو کوئی اور بھی تھی؟☆
اچھا پھر بات کہاں نکلی؟
سب بتلا دو۔۔۔ پھر سو جاؤ
اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو
یہ ٹھنڈی سانس ہواؤں کی
یہ جھلمل کرتی خاموشی
یہ ڈھلتی رات ستاروں کی
بیتے نہ کبھی۔۔۔ تم سو جاؤ
اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو

میں نظیف ہارون آپ کا شکرگزار ہوں۔ شیما آپ خوش ہیں؟۔۔۔ نہیں میں

☆فہمیدہ ریاض

خوش نہیں ہوں۔۔۔ ہاں میں واقعی خوش نہیں ہوں میں رونا چاہتی ہوں۔۔۔ میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔۔۔ میں چکنی پنڈلیوں سے پھسل کر گر گئی ہوں۔۔۔ لیکن میرے پاؤں تو ننگے نہیں تھے پھر میں کیسے پھسل گئی؟۔۔۔ میں انھیں اپنا کر ان کی ذمّہ داری اُٹھاؤں گا۔ بیماری میں، صحت مندی میں، خوش حالی میں یا برے وقت میں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنا بھرپور پیار اور عزّت انھیں دوں گا، جب تک موت ہمیں جدا نہ کر دے۔ یہ کس نے کہا؟ کون بولا؟۔۔۔ یہ سچ ہے نا!۔۔۔ ہماری زندگی اِک دوسرے کے نام لکھی تھی! تمھیں مجھ سے محبت تھی؟؟؟ نصیباں مجھے دوا لا دو، پلیٹ میں دو انڈے۔۔۔ میں سونا چاہتی ہوں۔ میرے بازو شل ہو گئے ہیں۔ ونڈرفل ورڈز۔۔۔ بیوٹی فل ورڈز آف لا۔۔۔ لا۔۔۔ لا۔۔۔ یف۔۔۔ ونڈرفل ورڈز۔۔۔"

شیما کل رات سے بے ہوشی کی حالت میں تھی اور اب چوبیس گھنٹوں کے بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کا بلڈ پریشر آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ تھکن اتنی تھی اور سانس، یوں پھول رہا تھا جیسے پہاڑوں کی چوٹیاں سَر کرتی رہی ہو اور اب بے دم ہو کر، مارے نقاہت کے اس کا آنکھیں کھولنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب، نظیف سے بات کر رہے تھے۔

"بیگم صاحبہ اس کیفیت سے گزر رہی ہیں۔ جسے عرفِ عام میں 'نروس بریک ڈاؤن' کہتے ہیں۔ کوئی فوری اور شدید صدمہ اس کی وجہ ہو سکتا ہے۔"

"فوری تو نہیں۔۔۔ البتہ کچھ عرصہ پہلے ان کے والد اور بھائی کی وفات ہوئی ہے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں۔ اس کی وجہ سے کافی ذہنی دباؤ کا شکار رہتی ہیں۔ سائیکاٹرسٹ کے زیرِ علاج ہیں۔" نظیف نے یوں جواب دیا جیسے وہ بہت زیادہ فکر مند ہو۔

"بہرحال، موجودہ حالات ابھی تک اِتنے حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ ان کا بلڈ پریشر بہت زیادہ تھا۔ ڈر یہ تھا کہ دماغ کی شریان پھٹ جانے سے فالج نہ ہو جائے۔ اب انھیں

مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ میں انھیں دیکھنے کے لیے آتا رہوں گا لیکن کسی بھی وقت ضرورت محسوس کریں تو مجھے اطلاع کر دیجیے گا۔"

نظیف، ڈاکٹر کو دروازے تک چھوڑنے گیا اور پھر واپس کمرے میں نہیں آیا۔ وہ شیما کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔

دو دِن اسی کیفیت میں گزرے۔ شیما کے ذہن میں کچھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ نظیف کے پاؤں ننگے ہیں۔ کھلی اور بند آنکھوں سے اسے ایک ہی منظر نظر آ رہا تھا۔

اس وقت وہ بمشکل تکیوں کے سہارے اپنے بستر میں بیٹھی تھی۔ نصیباں اس کے لیے گرم گرم دَلیا لے کر آئی، اور اس میں شکر اور بھاپیں اُڑاتا دودھ مِلا کر بڑے پیار سے اپنے ہاتھ سے کھلانے لگی۔ شیما نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ شکرگزاری کے دو نیم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر، نصیباں کے ہاتھوں پر جا گرے۔ امّی جان یہاں نہیں تھیں اس لیے ان کی ناراضگی کا خطرہ نہیں تھا اور یوں بھی شیما کو اب اس کی پرواہ نہیں تھی۔ ان دِنوں میں نصیباں نے، جس طرح بچّوں کا خیال رکھا تھا اور اس کی خدمت گزاری کی تھی وہ اسے کبھی بھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ چند نوالے کھانے سے ہی اسے تقویت محسوس ہوئی۔

"خالہ، بچّے کہاں ہیں؟"

"ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں کھیل رہے ہیں۔ بنوان کے پاس ہے۔ جس دِن آپ بیمار ہوئیں، اسی دِن صاب نے اس اللہ ماری، فرزانہ پروین کو تو گاؤں بھجوا دیا تھا۔ کمبخت بچّوں کو ڈانٹ رہی تھی۔ آپ سو رہی تھیں اس لیے اسے کوئی پرواہ نہیں تھی، لیکن صاب نے دیکھ لیا۔

(میرے سو جانے پر تو وہ اور بھی بہت کچھ کرتی تھی اور اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔)

میں تو آپ کے کمرے میں تھی، مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

شیما کے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا۔

"میں بچوں کو بلاتی ہوں، آپ ان سے مِل کر دوبارہ سو جائیں۔ ڈاکٹر صاب نے کہا ہے کہ آرام کرنا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔"

شام کو نصیباں نے شیما کو گرم اوولٹین مِلا دودھ دیا، جو وہ آہستہ آہستہ پی رہی تھی۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں، اس لیے ڈاکٹر نے اسے چائے پینے سے منع کیا تھا۔ شیما کو لگ رہا تھا کہ دودھ سیدھا اس کی خون کی نالیوں میں شامل ہو کر اسے طاقت بخش رہا ہے۔

(اتنا تو مجھے کینسر نے بھی نہیں تھکایا تھا!)

شیما نے سوچا۔

"میں کافی دِنوں سے کالج نہیں گئی اور اِطلاع بھی نہیں کی۔" وہ نصیباں سے مخاطب تھی۔

"نہیں، بیگم صاب، صاب نے اسی دِن آپ کے کالج فون کر کے کہہ دیا تھا کہ آپ اپنی اماں سے ملنے گئی ہیں۔ صاب نے مجھے بتایا تھا کہ یہ انھوں نے اس لیے کہا ہے کہ آپ کی سہیلیاں آپ کو پوچھنے کے لیے نہ آ جائیں۔ ڈاکٹر صاب نے آپ کو آرام کرنے کو جو کہا تھا۔"

(تو نظیف ہارون، تم سبھی اِمکانات پر نظر رکھے ہوئے ہو اور نصیباں تک کو وضاحتیں پیش کر رہے ہو۔ بے فکر رہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں خود کو دُنیا کی نظروں میں تماشا بنا لوں گی؟ میرے ہوش و حواس ابھی قائم ہیں۔)

رات کو ڈاکٹر صاحب دیکھنے کے لیے آئے تو شیما، ویرو کو گود میں لیے بستر میں بیٹھی تھی۔ گیتی اس کے پاس بیٹھی اپنی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔

"بیگم صاحبہ، اب آپ بہت بہتر ہیں۔ ادویات اور آرام نے آپ پر بہت اچھا اثر کیا ہے۔" ڈاکٹر صاحب مطمئن نظر آ رہے تھے۔

"جی ڈاکٹر صاحب، میں شکر گزار ہوں۔" شیما نے بہت خلوص سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ تو بحیثیت ایک ڈاکٹر میرا فرض تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب، میرے بچّے مجھے جینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔" شیما نے گیتی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اور .D.C صاحب کی فکر مندی کو بھی اس میں شامل کر لیجیے۔" ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی مریضہ کے صحت یاب ہونے پر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔

ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ A.C صاحب نظیف سے کہہ رہے تھے:

"سر، آپ کی اہلیہ اب کیسی ہیں؟"

(وہ اب 'نا اہلیہ' بن چکی ہیں۔) شیما اپنی ہی سوچ پر ہنس دی۔

وہ زندگی کی طرف واپس لوٹ رہی تھی۔

"D.C صاحب مصروف ہیں۔ میں پھر کسی وقت سہولت سے ان سے بات کروں گا۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ دونوں چھٹی لیں اور بچّوں کو ساتھ لے کر کچھ دِن پہاڑ پر گزار آئیں۔ ماحول سے دُوری آپ پر اچھا اثر ڈالے گی۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

(میرا خیال ہے 'نظیف سے دُوری' مجھ پر زیادہ اچھا اثر ڈالے گی۔ میں چند دِن کے لیے اماں کے پاس چلی جاتی ہوں۔)

اور جب ڈاکٹر صاحب نے نظیف سے بات کی تو اس نے بھی نصیباں کی زبانی یہی پیغام بھیجا کہ وہ اماں کے ہاں چلی جائے۔

"بیگم صاب، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟ میرا بہت دِل چاہتا ہے، آپ کی اماں جان اور آئمہ رانی سے ملنے کو۔ امی جان یہاں نہیں ہیں، ورنہ وہ تو کبھی مجھے جانے نہ

دیتیں۔ بس، صاب سے پوچھ لوں گی۔"

شیما کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

اگلے روز وہ جانے کی تیاری کر رہی تھی، تو گیتی نے پوچھا:

"ماما، بابا ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔"

"نہیں بیٹا۔"

"کیوں؟"

"وہ مصروف ہیں۔"

نظیف اِتنا 'مصروف' تھا کہ اس نے بچّوں کو خدا حافظ کہنا بھی گوارہ نہ کیا۔

ڈرائیور ان لوگوں کو چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

اماں، انھیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ وہ شیما کو گلے سے لگا کر پیار کر رہی تھیں تو آنسوؤں کی برسات ان کے چہرے کو بھگوئے دے رہی تھی۔

"اچھا ہوا شیما تم آ گئیں۔ میرا دِل تمہارے لیے بہت اُداس تھا۔"

"اسی لیے تو آئی ہوں، میں بھی بہت اُداس ہو رہی تھی۔"

شیما نے اماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"آپی آپ بہت کمزور لگ رہی ہوں۔ خیریت؟" آمنہ نے پوچھا۔

تو شیما نے اسے اشارے سے منع کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اماں کو پریشانی ہو۔

"مجھے بخار آتا رہا ہے۔" شیما نے نصیباں کو راستے ہی میں منع کر دیا تھا کہ اس کی بیماری کا ذِکر نہ کرے۔

"ماما سارا وقت سوئی رہتی تھیں۔" گیتی نے بتایا۔

"ہاں، میں نے بخار کے بہانے جی بھر کر آرام کیا ہے ان دِنوں۔"

"اور ساتھ کھایا پیا کچھ نہیں؟ اتنا سا منہ نکلا ہوا ہے۔" اللہ رکھی کو شیما کے گھورنے

کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

"اب آپ مزے مزے کے کھانے بنائیں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

شیما تھوڑی دیر کے لیے اپنی پریشانی بھول گئی تھی یا وہ کمال کی اداکاری کر رہی تھی۔

OOO

اماں کے ہاں سے واپس آ کر شیما اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی اور دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ نظیف بستر پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے سر اُٹھا کر شیما کی طرف دیکھا۔ شیما آہستگی سے چلتی ہوئی کونے میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ یوں ہانپ رہی تھی جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو۔ وہ نظیف کے گزشتہ کچھ عرصہ کے رویّے سے خوفزدہ تھی۔ کب سے دِل سہما ہوا تھا، اِک چپ سی لگی تھی، بات کرنے سے دِل ڈرتا تھا، لیکن جو کچھ اب ہوا تھا، وہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اور اب جب کہ کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا، تو وہ غم و اندوہ سے پامال تھی، شکستہ تن، بکھرے ہوئے پندار کے ساتھ۔۔۔ رنج و رسوائی دامن گیر تھی، پھر بھی وہ چپ تھی لیکن سوچتی تھی کہ مصلحت کیا ہے؟ کیا یہ صرف اسی کے لیے ہے؟ وہ دیوتا تو نااندیشی کی بلندی سے گر کر چور چور ہو گیا تھا، اس لیے اب وہ بھی چاہتی تھی کہ مصلحت کے اس پیرہن کو چاک کر دے۔ رگ رگ میں تلملاتے غصّے کو اُگل دے۔ شاید ان بے طرح اُٹھنے والی ٹیسوں سے اسے سکون مل جائے۔

"نظیف۔۔۔ میری بات سنو۔"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا رنگ پھیکا تھا۔

"نظیف یہ کلام تم نے بھی پڑھا ہوگا اور میں نے بھی بارہا پڑھا ہے۔"

ے نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا
ککر تے انگور چڑھایا تے ہر گچھا زخمایا

لیکن جس خوبی سے اس کے معانی اب مجھ پر واضح ہوئے ہیں، پہلے نہ تھے۔
تمہارے چند سالہ ساتھ سے ہی میں زخم زخم ہوں۔"

"تو گویا دوسرے الفاظ میں تم مجھے 'نیچ' کہہ رہی ہو۔تم ہوش میں تو ہو۔۔۔تمہیں
جرأت کیسے ہوئی؟"

نظیف دھاڑا۔

"ہاں۔۔۔ہاں میں بقائمی ہوش وحواس یہ سب کہہ رہی ہوں اور یہ جرأت بھی تم
ہی نے مجھے بخشی ہے۔تمہاری محبت نے تو میرے حواس بھی چھین لیے تھے اور جرأت
بھی۔۔۔اور اب تمہارا ملمّع اُترنے کے بعد میری قوتِ گویائی واپس آ گئی ہے، مجھے کہنے
میں کوئی باک نہیں ہے کہ تم لالچی ہو۔۔۔تم بے وفا ہو۔۔۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم زانی
ہو۔تمہیں رشتوں کی حرمت کا احساس نہیں ہے۔اور نیچ کی definition کیا ہوتی ہے؟
اگر تمہیں ایسا کہلائے جانے پر اعتراض ہے تو اپنی حرکات پر ضبط رکھتے۔عزّت دار کہلائے
جانے کے خواہش مند لوگ تو مر جاتے ہیں لیکن غلط کام نہیں کرتے، اور تم۔۔۔تم۔۔۔
ذلیل۔۔۔کمینے۔۔۔بے غیرت۔۔۔اور وہ 'گشتی' تمہاری رکھیل۔۔۔اگر تمہاری شادی
مناسب عمر میں ہوئی ہوتی تو آج تمہاری بیٹی، اس عمر کی ہوتی۔۔۔اور اپنی بیٹی کے ساتھ!!!
میرا تو دماغ پھٹا جا رہا ہے۔میری جائیداد کے معاملے میں تو تمہیں شریعت یاد تھی، اب اس
مسئلے میں تم کیا کہتے ہو؟ کیوں نہ تمہیں سنگسار کیا جائے؟ تم نے یہ سب کیوں کیا؟۔۔۔
جواب دو۔۔۔مجھے تمہارا جواب چاہیے۔"

"بکواس بند کرو۔تم نے دوبارہ کہا تو میں۔۔۔؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔
میری برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔"

نظیف کا چہرہ غصے سے نیلا ہو رہا تھا۔

"تم کر گزرو اور میں ذکر نہ کروں۔۔۔اگر اس بات کی اتنی فکر تھی، تو یہ تمہیں پہلے

سوچنا چاہیے تھا۔"

"ہو گیا نا! کون سا ایسا غضب ہو گیا ہے؟ چپ ہو جاؤ۔۔۔میں تمہاری اس
بک بک سے تنگ آ گیا ہوں۔"

"اور غضب کیسا ہوتا ہے؟ تم تنگ آ گئے ہو تو میں کونسا خوش ہوں۔"

"اچھا۔۔۔اچھا، بہت ہو گیا۔۔۔زیادہ فلسفہ جھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور
بند کرو یہ رونا دھونا۔بات کچھ بھی نہیں ہوتی اور تمہارا رونا دھونا شروع ہو جاتا ہے۔" نظیف
نے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔

"روؤں نہ تو کیا کروں؟ کیا کروں؟ اِتنی بڑی بات کا دُکھ الگ اور 'اتنی بڑی بات'
کو یہ کہنا کہ 'بات کچھ بھی نہیں' کا دُکھ الگ۔۔۔یہ میرے اعتماد کا خون ہے۔۔۔میرے
اعتبار کا مسئلہ ہے، میری محبت کا جنازہ ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ بات کچھ بھی نہیں۔"

"اچھا۔۔۔اچھا، میرے پاس تمہاری اس خرافات کے لیے وقت نہیں ہے۔
کیا چاہتی ہو تم؟ میں تمہارے ساتھ عمر گزار دوں۔۔۔تمہارے ساتھ۔۔۔ادھوری عورت
کے ساتھ۔"

نظیف کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔

"ادھوری عورت؟ تو کیا اب میری پہچان صرف یہ ہے؟ نظیف میں شیما ہوں۔۔۔
وہی شیما جسے تم دوست کہا کرتے تھے۔

(میں وہی ہوں جسے تم دوست کہا کرتے تھے
دِن میں سو بار میرا نام لیا کرتے تھے
آج کیا بات ہے، کیوں مجھ سے خفا بیٹھے ہو؟
کیا کسی اور کو اب دوست بنا بیٹھے ہو؟
فاصلے پہلے تو اِتنے نہ ہوا کرتے تھے!

میں وہی ہوں جسے تم دوست کہا کرتے تھے۔)

وہی شیما جس کے ساتھ مل کر تم Ideal Couple بنانے کا اِرادہ رکھتے تھے۔

وہی شیما، جس کے ساتھ شادی ہو جانے کا تمہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں وہی شیما ہوں، جس سے تم نے پوچھا تھا کہ تمہارے ساتھ شادی کرنے پر خوش ہوں یا نہیں؟ میں شیما ہوں، تمہاری زندگی کی ہم سفر اور تمہارے بچّوں کی ماں۔۔۔ لیکن تمہارے نزدیک اب میں صرف عورت ہوں، وہ بھی ادھوری۔۔۔''

شیما پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

نظیف کوئی اور ہوتی تو شاید اس قدر جلن نہ ہوتی، میں اس درجہ تحقیر محسوس نہ کرتی۔ تمہارے، اس کے قریب آنے کی وجہ کچھ اور ہوتی، ذہانت، خوبصورتی، علم یا ذہنی مطابقت۔۔۔ لیکن یہاں وجہ میرا ادھورا پن ہے؟ یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی۔

کیا عورت، صرف جسم ہے؟ کیا عورت، بیوی۔۔۔ دوست یا ہم سفر نہیں ہے؟

کیا عورت، صرف پِستان ہے؟ کیا پِستان کی اَوٹ میں دھڑکتے ہوئے دِل کی صدا مرد نہیں سنتا؟ عورت کی ذات اتنی سطحی ہے یا مرد کی سوچ؟ مرد، عورت کو فقط جسم کیوں سمجھ لیتا ہے؟ یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ اس میں رُوح بھی ہوتی ہے لیکن رُوح کیا ہوتی ہے؟ اس سے اسے سروکار ہی نہیں، وہ صرف جسم کے تقاضوں کو سمجھتا ہے۔

جسم، قربت کا ضامن ہے یا وہ رِدھم، جو دِل سے نکلتا ہے؟ جو پکار پکار کر کہتا ہے:

ے مجھے تم سے محبت ہے!

مجھے تم سے محبت ہے!!

ازدواجی بندھن، جنسی خواہش سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے تو پھر دوسراہٹ کا تصور تو ختم ہو گیا۔ وہ دوسراہٹ، وہ جنم جنم ساتھ نباہنے کے وعدے۔۔۔ جھوٹ سب جھوٹ۔۔۔

کیا تم نے اس سے بھی وہی کچھ کہا ہوگا، جو مجھ سے کہتے تھے؟

''تم بہت خوبصورت ہو!'' (وہ خوبصورت نہ سہی، مکمّل تو ہے۔)

''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں ادھورا تھا، تم نے مجھے مکمّل کر دیا ہے۔

(لیکن نظیف اب ادھوری میں تھی اور مکمّل کرنے کی باری تمہاری)

جسم کا رِشتہ تو کچا رِشتہ ہے۔ کبھی بھی، کسی سے بھی جوڑا جا سکتا ہے لیکن دِل کا بندھن اس سے بہت مختلف ہے۔ آسانی سے بندھتا نہیں، اور بندھ جائے تو عمر کے ساتھ چلتا ہے۔۔۔ قبر کی دیواروں تک۔۔۔ یا شاید اس سے بھی آگے۔

اگر ایسا ہے تو پھر ہم تم دُور کیوں ہوئے؟؟

تمہارا مجھ سے جسم کا رِشتہ تھا اور میرا تم سے دِل کا؟

تم نے مجھ سے جسم کا رِشتہ جوڑا۔۔۔ چھی۔۔۔ چھی۔۔۔ چھی اتنی چھوٹی بات۔۔۔ جس میں، مَیں تمہاری شریک رہی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا ہے۔ بے مایہ۔۔۔ بے وقعت یہ دُکھ میرے اندر سرایت کرتا جا رہا ہے۔ ایک الاؤ ہے جس میں مَیں جھلسی جا رہی ہوں۔۔۔ لیکن مجھ برہن کا جلنا ایسا ہے کہ نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ۔۔۔ میں ابھی تک یقین نہیں کر پا رہی کہ اُس وقت جب، تم اور وہ ساتھ تھے تو میں تمہارے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔۔۔ یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے یا کریہہ المنظر حقیقت۔۔۔ میں اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ نہیں کر پا رہی کہ یہ سب سچ ہے۔۔۔ کڑوا سچ۔ اگر مجھے اس پر یقین آ جائے تو شاید میرے لیے برداشت کرنا آسان ہو جائے۔۔۔ لیکن میں تمہاری محبّت کے حصار سے نکلوں تو مجھے یقین آئے، پھر سوچتی ہوں اگر میرے دِل نے اسے تسلیم کر لیا تو یہ جلن نارِ جہنّم بن جائے گی۔۔۔ کبھی نہ بجھنے والی۔

محبت کرنا بہت آسان، لیکن نفرت کرنا بہت مشکل ہے، جان جوکھم۔۔۔

محبت میں تو پیار کی پھوار میں بھیگتے تن من کا روم روم جھوم اُٹھتا ہے اور نفرت کی

آگ بھڑکتی ہے تو راکھ کے سوا کچھ نہیں بچتا۔"

شیما کو لگا اس کا دِل ڈوب رہا ہے۔ اس کا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

'ہرا سمندر، گوپی چندر
بول میری مچھلی کتنا پانی؟
میری گردن تک پانی---'

وہ بے چین تھی--- پریشان تھی، اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی، ہانپ رہی تھی اور چلّا رہی تھی۔

'میری گردن تک پانی
میری گردن تک پانی'

شیما نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری نظیف کی طرف لہرائی تو اس کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا اور وہ زور سے ڈکرایا۔ مچھلی حصار توڑ کر آزاد ہوگئی تھی۔ اِردگرد زور کے قہقہے گونجے تو شیما کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے بازو شل تھے اور چہرہ آنسوؤں سے تر---
تو کیا یہ سب خواب تھا؟ ساتھ کے بستر پر آئمہ سو رہی تھی، ویرو کو اپنے بازوؤں میں لیے۔ گیتی، شیما کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ وہ سوتے میں بے قرار ہو کر بار بار اُٹھ جاتی تھی۔

"بابا آپ کہاں ہیں؟"

یہ سلسلہ ساری رات جاری رہا۔ صبح وہ بخار میں بری طرح پھنک رہی تھی۔ رات کا منظر، بار بار شیما کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ شیما اور آئمہ گیتی کو ڈاکٹر یعقوب کے پاس لے گئیں۔

ڈاکٹر یعقوب ان کے خاندانی ڈاکٹر اور ابا میاں کے دوست تھے--- انھی کی طرح شفیق۔ انھوں نے شیما اور آئمہ کے سر پر پیار کیا۔ شیما کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہے جا رہے تھے۔ وہ خود کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی۔

دوا کے اثر سے بخار کم ہوا تو گیتی بے سدھ سوگئی۔ آئمہ نے شیما کو زبردستی واش رُوم میں دھکیل دیا اور خود ناشتے کے لیے اللہ رکھی کو کہنے چلی گئی۔

شیما سوچوں کے گرداب میں چکراتی پھر رہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ محبت کی بنیاد، اعتماد پر رکھی جاتی ہے اور جس محبت کی نیو، اعتماد کے خون سے سینچی گئی ہو اس کے پنپنے کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے اور پھر جس شخص کی عزّت کرنے کو دِل نہ چاہے اس سے محبت؟؟؟

"آپی آپ ٹھیک سے کھا نہیں رہی ہیں۔" آئمہ نے اسے ٹوکا۔

(میں سمجھتی ہوں، اب ہمارے درمیان کوئی جذباتی تعلق باقی نہیں رہا۔ بس دو بولوں کے بندھن کو گھسیٹنا ہے۔ کب تک گھسیٹتے ہیں اور کیسے؟--- اس بات کا فیصلہ وقت کرے گا۔ شاید زندگی کے خاتمے سے پہلے ہمت جواب دے جائے یا شاید زندگی ہار جائے---اور بھرم قائم رہے۔

نظیف سے محبت کا سلسلہ تو تمام ہوا لیکن اس کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ وہ، میرے بچّوں کا باپ ہے اور ان بچّوں کو باپ کی ضرورت ہے۔ گیتی بڑی ہوگی تو اس کا رشتہ طے کرتے وقت لوگ اس کے باپ کے بارے میں پوچھیں گے۔ ویرو کو ہر وقت اس کی رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔" شیما خود کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔)

چائے کی پیالی ختم کرنے تک وہ نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پچھتاوؤں کے ریگ زار بہت وسیع ہیں۔ وہ ان میں آبلہ پا بھٹکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس ذہنی کھینچا تانی سے نکلنے کے بعد وہ پرسکون ہوگئی تھی۔ ہیمر شولڈ کی کتاب اُٹھا کر وہ برآمدے میں آگئی۔ اس کی پسندیدہ مغنیہ کی آواز اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

ے اے جذبۂ دِل گر میں چاہوں
ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں

اور سامنے منزل آ جائے

شیما نے بے دھیانی سے کتاب کھولی اور سامنے آ جانے والے صفحے کو پڑھنا شروع کیا۔

'جب صبح کی تازگی، دوپہر کی حدت میں بدل چکی ہو، جب تمہاری ٹانگیں، تمہارا بوجھ اُٹھانے سے اِنکار کر دیں اور سفر کبھی ختم نہ ہونے والا نظر آئے۔۔۔ تو یہ وہ وقت ہے جب تمہیں رُکنا۔۔۔ نہیں چاہیے۔'

اس نے سوچا، امّاں کی طبیعت بہتر ہے، وہ آج ہی گھر واپس چلی جائے گی۔ وہ عمر کے اس حصّے میں ابا میاں کی ضرورت بُری طرح محسوس کرتی ہے، اس لیے وہ اپنے بچّوں سے باپ کی شفقت نہیں چھینے گی۔ وہ خود تو ان سسکتی ہوئی ظلمتوں میں، جینے کا حوصلہ پیدا کر لے گی مگر بچّوں کو ان کا واقفِ راز نہیں ہونے دے گی۔

؎ اس وقت مجھے چونکا دینا

جب سامنے منزل آ جائے

اے جذبۂ دل۔۔۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو وہ سمجھی کہ دودھ والا ہو گا۔ نصیباں دروازے پر گئی تو ایک اور رجسٹرڈ خاکی لفافہ، شیما کا منتظر تھا۔

؎ تاڑی مار اُڈا نہ باہُو

اسیں آپے اُڈن ہارے ہو

وہ نہ چیخی، نہ ہی چلاّئی۔ اس کے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جمے رہے۔ وہ کسے پریشان کرے؟ امّاں کو، جو جوان بیٹے اور خاوند کا دُکھ نہ جانے کیسے برداشت کیے بیٹھی ہیں۔ آئمہ کو، جو خود ابھی بچّی ہے لیکن کتنے غم اور ذمہ داریاں اُٹھائے ہوئے ہے۔

یہ ہونا تھا، وہ بہت مُدّت سے محسوس کر رہی تھی لیکن، یہ ہو جائے گا، اس کا دِل نہیں

مانتا تھا۔ اب وہ سمجھتی تھی کہ ان حالات سے نپٹنے کے لیے اس کے پاس امّاں ہیں، جن کو اگر چہ وہ اپنے دُکھ نہیں بتاتی لیکن لگتا ہے کہ وہ سب سمجھتی ہیں۔ اس کے ساتھ آئمہ ہے، جس کے ساتھ، ہر معاملے میں اس کی سانجھ ہے، اس کے پاس نوکری ہے، جو اس نے بیماری میں تکلیف کے باوجود نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بچّوں کو بہلانا ہو گا۔ وہ انھیں کیسے سمجھا پائے گی کہ اب وہ اپنے بابا سے کبھی نہیں مِل سکیں گے۔ وہ ان سے کیا کہے گی؟ اس کے لیے وہ اسے قصوروار تو نہیں سمجھیں گے؟ ایک لمحے میں، اس کے مستقبل کی تصویر اس کے سامنے کھنچ گئی۔

ویرو سو کر اُٹھ گیا تھا۔ شیما نے اسے گود میں لیا تو اس کی چیخیں نکلتی بچیں۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے، لیکن آنسوؤں پر اس کا اختیار نہ تھا۔ آئمہ نے دیکھا تو گھبرا گئی۔

"آپی، کیا ہوا؟ گیتی تو ٹھیک ہے نا!"

شیما نے خاموشی سے لفافہ اسے تھما دیا۔

آئمہ کا رنگ زرد ہو گیا اور وہ اپنے پاؤں پر بیٹھ گئی۔ شیما نے اسے اِشارے سے اندر بلایا۔

"دیکھو آئمہ۔۔۔ اسے یونہی پی جاؤ، میں امّاں کو کھونا نہیں چاہتی۔"

اس کا لہجہ مضبوط تھا لیکن اندر سے وہ ڈھے گئی تھی۔

OO

آٹھ ماہ کے بعد شیما کو پھر ایک لفافہ مِلا، لیکن یہ سادہ تھا۔ اس پر D.C آفس کی مہر نہیں تھی۔ لکھا تھا:

'Love knows not its depth till the hour of separation'

(محبت کو اپنی شدّت کا اِس وقت تک اندازہ نہیں ہوتا، جب تک جدائی کی گھڑی نہ آ جائے۔)

شیما نے نظیف کی لکھائی پہچان کر، اسے پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

"اب کہ اِک عمر کی محرومی سے ☆
دِل نے سمجھوتہ سا کر رکھا تھا
اب کہ اس رُت میں کسی پیڑ پہ پتّا تھا نہ پھول
اب کہ ہر طرح کے دُکھ کے لیے تیار تھا دِل
کس لیے سوکھی ہوئی شاخ پہ شعلہ سی کونپل پھوٹی
کس لیے تیرا یہ پیغام آیا۔"

(نظیف کیا تم نہیں جانتے کہ اب ان باتوں کو دُہرانے کا وقت گزر چکا ہے۔ گزرتا وقت کسی کے بس میں نہیں، کوئی چاہت اس کی دامن گیر نہیں۔ کوئی آنسو زنجیرِ پا نہیں بن سکتا۔ کھوئے ہوئے لمحوں کی کنکریوں سے آنکھوں میں چبھن مستقل ہوئی جاتی ہے۔

شیما کے ذہن پر چھائی ہوئی رات میں سرد ہوا کھڑکی پر سر پٹک پٹک کر بین کرتی رہی۔ پچھّم سے اُٹھنے والی کالی گھٹا اندھیرے میں گڑگڑاتی رہی اور شیما کے دِل پر آنسوؤں کی بوندیں گرتی رہیں۔

اب ان باتوں سے کیا حاصل؟ مجھے آواز نہ دو۔ میں وقت کے تپتے صحراؤں میں بہت دُور نکل آئی ہوں۔ میں تمہارا حال نہیں، ماضی کا ایک مٹتا ہوا سایہ ہوں۔ تم سے عمر بھر کا پیمان، گردشِ وقت میں کھو گیا ہے اور اب تم سے میرا تعلّق صرف بچّوں کے حوالے سے ہے، جو اتنا موہوم ہے کہ معدوم ہوا جاتا ہے۔ کیونکہ ان آٹھ ماہ کے دوران تم نے بچّوں سے کوئی رابطہ نہیں کیا ہے۔ میرا سامان تو تم نے بھیج دیا کہ مجھ سے تعلقِ خاطر نہیں رہا تھا لیکن گیتی کی گڑیا اور ویرد کا بیٹ اور بال بھیجتے ہوئے تمہارے ہاتھ کیوں نہیں کانپے؟ تمہارا دِل خون کے آنسو کیوں نہیں رویا؟ تم کہتے تھے کہ "ہمارے، بچے، ماں اور باپ، دونوں کی بے پناہ محبت

☆ فہمیدہ ریاض

کے زیرِ سایہ، پلیں بڑھیں گے۔" اب انہیں حالات کے گھٹاٹوپ اندھیروں اور بے رحم آندھیوں سے بچانے کے لیے فی الحال تو میں اکیلی اپنے پیار کے آنچل میں چھپا لوں گی، لیکن آنے والی کل کی بڑی ذمّہ داریوں کے ساتھ انھیں زندگانی کی کڑی دھوپ میں جلنا پڑے گا تو یہ سہارا بہت کمزور پڑ جائے گا۔ میں ان کے بچپن کو جوانی کی دُعا دیتے ہوئے کانپ جاؤں گی۔

یہی بات، جو بچھڑنے کے بعد تم نے کہی ہے اسے جدائی سے پہلے کہنے کا حوصلہ رکھتے تو یہ دِن نہ دیکھنا پڑتا اور اب۔۔۔ اب تو میری ہست کے کھنڈر میں کوئی طاق بھی موجود نہیں، جس میں آشاؤں کے نئے دِیپ جلاؤں، محبتوں کا الاؤ بجھ چکا ہے اور اس میں سے اُڑتی ہوئی راکھ سے میرا دم گھٹا جاتا ہے۔

جدائی کا فیصلہ فقط تمہارا تھا، کیونکہ تم گناہ کی بے پناہ لذّت کو ندامت کے تلخ ذائقے میں کھونا نہیں چاہتے تھے ورنہ میری محبت تو تمہیں معاف کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ کاش ایسا بھی کچھ ہوا ہوتا، میری کمی تمہیں رُلا دیتی اور تمہارے لبوں پر میرا نام آتے ہی میں تمہاری سمت لوٹ آتی۔)

شیما نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان، خط کا جواب لکھا۔ صرف ایک شعر۔۔۔

وفا کی لاج میں مجھ کو منا لیتے تو اچھا تھا
اَنا کی جنگ میں اکثر جدائی جیت جاتی ہے

اسے لفافے میں بند کیا، ایڈریس لکھا، ردّی کی ٹوکری سے نظیف کے خط کے ٹکڑے اُٹھائے اور کچن میں چلی آئی۔۔۔ ان سب کو دِیا سلائی دِکھائی تو وہ جل کر راکھ ہو گئے۔۔۔ بالکل شیما کی طرح۔

نصیباں نے پوچھا۔

"شیما، یہ کیا تھا؟"

"کچھ غیر ضروری کاغذات تھے مانی۔"

OO

اماں سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا، کچھ نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے بھی، کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی، لیکن گیتی، ویرو اور شیما کو دیکھ کر ان کے چہرے پر جو حسرت برستی تھی وہ سب کچھ کہہ دیتی تھی۔

اتنے دنوں سے، انہوں نے کبھی نظیف کا ذکر نہیں سنا تھا اور نہ ہی کیا تھا۔ انہوں نے تو شیما سے یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ اس نے، اتنی لمبی چھٹی کیوں لے رکھی ہے اور نصیباں کو اتنا عرصہ رکنے کی اجازت، امّی جان نے کیسے دی ہے؟ یوں محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے ساتھ ایک خاموش معاہدہ کر رکھا ہے۔

ابا میاں کی وفات کے بعد سے آئمہ، اماں کے کمرے میں ان کے برابر والے بستر پر سونے لگی تھی۔ شیما نے بھی اپنا بستر وہیں لگوا لیا تھا۔ بچّے، نصیباں خالہ اور اللہ رکھی باجی کے پاس سوتے تھے۔ ان دو کمروں کے علاوہ سارا گھر مہیب خاموشی میں ڈوبا رہتا۔

اماں، رات کے کسی پہر، اٹھ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے آنسو، خاموشی سے گرتے رہتے۔ وہ بے آواز روتیں اور سسکیوں کو یوں ہونٹوں میں دبا لیتیں کہ دیکھنے والے کا کلیجہ پھٹنے لگتا۔ وہ کبھی آئمہ کو سینے سے لگا لیتیں، کبھی شیما کے چہرے کو ہاتھوں میں لیے تکتی رہتیں اور کبھی اللہ رکھی کو اپنے پاس بٹھائے رکھتیں۔ بغیر کچھ کہے۔۔۔ وہ اندر ہی اندر گھل کر ختم ہو رہی تھیں۔

ایک دن انہوں نے شیما کو، خالہ جان سے بات کروانے کو کہا اور جب کال ملا دی گئی تو صرف اتنا کہا،

"میں تمہاری اور فرید کی منتظر ہوں"

اور جس روز ان لوگوں کو پہنچنا تھا، اس سے پہلی رات وہ خاموشی سے اگلے جہاں

سدھار گئیں۔ شیما اور آئمہ، رات میں بار بار اُٹھ کر ان کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔ آج جب شیما نے نظر ڈالی تو وہ پرسکون اور آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ، سرمد اور ابا میاں سے ملنے جا چکی تھیں۔

اگلے روز، خالہ جان اور فرید کا ائیر پورٹ پر استقبال صرف چاچا فیروز نے کیا اور گھر پر تایا ابا نے، جنہیں اماں نے دو روز پہلے ہی بلوا لیا تھا۔

وہ لوگ آئے تو 'ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق' والا معاملہ تھا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی سے، وہ مہیب سناٹا جو پورے گھر کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا، اس میں دراڑیں سی محسوس ہو رہی تھیں۔

جس خاموشی سے اماں دوسرے جہاں سدھاریں، اسی خاموشی سے، آئمہ پیا دیس سدھار گئی۔ شیما کے بے حد اصرار پر، اس نے بمشکل نکاح کا جوڑا پہنا تھا۔ آئمہ کی شادی اس انداز سے ہو گی، کبھی کسی نے سوچا نہ تھا۔ خالہ جان تو جب بھی اماں سے بات کرتیں، یہی کہتیں۔

"آپا ہم خوب دھوم دھام سے شادی کریں گے۔ ڈھولک بجے گی، تمام رسمیں ہوں گی، میں تو پردیس میں رہ کر ایسی تقریبات کے لیے ترس گئی ہوں۔"

آسٹریلیا سے خالو جان کا آنا نہ ہو سکا تھا کیونکہ فرید کی بہن ارم، جو میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی، کے امتحان تھے۔ لیکن وہ بار بار فون کر کے، شیما کو، آئمہ کی جانب سے بے فکر ہو جانے کا کہہ رہے تھے۔ شیما کے حوالے سے، تایا ابا کو اپنے حصّے کی ذمّہ داریاں بھی سونپ رہے تھے۔ چاچا فیروز، اللہ رکھی اور نصیباں کو یہ یقین دلا رہے تھے کہ اِن لوگوں کی موجودگی اُن کے لیے باعثِ اطمینان ہے۔

آسٹریلیا میں، خالو جان، ارم، ان کے ملنے والوں اور فرید کے دوستوں کے علاوہ شہلا نے بھی، آئمہ کا استقبال کیا تھا۔ وہ فرید لوگوں کے گھر سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر رہتی

تھی۔ اس کے شوہر شہزاد حسن نے آئمہ کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا تھا،

''آئمہ بہن، ہمیشہ یوں سمجھنا کہ تمہارا میکہ، تمہارے گھر سے صرف ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔''

اور پھر اسی طرح، بہت سے دن گزر گئے۔ شیما نے لمبی چھٹی لے لی تھی۔ ان حالات میں اپنی ہمّت کو مجتمع کرنا، اس کے لیے، کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ آئمہ اور باقی گھر والوں کا باقاعدگی سے فون اور خط آتا رہتا تھا۔ آئمہ، آہستہ آہستہ، فرید اور باقی سب لوگوں کی محبت اور توجہ کے سہارے، نارمل زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ نصیباں اور اللہ رکھی، گھر اور بچوں کو سنبھال رہی تھیں۔ کبھی جو کافی دیر تک، اللہ رکھی، نظر نہ آتی تو شیما سیدھا، امّاں کے کمرے کا رخ کرتی، جہاں وہ بے اختیار روتی پائی جاتی۔

تایا ابا، لرزتی ہوئی آواز میں، شیما سے فون پر بات کرتے اور بات ادھوری چھوڑ کر، فون بند کر دیتے۔ نگار تقریباً ہر ویک اینڈ پر شیما کے پاس آ جاتی۔ کبھی شیما کو ہنساتی تو کبھی اس کے ساتھ مل کر روتی۔ ثوبیہ، روزانہ رات کو فون پر شیما سے لمبی بات کرتی۔ مسز ظہیر اور باقی کولیگز بھی آتی رہتیں۔

شہلا نے امّاں کے حوالے سے نظم لکھ کر بھیجی تھی، جس نے سب کو رُلا رُلا دیا تھا۔

بالپنے دیاں ساریاں خوشیاں (بچپن کی ساری خوشیاں)
کیویں موڑ لیاواں (کیسے واپس لاؤں)
ماں، ماں، کہہ کے، جھگا پھڑ کے (ماں، ماں، کہہ کر، قمیض پکڑ کر)
کیویں گل مناواں (کیسے اپنی بات منواؤں)
نہ کوئی سوچ، نہ فکر دیاں پنڈاں (نہ کوئی سوچ، نہ فکر کے انبار)
بے فکری دیاں گوڑھیاں نینداں (بے فکری کی گہری نیندیں)
کتھوں لبھ لیاواں (کہاں سے ڈھونڈ لاؤں)

رنگلے کپڑے لاہ کے کیویں (کیسے اپنے رنگین کپڑے اتار کر)
کالا چولا پاواں (کالا ماتمی لباس پہنوں)
کتھوں لبھاں ماں میں اپنی (میں اپنی ماں، کہاں سے ڈھونڈ لاؤں)
جنہیں لاڈ لڈائے (جس نے لاڈ اور پیار دیا)
دنیا دے دکھاں توں اوہلے (دنیا کے دکھوں سے چھپا کر)
سکھ میری جھولی پائے (سکھ میری جھولی میں ڈال دیے)
نہیں لبھنی، اولبھ نہیں سکدی (نہیں ملیں گی، ان کا ملنا ناممکن ہے)
لکھ رووواں، کرلاواں (لاکھ روتی اور کرلاتی رہوں)

گیتی نے آہستہ آہستہ، پوچھنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ لوگ بابا کے پاس کب جائیں گے؟ دونوں بچے وہ واحد ذریعہ تھے، جس کی وجہ سے ماحول میں شگفتگی آ جاتی تھی۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے اور کھیلتے ہوئے کبھی کبھار، ہنسی کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ منجمد، جان لیوا سنّاٹا، دِھیرے دِھیرے پگھلنے لگا تھا۔

OO

۔۔۔اور اب میں اس گھر میں واپس آ گئی ہوں، جہاں سے رُخصت ہوئی، جس کے آنگن میں میرے بچّے کھیلے، جہاں سے ابا میاں، سرمد اور امّاں کو رُخصت کیا۔ جہاں اِنتہا کا سکھ بھی دیکھا اور بے پناہ دُکھ بھی، جہاں دِن عید تھے تو راتیں شبِ برات۔۔۔اور پھر جہاں شامِ غریباں بھی منائی، جہاں ہر سایۂ گل نے مجھ سے باتیں کیں۔ بالکل ویسے ہی، جیسے آئمہ اور میں کرتے تھے، جہاں میں ہنستی تو گل بوٹے کھڑ تالیں بجاتے اور میں روئی تو در و دیوار، دیوارِ گریہ بن گئے۔

جہاں ابا میاں دھیرے دھیرے پاؤں دھرتے، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں، ان کی خوشبو رچی ہے۔ جن کو چھوتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے

میں نے ابا میاں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان کا نائٹ گاؤن، ابھی تک ان کی رائٹنگ ٹیبل کے پاس کرسی کی پشت پر پھیلا ہوا ہے۔

باورچی خانے سے اماں کی چوڑیوں کی کھنک سنائی دیتی ہے۔ اس کی حرارت میں، اماں کی محبت کی گرمی شامل ہے۔ مزیدار کھانوں کے ساتھ، اماں کا پیار بھرا اصرار یاد آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی میرے دِل کو مٹھی میں لے کر مسل رہا ہے۔

سرمد کی بائیک لگتا ہے ابھی پورٹیکو میں آ کر رُکے گی۔ لابی میں داخل ہوتے ہی وہ نعرہ لگائے گا۔ ''لڑکیو۔۔۔کدھر ہو؟''

(میں تو یہیں ہوں بھائی۔۔۔آپ کہاں ہیں؟ دِکھائی کیوں نہیں دیتے؟)

سہ پہر کی چائے کی گہما گہمی۔۔۔اللہ رکھی باجی کی پیار بھری ڈانٹ، چاچا فیروز اور اللہ رکھی باجی کے درمیان، بیچ بچاؤ کراتے ہوئے آئمہ کی نہ رُکنے والی ہنسی، ہارسنگھار کی نارنجی اور سفید کلیاں، جو رات بھر ٹپ ٹپ گرتی رہتیں اور صبح، آئمہ انھیں اپنی جھولی میں سمیٹ لاتی، اب بھی آنگن کو مہکائے رکھتی ہیں لیکن آئمہ دُور دیس سدھار گئی۔

ہم جنھیں پیار کرتے ہیں۔ وہ کبھی، ہم سے الگ نہیں ہوتے، ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ہمارے بہت قریب۔۔۔

ے کوئی تو آئے رین اندھیاری
مہک سے بوجھل، کاری کاری
میرے سنگ ہو میت مرا
پھر برسے گھنگھور گھٹا

یہ کیسا دھیان آیا ہے؟ ایک چاہت بھری نظر۔۔۔ایک میٹھا بول۔۔۔جیسے اس کے نرم ہاتھوں نے میرے آنسو پونچھ ڈالے، جیسے بھولے بسرے ساتھی کے ہونٹوں نے مجھے چھو کر تنہائی کا زہر پی لیا، جیسے اس نے میرے دِل کے بند کواڑوں پر دستک دی ہے۔

☆

ے ایک بار مِل جائے
ہاتھ تھام لے آ کر
صرف ایک لمحے کو
کیسی ہو گی وہ ٹھنڈک
میرے پیاسے ہاتھوں پر
اس کے لمس کی ٹھنڈک
سارا درد ڈھل جائے

یہ جو جان سلگتی ہے
اس کو چین آ جائے
دِل کے زخم کچے ہیں
دِل سدا کا ضدّی ہے

پر وہ مسافر تو گیا۔۔۔نہ کوئی نقشِ کفِ پا نہ کوئی اس کا نشان۔۔۔بس ذہن میں چبھتی ہوئی بے وفائی کی پھانس اور دُکھتا ہوا من۔۔۔

(طلاق کے بعد اس کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے، وہ غیر مرد ہے۔۔۔ ہاں! میں گناہ گار ہوں۔۔۔لیکن لوک لاج اور رُسوائی کا ڈر)

میں تو چاہتی ہوں یہ دِل سرد ہو جائے۔۔۔میری آنکھوں میں اس کی صورت دُھندلا جائے۔۔۔اس کے عشق کی لو، کجلا جائے اور میں اسے یاد نہ کروں۔۔۔لیکن میرے دِل نے کب میری مانی ہے، نہ اس کی آس ٹوٹتی ہے نہ حوصلہ جواب دیتا ہے۔

اب ہم میں اِتنی دُوری ہے کہ یقین نہیں آتا، کبھی ہم قریب بھی رہے ہوں گے۔ تمہارا اور میرا ساتھ اِک سراب۔۔۔اِک خواب یا سفید جھوٹ۔۔۔اب نہیں ہے۔۔۔کیا کبھی تھا؟ تم مجھ سے ایسے دُور ہوئے کہ تمہاری ہر ہر چاپ میں میلوں کی دُوری ہے۔

تمہارے ہونے کا احساس، ہر دم گیتی اور ویرو کی شکل میں، میرے ساتھ رہتا ہے۔۔۔صبح۔۔۔لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔۔۔خیالوں میں۔۔۔خوابوں میں۔۔۔

۔۔۔اب تم سے محبّت کا تعلق تو نہیں، پھر بھی نفرت مجھے تم سے رابطے میں رکھتی ہے اور زندگی کو خلوت نہیں بننے دیتی۔ میں نے شدّت سے تمہاری محبت کو اپنی پور پور میں محسوس کیا، جیسے جب بادل گھر کر آئیں اور اتنے نزدیک ہوں، کہ چھولیں تو پوریں سات رنگوں میں رنگ جائیں۔

میں تو پیار رنگ میں سر سے پاؤں تک بھیگ گئی۔

میرا اپنا رنگ تو کہیں چھپ گیا، لیکن تمہاری محبت کا رنگ کچّا تھا، اُترا تو مجھے بدرنگ کر گیا۔۔۔میری سادگی پر تمہاری محبت اور نفرت کے ملے جلے دھبّے۔۔۔میری اپنی چمک ماند پڑ گئی۔ میری توقعات لٹیں، میری کائنات لُٹی، میرے ماضی کی قندیلیں، بجھتے چراغوں میں بدل گئیں۔ کسے الزام دوں؟ تمہاری بے وفائی کو؟۔۔۔اپنے ادھورے پن کو؟۔۔۔یا دوسروں کی ان کوششوں کو جن میں تم برابر کے شریک تھے؟

تمہارے ہوتے ہوئے، بہت سے مواقع پر، تمہاری کمی بے طرح محسوس ہوئی اور ہاں بارہا 'زیادتی' بھی۔

میں نے تمہاری محبت میں تمہارا ہجر گزارا ہے۔

میں شیما ہوں۔۔۔میں سسّی ہوں۔۔۔بے خبری۔۔۔میرا بھنبھور لٹتا رہا اور میں انجان رہی۔ تھل میں تیز آندھیاں چلیں اور نشانِ منزل تو کیا راستے ہی گم ہو گئے۔ چلچلاتی دھوپ میں میرا رنگ رُوپ جل گیا اور میں دانتوں تلے زبان دبائے تپتی ریت میں ہانپتی رہی۔۔۔کانپتی رہی۔ میری اوڑھنی لیر لیر ہو گئی کہ اس سے سایہ مانگتی۔۔۔ابر کا کوئی ٹکڑا نہیں کہ سائبان بنتا۔ جاؤں تو کدھر جاؤں؟ کہوں تو کس سے کہوں اور کیا کہوں؟ اپنے کم تر ہونے کا قصّہ کسے سناؤں؟ اپنی تذلیل کے گیت کیسے گاؤں؟ اپنی ہجو، خود ہی کیسے

لکھوں؟۔۔۔زیاں کا احساس تو ہے ہی 'شماتتِ ہمسایہ' کا نشانہ کیسے بنوں؟

میں سمجھتی تھی، جب بھروسوں کا نگر لٹا، جب وشواس کی ڈور ٹوٹی تو میرے بہتے ہوئے آنسوؤں نے اس نقش کو مٹا ڈالا جو میری لوحِ دل پر تمہاری چاہت نے بنایا تھا لیکن میں جہاں بھی جاؤں، جہاں بھی رہوں، تمہاری یادیں میرے ساتھ ساتھ ہیں۔ مصروفیت میں دِن تو گزر جاتا ہے لیکن شام ہوتے ہی مَیں بکھر جاتی ہوں۔ کیونکہ نظیف ہارون۔ یہ طے ہے کہ محبت دراصل تم نے نہیں، میں نے کی تھی، جبھی تو محبتوں کے شہرِ بے چراغ کی اندھیری گلیوں میں پیاپے رواں، دریدہ دامنِ دِل لیے آبلہ پا گھوم رہی ہوں۔ میرا تم سے کوئی رابطہ نہیں۔ (ہو بھی نہیں سکتا۔) لیکن دِل میں یادوں کی بھیڑ سی لگی ہے اور میں تنہا ہو ہی نہیں پاتی۔

کریں گے ترکِ تعلق یہ تم سے وعدہ رہا
بدن سے سانس کا رِشتہ تو ٹوٹ جانے دو

میں چاہتی ہوں، تن من میں آگ لگانے والے ان آنسوؤں کو نہ روکوں۔۔۔ بہہ جانے دوں کہ آنکھ روتی نہیں پھر بھی نم ہے۔ دُکھ کی سرسوتی بہتی ہے لیکن سیراب نہیں کرتی۔ بنا بارش بھی درد کی ست رنگی دھنک کمان تنی ہوئی ہے۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں
تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

کمرے میں ماند ماند اُجالا ہے۔ کھڑکی پر دستک دیتی بوندیں، سانسیں بھرتی خاموشی اور پپیہا من سے 'پی کہاں' کی اُٹھتی ہوئی ہوک۔ میرا دِل بھید بھری چپ سے بوجھل ہے۔ تمہارے بِن زندگی کو کھینچتے کھینچتے، کتنے یگ بیت گئے۔ نیند مجھ سے خفا ہے۔ دُکھ کی اَمربیل میری رگوں سے زندگی چوس رہی ہے۔ میں تپتی دھوپ میں جلتے ٹیلے پر کھڑی ہوں۔

تم سے بچھڑتے وقت میں نے سوچا تھا کہ تمہیں بھول جاؤں گی تو مجھے قرار مل جائے گا لیکن میں بھول گئی کہ مجھے تمہیں بھولنا ہے۔ نہ بھول پائی، نہ قرار ملا۔

'کیونکہ عشق موت کی مانند زبردست ہے۔' (بائبل)

OO

آسٹریلیا

اپیا، میری جان!

آپ کیسی ہیں؟ گیتی اور ویرو کیسے ہیں؟ ماسی کو یاد کرتے ہیں؟ میں آپ کے لیے، اُداس ہو جاتی ہوں تو فرید اور خالہ جان میرا بہت حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ خالو جان بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اِرم کے ساتھ گپ شپ میں وقت بہت اچھا گزرتا ہے، لیکن اپیا! ہم لوگ کیسے بکھر گئے ہیں، بچھڑ گئے ہیں۔ صرف تین سالوں میں۔۔۔ صرف تین سالوں میں ہم نے کیا کیا کھو دیا؟ سوچتی ہوں تو دل پھٹتا ہے۔ زور زور سے چیخنے کو دل چاہتا ہے۔ پر اس سے کیا حاصل ہوگا؟ فرید کی محبت اور خالہ جان کی شفقت کا خیال کرتے ہوئے خود کو سنبھالتی ہوں، لیکن آپ کے پاس تو کوئی شانہ بھی نہیں جس پر سر رکھ کر رو لیں۔ چاچا فیروز، باجی اللہ رکھی، نصیباں خالہ، نگار آپی، سب غیر ہیں۔۔۔ لیکن اپنے ہیں۔ مجھے ان کا سوچ کر آپ کی جانب سے تسلّی ہو جاتی ہے۔

کالج، کیسا جا رہا ہے؟ یہ بہت اچھا ہے کہ آپ کے پاس مصروفیت ہے۔ میں بھی فرید کے کام میں ہاتھ بٹانے لگی ہوں۔ Interior Decoration کا کام دلچسپ ہے اور فرید کی دوسراہٹ میں اور بھی اچھا لگتا ہے۔

تایا ابا کا فون آتا رہتا ہے۔ وہ آپ کے ساتھ بھی مسلسل رابطے میں ہیں۔ ضعیفی کے باعث آ تو نہیں سکتے، پھر بھی ان کا دم غنیمت ہے کہ آپ کے سر پر کوئی بزرگ تو ہے۔

گیتی اور ویرو کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟ انہیں بہت پیار کیجیے گا۔ اسی ماہ ایک صاحب پاکستان جانے والے ہیں، ان کے ہاتھ بچّوں کے لیے کچھ تحائف بھیجوں گی۔

خالو جان اور خالہ جان بہت پیار کہہ رہی ہیں۔ فرید کہہ رہے ہیں کہ لکھو، بہت سا

پیار، اسی طرح جیسے سرمد آپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کیا کرتا تھا۔

اپنے شب و روز کے بارے میں لکھیے گا۔

ہر وقت آپ کے پاس

آئمہ

شیما نے جواب لکھا۔

اپنے شب و روز کیا لکھوں۔

"بس ایسا ہے جیون۔۔۔ ☆
جیسے گھر بھر میں پھیلی چپ
جیسے دھول جمی شیشوں پر
جیسے راکھ کے اڑتے ذرّے
جیسے گیت کے بکھرے پنّے
جیسے گلے میں چبھتے آنسو
جیسے اپنے دل کی دھڑکن
جیسے پوس کی دھوپ اکیلی
جیسے سُونا سُونا آنگن
جیسے تن میں چھپا سناٹا
جیسے جاتے دن کی اداسی
جیسے آتی رین کا دھڑکا

بس ایسا ہے جیون،

اور پھر اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔

دوسرا خط لکھا۔

ہم سب خیرت سے ہیں۔تم سب لوگوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔تم میرے بارے میں فکر مند نہ ہوا کرو۔سب کے ساتھ ہونے سے دن بہت مزے سے گزر رہے ہیں۔

OO

''مانی، دِل بہت اُداس ہے۔طبیعت اتنی بیکل ہے کہ میں ٹھیک سے سو ہی نہیں پاتی۔سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔دِل چاہتا ہے اُتار کر رکھ دوں۔کیا ایسا نہیں ہوسکتا، کہ کوئی جگہ ایسی ہو، جہاں اس سب سے نجات مِل جائے؟''

شیما پریشان تھی۔

''شیما رانی، یہ گھبراہٹ بلا وجہ تو نہیں ہے، لیکن اب کیا کریں؟ بس حوصلہ ہی ہے جتنا کرلو۔''

''مانی، جب کوئی کہتا ہے کہ حوصلہ کرو، تو مجھے بہت چڑ آتی ہے، یہ حوصلہ ہی تو ہے کہ زندہ ہوں، ورنہ دُکھوں کے انبار نے تو مجھے اَدھ موا کر دیا ہے۔''

''اچھا، شیما رانی، چھوڑو اِس ذِکر کو، لاؤ میں تمہارے سر میں تیل ڈال دیتی ہوں، سکون ملے گا۔''

''تھوڑی دیر ٹھہر جائیں خالہ، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔میں شیما کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ساتھ ساتھ باتیں کریں گے۔'' اللہ رکھی، خالہ نصیباں کی باتیں بہت شوق سے سنتی تھی۔وہ پُرانے قصّے لے کر بیٹھ جاتیں تو اللہ رکھی کا ان کے پاس سے اُٹھنے کو ہی دِل نہیں چاہتا تھا۔

چائے ختم کر کے، نصیباں نے، شیما کے سر میں تیل ڈالنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگی۔شیما بھی، نصیباں کی داستان گوئی سے متاثر تھی۔

''میں تم لوگوں کو ایک مزے کی بات سناتی ہوں۔ایک دفعہ ارشد کے ابّے کے صاب، اپنی بیگم صاب کے ساتھ ہمارے گاؤں میں شکار کھیلنے کے لیے آئے۔بیگم صاب تو گھر پر رہیں۔صاب کو لے کر ارشد کا ابا نہر پر چلا گیا، وہاں شام کو مرغابی آ کر اُترتی تھی۔''

نصیباں آہستہ آہستہ شیما کے سر میں مساج کر رہی تھی۔شیما کو بہت مزا آ رہا تھا۔

''بیگم صاب رات تک تو خوش رہیں۔میرا گھر بہت 'پسند' کیا۔میں گھر کو بہت صاف ستھرا رکھتی تھی۔اس بات سے بہت خوش ہوئیں۔میرا سوہرا بھی بہت خوش ہوتا تھا، جب میں اسے روٹی کھانے کے لیے بلاتی تھی تو وہ کبھی جوتا پہن کر 'چونترے' پر نہیں آتا تھا۔میں کہتی بابا! یہ کیا؟ تو کہتا دھیئے تو نے تو اسے لیپ پوت کر اتنا چکا دیا ہے کہ 'بنا شک' اس کے اُوپر رکھ کر روٹی کھالوں وہ میرے کاموں کو بہت 'وڈیاتا' تھا۔ارشد کے ابّے کو کہتا اپنی گھر والی کی قدر کیا کر۔اس نے تو ہمارے ٹبر کا منہ دھو دیا ہے۔میری ساس کہتی، یہ ہے ہی بڑی بی بی دھی۔اللہ اسے بہت بھاگ لگائے گا۔''

نصیباں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''میں نے سارا گھر لیپ کر دروازوں کے اُوپر 'مراب' پر رنگ دار بیلیں بنائی تھیں۔۔۔گلابی پھول اور ہرے پتے اور ساتھ شیشے۔بیگم صاب کو وہ بہت 'پسند' آئے۔میں نے اپنے سوٹوں پر کڑھائی کی تھی، وہ دیکھے اور کہنے لگیں میں کپڑا لے کر بھیجوں گی ان پر بھی بیل بنا دینا۔میں نے کہا جی کپڑا تو میں غریبو غریبی لے لوں گی، پر شاید آپ کو 'پسند' نہ آئے۔آپ کپڑا بھیج دینا میں کڑھائی کردوں گی شیشوں کا کہیں گی تو وہ بھی لگا دوں گی۔

پھر گاؤں کی عورتیں ان سے ملنے آ گئیں۔ان سے باتیں کرتی رہیں لیکن جب رات زیادہ ہوگئی تو وہ پریشان ہوگئیں۔اصل میں صاب کی گاڑی خراب ہوگئی تھی، جس کا ہمیں بعد میں پتا چلا۔

اب بیگم صاب 'ویہڑے' میں پھرتی جائیں اور کہتی جائیں۔

''جانی، تم کہاں رہ گئے ہو۔۔۔ جانی۔۔۔ اب آ بھی جاؤ میں بہت پریشان ہو رہی ہوں۔''

میرا سوہرا ان کی طرف دیکھ کر 'گھابر' گیا۔

سوچنے لگا یہ کس جانی کو آوازیں دے رہی ہیں؟

ایک جانی، تو ہمارے گاؤں کے نائی کا 'منڈا' ہے۔ پر وہ تو اب شہر چلا گیا ہے۔ دوسرا جانی فقیر تھا، جو پچھلے دنوں مر گیا ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ ہو نہ ہو یہ جانی، ضرور بیریوں والے بابے کا جوائی ہے۔ لو جی ہمارا بابا اس کے گھر گیا۔ وہ سارے سو رہے تھے۔ بابے نے دروازہ کھڑکایا اور کہنے لگا۔

''اوئے جانی۔۔۔ سوہری دیا۔۔۔ باہر نکل۔۔۔ ہماری بیگم صاب تجھے آوازیں دے رہی ہیں اور تو یہاں 'گھوک' سویا پڑا ہے۔'' بابے نے اس کے منہ سے کھیسی اُتاری تو وہ کالی عینک لگا کر سویا ہوا تھا۔

بابے نے پوچھا ''اوئے، یہ کیا؟''

تو وہ کہنے لگا ''بابا، دِن میں تو شریک لگانے نہیں دیتے۔ میں نے سوچا، رات کو لگا لیتا ہوں۔''

پھر جب بابا اسے ساتھ لے کر گھر آیا تو صاب آ چکے تھے اور بیگم صاب ان سے کہہ رہی تھیں:

''جانی۔۔۔ تم نے بڑی دیر کر دی۔۔۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی تھی۔''

''اب تو بابا بڑا 'کچا' ہوا۔۔۔ جاتے ہوئے ان سے مِلا بھی نہیں۔ بس بستر میں سوتا پڑا بن گیا۔''

شیما کو مساج اور نصیباں کی باتوں نے بہت مزا دیا، وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی اور دِل کھول کر ہنسی۔

''وہ تو فیم نے میرے سوہرے کی مت مار دی تھی، ویسے تو بڑا سیانا تھا۔'' نصیباں پھر سے شروع ہو گئی۔

''جب بے بے کی بھتیجی کی جنج آئی تو روٹی 'تھڑ' گئی۔ 'ویلا' تو کسی طرح 'ٹپا' لیا، پھر سارے مِل کر بیٹھے کہ ایسے کیوں ہوا؟ ستر بندے بلائے تھے، ستر ہی آئے۔ نائی نے روٹی بھی پوری سے زیادہ ہی پکائی تھی۔ لیکن جب حساب لگایا تو پتا چلا کہ جنج میں چالیس بندے تھے اور تیس مولوی۔۔۔ بابا کہنے لگا۔

''روٹی تو 'تھڑنی' ہی تھی۔ ایک رجا ہوا مولوی ایک 'بھکھی مجھ' سے زیادہ کھاتا ہے۔ انھیں بتانا چاہیے تھا کہ کتنے بندے آئیں گے اور کتنے مولوی۔''

''گاؤں میں سب کو پتا تھا کہ بابا 'فیم' کھاتا ہے لیکن کوئی بھی اسے 'فیمی' نہیں سمجھتا تھا۔ سارے اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ تھا بھی بڑا 'گل کار' اور سمجھدار۔''

وہ تھوڑی بہت حکیمی بھی کر لیتا تھا۔ کھانسی والے کو خود چیزیں مِلا کر جوشاندہ بنا کر دیتا تھا۔ دِن رات لوگ اس سے جوشاندہ بنوانے آتے، اس کی پیٹ درد کی پھکّی بھی بڑی جلدی اثر کرتی تھی۔ وہ لوگوں کو بتاتا تھا کہ 'مچھی' کھانے کے بعد دودھ نہیں پینا چاہیے۔ اس سے پھلبہری ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ سال میں کم سے کم پانچ جامنیں ضرور کھانی چاہئیں۔ پیٹ میں اگر کوئی بال چلا جائے تو وہ گل جاتا ہے۔''

نصیباں، بابے کے 'فارماکوپیا' سے نسخے بتا رہی تھی۔

(اور اگر دِل میں بال آ جائے تو کتنی جامنیں کھانی چاہئیں؟ کاش بابا ہوتا تو اس کا بھی علاج بتاتا۔ شیما نے سوچا)

OO

شیما کی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ اس دوران، اس کا گھر چھوٹا، امّاں ساتھ چھوڑ گئیں، آئمہ کو رخصت کیا اور اب وہ ان 'اپنوں' کے ساتھ جو دنیا کی نظر میں 'بیگانے' تھے،

حالات کے جبر سے نبرد آزما تھی۔ جب کبھی وہ کوئی ناول پڑھتی یا فلم دیکھتی، جس میں ہیروئن ایسے پے در پے صدمات اور مسائل کا سامنا کرتی دکھائی جاتی تو اسے خیال آتا تھا کہ یہ سبھی معاملات کیا اسی خاتون کے 'انتظار' میں تھے؟ یہ ناول نگار اور ہدایت کار حضرات بھی حد کرتے ہیں!۔۔۔ اور اب جب وہ خود پر نظر ڈالتی تو سوچتی، 'کیا واقعی میں اس سب سے گزر چکی ہوں؟'

اس وقت وہ پچھلے برآمدے میں بیٹھی ناشتہ کرنے کے ساتھ ساتھ، اخبار دیکھ رہی تھی۔ خبر تھی کہ مختلف زنانہ کالجز کی چھتیس لیکچررز، جنہوں نے ڈائریکٹ سلیکشن کے لیے امتحان دے رکھا تھا، کو کامیاب قرار دے کر بطور اسسٹنٹ پروفیسر مختلف کالجز میں تعینات کر دیا گیا ہے۔ شیما نے بے تابی سے خبر پڑھی اور لسٹ پر نظر ڈالی، اس کا نام بھی لسٹ میں شامل تھا اور اپنے ہی شہر کے انٹر کالج میں بطور پرنسپل آرڈر بھی ہو گئے تھے۔ نگار کا نام، بھی لسٹ میں تھا اور وہ بھی اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر ٹرانسفر کر دی گئی تھی۔ شیما کے دل میں خوشی کی لہر اٹھی اور اطمینان کی سکون بخش کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

(ہوں۔۔۔ تو اب 'ہیروئن' کے ساتھ، کچھ اچھا بھی ہونے جا رہا ہے) وہ اور نگار پھر سے اکٹھی ہوں گی، نگار اس کی بہت پیاری دوست ہے، ایسی دوست جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتی ہے، جو اس کی بات سنتی ہے، جس کی خوبصورت موجودگی کو، وہ محسوس کر سکتی ہے، جو اس کے لیے پرسکون اور بامعنی خوشی کا پیغام لاتی ہے۔ اس کے ساتھ مل کر شیما نے بہت مزے کا وقت گذارا تھا۔ ہنسی مذاق، مل کر غزلیں سننا، لائبریری سے ڈھیروں کتابیں لا کر پڑھنا اور ان پر تبصرے، پھکڑ بازی۔۔۔ جس میں نگار کا کوئی ثانی نہیں۔ وجہ۔۔۔ بے وجہ دانتوں کی نمائش۔۔۔ اور پھر جب شیما کی زندگی نے خوفناک پلٹا کھایا تو نگار نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے اس کے ساتھ آنسو بھی بہائے تھے اور اسے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی ہمت بھی دلائی تھی۔ اب وہ پھر ساتھ ہوں گی۔ شیما نے سوچا کہ وہ اسے اپنے

ساتھ ہی رہنے کو کہے گی۔ 'اپنا' گھر ہوتے ہوئے وہ کیوں ہاسٹل میں رہے؟

شہلا کا 'ڈرم سولجر' آناً فاناً آیا اور اسے بیاہ کر آسٹریلیا لے اڑا تھا۔ تو یہ ٹرانسفر کروا کر اپنی 'ہوم ڈسٹرکٹ' سدھاری تھی۔ لیکن دونوں ہی، اس کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھیں۔

''میں اپنی دوستوں کی طرف دیکھتی ہوں اور پھر اپنی طرف۔۔۔ ان کے بغیر میں کہاں ہوتی؟۔۔۔ میری دوست، میری ساتھی، میرے سائے، میری دنیا۔۔۔ میرے آنسو، میرے قہقہے'' شیما خود کلامی کر رہی تھی۔

''خدا کا شکر ہے، اب میں اپنے شہر میں ہی رہوں گی۔ جس کے کوچہ و دیوار سے اپنائیت جھلکتی ہے۔ اپنے گھر میں۔۔۔ جس میں میرے پیاروں کی خوشبو رچی ہے۔ جس میں میرے بچّے، چاچا فیروز، اللہ رکھی باجی اور نصیباں خالہ میرے ساتھ ہیں۔''

شیما نے اٹھ کر ایک پورا چکر اپنے گھر کا لگایا۔ گیتی لان میں گھر بنا کر کھیل رہی تھی۔

(عورت کے خمیر میں خدا نے کیا ملایا ہے کہ پیدا ہوتے ہی گھر بنانے لگتی ہیں؟ شیما نے سوچا۔)

اس کے پاس ہی چاچا فیروز، اونچی آواز میں تلاوت کر رہے تھے۔ انہیں خبر سناتے ہوئے شیما کی آواز بھرّا گئی۔ چاچا فیروز نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ وہ بھی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ، سرخ تھا اور آنسو، خاموشی سے گالوں پر ڈھلک آئے تھے۔ ابا میاں کے جانے کے بعد، چاچا فیروز کے انداز میں ابا میاں کا ہی رنگ جھلکنے لگا تھا۔ وہ روزانہ رات کے کھانے کے بعد، تھوڑی دیر کے لیے لاؤنج میں آ کر بیٹھتے، اس سے باتیں کرتے، روزمرہ کے کاموں سے آگاہ کرتے تو شیما کو محسوس ہوتا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس کے سر پر شفقت بھرا سایہ موجود ہے۔ گھر کے سبھی افراد نے چاچا فیروز کو بہت عزّت اور محبّت دی تھی۔ اب شیما اکیلی، سب کی کمی پورا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ تایا ابا کے ساتھ ساتھ، وہ اس کے بزرگ تھے اور چاچا فیروز کی

شفقت بھی، اس کے لیے بے حساب تھی۔

اس کے بعد، وہ نصیباں خالہ اور اللہ رکھی باجی کے پاس چلی آئی۔ نصیباں خالہ، تسبیح کر رہی تھیں اور اللہ رکھی باجی، کچن کا کام نپٹانے کے بعد، تسلّی سے بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ شیما نے ان لوگوں کو خوش خبری سنائی تو نصیباں خالہ نے اس کے ماتھے پر پیار کیا اور ساتھ ہی شکرانے کے نوافل ادا کرتے ہوئے، سجدے میں چلی گئیں۔

اللہ رکھی باجی، اسے اپنے ساتھ لپٹائے، ہنستی چلی جا رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ، آنسو زور شور سے بہہ رہے تھے۔ چمکیلی دھوپ میں موسلا دھار بارش۔۔۔ عجب سماں پیش کر رہی تھی۔

OO

شیما خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ہلکا ہلکا بخار اور جسم میں درد تھا۔ ویرو اور گیتی، سکول سے آ چکے تھے۔ اللہ رکھی نے ان کا یونیفارم تبدیل کروا کے کھانا دے دیا تھا۔ لیکن شیما بغیر کچھ کھائے پیئے کمبل میں منہ دیئے، بستر میں پڑی تھی۔ ویرو نے اس کے ماتھے کو ہاتھ لگایا۔

''ماما۔۔۔ آپ کو بخار ہے کیا؟ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں؟ آپ نے ڈاکٹر کو دِکھایا؟۔۔۔ دوا لی؟۔۔۔ نہیں لی نا! ماما آپ ایسے کیوں کرتی ہیں؟ کالج سے تھکی ہوئی آئی ہیں اور کچھ کھایا بھی نہیں۔ میں مانی سے کہتا ہوں کہ وہ آپ کو کھانا دیں۔''

ایک ہی سانس میں وہ اِتنی باتیں کر گیا کہ شیما کو ہنسی آ گئی۔ وہ خوش تھی کہ ویرو اِتنا خیال رکھنے والا بچّہ ہے۔۔۔ اس کا عصائے پیری۔۔۔

''نگار ٹھیک کہتی ہے، میری زندگی میں بہت کچھ ہے۔ مجھے اس کی قدر کرنا چاہیے۔ ان حالات سے گزرنے والی آخر میں اکیلی تو نہیں۔ بہت سی اور خواتین بھی اسی راہ گزر پر چل رہی ہیں۔ لیکن ان مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے، میرے پاس بہت کچھ ہے۔ اِتنی محبتیں

کھو دینے کے بعد بھی، میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ گیتی اور ویرو ہیں۔ میرے بچّے۔۔۔ میرے جگر کے ٹکڑے۔ آئمہ سات سمندر پار بیٹھی بھی میرے لیے فکرمند ہے اور وہ بھی اکیلی نہیں۔۔۔ فرید اور باقی سب گھر والے بھی اور تایا ابا، چاچا فیروز، اللہ رکھی اور مانی، کتنی محبت کرنے والے لوگ ہیں، ثوبیہ، نگار اور شہلا میری سہیلیاں، میری کولیگز، جاننے والے۔۔۔ شاعری۔۔۔ پرانے گیت اور کتابیں۔ مالی لحاظ سے مجھے کوئی مشکل نہیں ہے۔ مصروفیت ہے۔ اتنی کہ کسی روز تو مجھے اپنے بارے میں سوچنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔''

وہ ہمت کر کے بستر سے باہر آئی تو نصیباں اس کے لیے انڈے کا حلوہ اور جوشاندہ کی پیالی لیے چلی آ رہی تھی۔ شیما آہستگی سے چلتی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ گرم گرم حلوہ بہت مزے کا تھا اور گلے سے اُترتا ہوا آسودگی کا احساس دِلا رہا تھا۔ وہ جوشاندے کی چسکیاں لے رہی تھی تو نصیباں نے آہستہ آہستہ اس کا سر دبانا شروع کر دیا۔ شیما نے ان کے نرم نرم ہاتھ چوم لیے تو انھوں نے اس کا سر اپنے ساتھ لگا لیا۔ محبت کی گرم مہک نے اسے سرشار کر دیا۔

''نصیباں خالہ، آپ کے ہاتھ میں مزہ بہت ہے۔''

نہیں شیما رانی، یہ تو کچھ بھی نہیں، جو مزہ میری بے بے کے ہاتھ میں تھا، یہ تو اس کے پاسنگ بھی نہیں۔ برسات کے دِنوں میں جب بادل نیچے تک آ جاتے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی اور آم کے درختوں میں چھپی ہوئی کوئل بہت شور مچاتی تو بے بے موسم کا رنگ دیکھتے ہی کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ ساری چھتیں دیکھتی، جہاں سے چھت نرم لگتی وہاں مٹی ڈال کر کوٹتی۔ ایندھن باہر سے اُٹھا کر کوٹھڑی کے کونے میں ڈال دیتی۔ میں سارے صحن میں جھاڑو لگاتی تا کہ بارش ہو تو صاف ستھرا لگے۔ میرا سوہرا ہمیں یہ سب کرتا دیکھتا رہتا، پھر بے صبرا بن کر کہتا:

''دھیئے، اپنی ماں سے کہہ، کچھ کھانے کی بھی فکر کرے، موسم بن رہا ہے۔''

میری ساس ہنستی۔

''فوجی کے ابا تجھے اور کسی بات کی تو فکر نہیں ہے کھانے پینے کا کیسے یاد رہ جاتا ہے۔''

گھر میں ہمیشہ دو 'لیاری' (دودھ دینے والی) بھینسیں بندھی ہوتی تھیں۔ بے بے تھوڑے سے چاولوں میں ڈھیر سارا دودھ ڈال کر کھیر چڑھا دیتی پھر گُڑ کے شربت میں آٹا گھول کر پوڑوں کے لیے تیار کرتی۔ ریحانہ بھاگ کر پیپل کے پکّے پکّے پتے، توڑ لاتی اور انھیں دھو کر سوکھنے کے لیے بچھا دیتی۔

اتنے میں چھینٹیں پڑنے لگتیں تو بے بے توا رکھ دیتی، توے پر دیسی گھی لگاتی اور گڑ کے شربت میں گھلا، آٹا ڈال کر، پیپل کے پتّے کے ساتھ پھیلا دیتی۔ پتلا، نرم، لس لس کرتا پوڑا پک کر لال اور سنہری رنگ کا ہو جاتا۔ ساتھ میں پھیکی کھیر کی کٹوری رکھ کر میں بابے کو دیتی تو وہ جھٹ سے کہتا:

''دھیئے پہلے ارشد اور ریحانہ کو دے۔''

میں کہتی ''نہیں بابا پہلے تیرا حق ہے۔''

بابا منہ میں بُرکی ڈالتا اور بے بے کی طرف دیکھ کر کہتا:

''بھاگ و نتیئے، تیرے ہتھ کا مزا ہی اور ہے۔''

بے بے سب سے آخر میں اپنا پوڑا پکاتی، پہلی بُرکی منہ میں ڈالتی اور کہتی:

''میرے فوجی کے لنگر میں آج نہ جانے کیا پکا ہوگا؟''

''شیما ویسے میری ساس کے ہاتھ کا مزا واقعی اور تھا۔ وہ کھوہ پر جاتی اور دیسی ٹینڈے توڑ کر لاتی۔ چھوٹے چھوٹے لوے لوے (نرم نرم) انگوری رنگ کے ٹینڈے اور ان کے اُوپر ہلکا ہلکا رواں۔ دِل چاہتا تھا کہ کچے ہی کھا جاؤ۔ ان کے دو دو ٹکڑے کرتی اور مرچ مصالحہ ڈال کر چڑھا دیتی اور پکتے میں کٹوری بھر مکھن ڈال کر دم پر لگا دیتی۔ پھر پتلی

پتنگ روٹی پکاتی جس میں 'چوگے' (چھوٹے چھوٹے گڑھے) پڑے ہوتے۔ اس پر تازہ مکھن چپڑ کر جب چھابے میں رکھتی اور اُوپر ٹینڈوں کا لون (سالن) ڈالتی تو اس کی خوشبو سے بھوک اور بڑھ جاتی۔''

نصیباں آہستہ آہستہ شیما کا سر سہلاتی جا رہی تھی۔

ارشد کا ابا چھٹی پر آتا تو بے بے سے روز فرمائش کر کے کھانے پکواتا۔ ناشتہ چُوری کا کرتا۔ بے بے روٹی پکا کر اسے چُور کرتی اور اس میں مکھن اور نویں (نئی) سنہری اور خوشبودار شکر مِلا کر اس کی چھوٹی چھوٹی 'پنیاں' (گولے) بنا دیتی۔ بچوں کو ان کی کٹوریوں میں رکھ دیتی۔ بابے اور ارشد کے ابّے کے لیے چھوٹے تھال میں رکھتی اور ساتھ گرم گرم دودھ کے چھنّے (دھات کے پیالے) پکڑا دیتی۔

ارشد کا ابا کہتا:

''بے بے، میرے بابے کو تو روز بنا دیا کر۔ یہ افیم تو خون نچوڑ لیتی ہے۔''

بے بے ہنستی ''تو یہ 'غذا' اِس کو کس حکیم نے بتائی ہے؟''

بابا شرمندہ سا ہو جاتا۔

''اَب لگ جو گئی ہے۔۔۔ مر کر ہی چھوٹے گی۔''

نصیباں کے سر دبانے اور باتوں کے دھیان میں لگ کر شیما خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن جلد ہی اس کا انہماک ایک چیختی ہوئی آواز نے توڑ دیا۔

یہ گیتی تھی۔

''ماما، آدھا دِن تو آپ کالج میں گزار آتی ہیں اور باقی کا دِن مانی سے پیار کرنے میں۔ میرے لیے آپ کے پاس وقت ہے یا نہیں؟ پتا نہیں آپ کیسی ماں ہیں؟ میرا تو آپ کو خیال ہی نہیں۔''

''گیتی بیٹا۔۔۔ ماں کے ساتھ ایسے بات نہیں کرتے۔''

نصیباں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ چپ کریں۔۔۔اور میں کیوں نہ کروں ایسے بات؟۔۔۔میری سب دوستوں کی، ماما اتنی اچھی ہیں لیکن یہ تو نہ جانے ایسی کیوں ہیں؟ کیا کرتی ہیں یہ میرے لیے؟۔۔۔کیا کیا ہے انھوں نے میرے لیے؟"

گیتی نہایت بدتمیزی سے چلّا رہی تھی۔

"بیٹا یہ آپ کیسی بڑی بڑی باتیں کر رہی ہیں۔ بچے تو ایسے بات نہیں کرتے۔"

"ہاں۔۔۔لیکن میں بچّی نہیں ہوں۔۔۔میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ نے مجھے میرے بابا سے الگ کر دیا آپ ہیں ہی ایسی۔"

(بیٹا میں تمہیں کیا بتاؤں؟ کیا سمجھاؤں؟ تم بھی مجھے ہی قصوروار سمجھتی ہو۔۔۔میں کیا کروں۔۔۔خدایا۔۔۔میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا، جو میں نے نہیں کیا؟ تم ہی کیا، تمہاری تین نسلوں نے مجھ سے یہی سوال کیا ہے لیکن اس کے جواب میں کچھ کہنے کی، نہ اُس وقت مجھ میں تاب تھی اور نہ اَب مجال اور طاقت۔ کبھی خود پر، کبھی اپنی بے بضاعتی پر، کتنا کتنا روئی ہوں۔ میں نہ اچھی بہو تھی نہ بیوی اور اب ماں بھی؟ کیسے کہوں کہ میں نے یہ سب رِشتے، خلوصِ دِل سے نبھائے۔۔۔جو کچھ ان رِشتوں کے حوالے سے کیا جاسکتا تھا، کیا۔ لیکن کبھی اپنی صفائی میں کچھ کہہ نہ پائی۔۔۔یا یوں کہ مجھے اس کا موقعہ ہی نہ دیا گیا۔ الہڑ عمر۔۔۔معصوم جذبے۔۔۔سوائے اس کے کہ تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔۔۔زرد رنگت۔۔۔کپکپاتی ٹانگوں اور پیٹ میں اُٹھتے درد کے ساتھ غیر مشروط معافی نامے۔۔۔گھریلو جرگوں کے سامنے پیش ہونے پر عزتِ نفس پر لگنے والے تازیانے۔۔۔دِل کی بے آباد دُنیا میں ویرانیاں ناچتی رہیں۔ وہ دِن جن میں چاہنے اور چاہے جانے کے جذبے جوان ہوتے ہیں۔۔۔منّتوں اور مرادوں کے دِن، وہ گنگناتا قرب، وہ مہکتی شامیں، سہم اور خوف کی پرچھائیاں لیے، سوگوار گزریں۔ محبت کی خماری کی جگہ، جذبوں کی خواری

نے لیے رکھی اور کسی کے لیے سجنے اور سنورنے کے دِن، سوجی آنکھوں اور زرد رنگت لیے تمام ہوئے۔۔۔اور اب تم جو میری ہو۔۔۔جسے میں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔۔۔تم بھی۔۔۔تم بھی۔۔۔)

شیما کو لگا سینہ خالی ڈھنڈار ہو گیا۔ سَر کے پچھلے حصّے میں زور کی ٹیسیں اُٹھیں۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں، خلاؤں میں گھورتی ہوئی۔

"بیٹا۔۔۔میرے ساتھ ایسا نہ کرو۔۔۔میں تو پہلے ہی بہت دُکھی ہو گئی ہوں۔"

"ہونہہ۔۔۔آپ کو تو ویسے ہی Self Pity ہونے کا شوق ہے۔ کیا دُکھ ہے آپ کو؟۔۔۔اب کیا ہوا ہے؟ (ابھی کچھ اور ہونا باقی ہے کیا؟) بس کریں ماما۔۔۔بس کریں۔۔۔اچھا نہیں لگتا۔"

(میں کسی کو اچھا لگنے کے لیے تو کبھی نہیں رہی اور پھر تم کیا سمجھو گی؟ خشک بیوروکریٹ کی موڈرن اولاد۔۔۔شیما نے جلے دِل سے سوچا۔)

گیتی چیختی چلاّتی جاچکی تھی۔ شیما کا بھی دِل چاہا کہ اسی کی طرح چیخے اور دھاڑیں مار کر روئے۔ لیکن کس کے سامنے؟ آنسو خاموشی سے اس کی گالوں پر بہنے لگے۔

گیتی، دھپ دھپ پاؤں مارتی، اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔

اللہ رکھی نے شیما کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہنے لگی۔

"نہ۔۔۔نہ، میرا بچّہ۔۔۔رونا نہیں ہے ورنہ میں بھی رونے لگوں گی۔"

گیتی نے پھر سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور چیخی۔

"کیا کہہ دیا ہے، میں نے؟ جو اس قدر ہمدردی جتائی جا رہی ہے، بلا وجہ کا ڈراما۔۔۔"

اور دوبارہ کمرے میں چلی گئی۔

''اس قدر بدتمیزی!۔۔۔'' شیما بلک بلک کر رو دی۔

''شیما رانی، دِل بُرا نہ کرو، یہ سچ ہے کہ بندے کی باتیں برداشت ہو جاتی ہیں اولاد کی نہیں۔ ارشد بھی مجھے ایسے ہی دُکھ دیتا ہے۔ وہ باتیں کہتا ہے جو نہ کہنے والی ہیں۔ تبھی تو میں نے کنارا کر لیا ہے گھر سے۔ ورنہ میں بھی اپنے پوتے، پوتی کو کھلاتی۔ جب بیٹا ہی ایسے کرے گا تو بہو کو تو 'لسنس' (License) مل جاتا ہے تنگی دینے کا۔ پتا نہیں ارشد کس پر گیا ہے؟ اس کا ٹبّر تو بڑا پیار والا تھا۔

شیما رانی ہم تو سادے لوگ ہیں، زیادہ 'دل فریب' نہیں جانتے، پر مجھے تو میری ساس نے بھی کوئی تنگی نہیں دی۔ میں نے اور اس نے ایک دوسرے کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزارا ہے۔ دِن بھر ہم دونوں مل جل کر کام کرتیں اور رات کو میں اس کے پاس ہی سوتی تھیں۔ ارشد کا ابا تو کبھی کبھی چھٹی پر آتا تھا۔ ارشد دادی کے ساتھ سو جاتا اور ریحانہ میرے ساتھ۔ میں اور بے بے، دیر تک باتیں کرتی رہتیں۔ وہ مجھے 'اُجاڑوں' (تقسیم ہند) سے پہلے اپنے 'دیس' کی باتیں سناتی۔ وہ بتاتی تھی کہ انگریزوں کا زمانہ، بڑا امن کا زمانہ تھا۔ عورت چاہے دو سیر سونا پہن کر اکیلی چلتی جائے کوئی ٹوکنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا سی کوئی بات ہو جاتی تو 'لال پھتوئیوں' (سرخ جیکٹوں والے، بمعنی رائل آرمی) والے اسی وقت 'لیف تلائی، لیف تلائی' (اُردو میں رضائی اور گدا۔۔۔ لیفٹ رائیٹ کے لیے استعمال کیا ہے۔) کرتے آ جاتے۔

گاؤں کے پاس سے 'لین گڈی' (ریل گاڑی) گزرنے کی بات سناتے ہوئے، وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی۔ وہ بتاتی تھی کہ جب اس کے گاؤں کے پاس، انگریز نے 'لین گڈی' کی پٹڑی بنانی شروع کی تو گاؤں والے بڑے پریشان ہوئے اور جب ایک دن گھوڑے پر بیٹھ کر صاب بہادر، کام ہوتا دیکھنے کے لیے آیا تو سارے گاؤں والے اکٹھے ہو کر اس کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ ہم نے 'لین گڈی' یہاں سے گزرنے نہیں دینی، کیونکہ

جب وہ یہاں سے گزرے گی تو بہت گڑگڑ اور شور شرابہ ہو گا اور ان کی 'کُڑک' بٹھائی (انڈوں پر بٹھائی) ہوئی مرغیاں، انڈوں سے چوزے نہیں نکالیں گی۔''

نصیباں نے شیما کو اپنی داستان گوئی سے بہلانا چاہا۔

اللہ رکھی شیما کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی لیکن شیما سنبھل نہیں رہی تھی۔ نصیباں، شیما کے سَر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔

''پر۔۔۔ شیما، بیٹیاں تو ماں کی دُکھ سکھ کی سانجھی ہوتی ہیں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ گیتی ایسے کیوں کرتی ہے؟ جب ریحانہ کو بیاہا تو میں ہر وقت روتی رہتی تھی۔ ارشد کا ابا کہتا:

''بھاگو (بخت آور) کیوں دِل برا کرتی ہے؟ دِھی کا دَھن تو پرایا ہوتا ہے۔ بے سگنی نہ کر۔''

میں کہتی:

''ربّ نہ کرے میں بے سگنی کروں۔ پر تجھے پتا ہے کہ ماواں تے دِھیاں دی دوستی قہراں دے نال ٹُٹدی ہے۔''

(ماؤں کی بیٹیوں سے دوستی بہت مشکل سے ختم ہوتی ہے۔)

(لیکن یہ بھی تو ضروری نہیں کہ ہر ماں اور بیٹی میں دوستی ہو۔ شیما نے سوچا۔)

''یہ بڑے ظالم رِشتے ہیں شیما۔ اب بھی جب ریحانہ میکے آتی ہے تو ہم ساری ساری رات باتیں کرتے ہیں۔ پر ارشد کی ووہٹی کو یہ اچھا نہیں لگتا۔ کہتی ہے ساری رات کِن مِن، کِن مِن ہوتی رہتی ہے۔ پر شیما رانی، کوئی دُکھ دی کوئی سکھ دی۔ رات کا پتا ہی نہیں چلتا کدھر نکل جاتی ہے۔''

شیما۔ اللہ رکھی کی گود میں سَر رکھ کر سسکنے لگی۔

(ابا میاں، میں میکے سے، آپ کی دُعاؤں کے خنک سائے میں رُخصت ہوئی

لیکن سسرال میں جاتے ہی وہ دُکھوں کی چلچلاتی دھوپ میں بدل گیا۔ میں کیا کروں کدھر جاؤں؟ کسے بتاؤں؟ ۔۔۔ کہ میری بیٹی مجھ سے نفرت کرتی ہے۔)

جد چین کپاہیں پھل — (جب کپاس میں پھول آتے ہیں)
وے دھرمی بابلا — (اے میرے رُوحانی باپ)
سانوں اورت لے دئیں مُل — (ہمیں وہ رُت خرید دینا)
وے دھرمی بابلا — (اے میرے رُوحانی باپ)
اس رُت میرا گیت گواچا — (اس رُت میں میرا گیت کھو گیا)
جہدے گل برھوں دی گانی — (جس کے گلے میں ہجر کی مالا ہے)
سانوں گیت او لے دئیں مُل — (ہمیں وہ گیت خرید دینا)
وے دھرمی بابلا — (اے میرے رُوحانی باپ)
اِک دِن میں نے گیت میرے — (ایک دِن میں نے اپنے گیت)
اس ٹُونے ہاری رُتے — (اس جادُوئی رُت میں)
دِلاں دی دھرتی واہی گوڈی — (میں نے دِل کی دھرتی میں ہل چلایا)
بیجے سپنے سُچّے — (اور سچّے سپنے بو دیئے)
لکھ نیناں دے پانی سینچے — (نینوں کے بے پایاں پانی سے آبیاری کی)
پر نہ لگے پُھل — (لیکن پھول نہ لگے)
وے دھرمی بابلا — (اے میرے رُوحانی باپ)
سانوں اِک پُھل لے دئیں مُل — (ہمیں ایک پھول خرید دینا)
کم کیہڑے اے مُلکھ جگیراں — (یہ ملک اور جاگیریں کس کام کی)
جے دِھیاں کملائیاں — (اگر بیٹیاں کملا جائیں)
کیہڑے کم تیرے مان سروور — (تیرے مان سرور کس کام کے)

جے ہنسیاں ترہائیاں — (اگر ہنسیاں پیاسی رہیں)
کیہڑے کم کھلاری تیری، چوگ موتیاں تُل — (موتیوں کے مول کا دانہ دُنکا بکھیرا کس کام آیا)
جے رت نہ لے دئیں مل — (اگر رُت نہ خرید کر دو)
وے دھرمی بابلا — (اے میرے رُوحانی باپ)

☆ شو کمار بٹالوی

○○

صبح، کالج کا راؤنڈ لینے کے بعد، شیما آفس میں آ کر بیٹھی ہی تھی تو چپراسی نے ڈاک لا کر رکھی۔ سب سے اُوپر شہلا کا خط تھا۔ نہ القاب ۔۔۔ نہ سلام ۔۔۔ نہ دُعا، صرف ایک چھوٹی سی نظم تھی۔

کچے گھڑے نال لائیں نہ یاری — (کچے گھڑے سے دوستی نہ کرنا)
کدی نہ توڑ اپڑاوے — (یہ کبھی منزل پر نہیں پہنچاتا)
چارے پاسے پانی میرے — (میرے چاروں طرف پانی ہے)
کنڈھا نظر نہ آوے — (کنارہ نظر نہیں آتا)
اوکھے ساہ ہوئے نے سجنا — (میرے سجن، سانس لینا بھی دُشوار ہو رہا ہے)
جندڑی مکدی جاوے — (زندگی ختم ہو رہی ہے)

''تو سلطانہ شہلا تم اتنی دُور بیٹھی بھی میری کیفیات سے واقف ہو!''

شیما کی آنکھوں سے دو آنسو گر کر، اسی کاغذ میں جذب ہو گئے۔

○○

''سردیوں میں شام بہت جلد ڈھلنے لگتی ہے۔ کالج میں اتنی مصروفیت ہوتی ہے کہ مجھے خود سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ جلد گھر لوٹنا ممکن نہیں ہوتا، لیکن مانی اور اللہ رکھی باجی کی موجودگی میں مجھے بچّوں کی فکر نہیں ہوتی، اگرچہ میں تھک کر چور چور ہو جاتی ہوں۔ تمہیں

بھولنے کی کاوشِ بے حصول سے پژمردہ۔۔۔ گزرے لمحوں کی تصویریں۔۔۔ پلکوں پر نمی تھم سی جاتی ہے۔ یادوں کی نیلی جھیل کے اس پار بھی تنہائی ہے اور اُس پار بھی۔

ہر دن میرے لیے صدیاں بن جاتا ہے۔ بے مہر صُبحیں، نامہربان راتیں، مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے کچھ رکھ کر بھول گئی ہوں۔ بہت ضروری اور قیمتی چیز، اِک کمی۔۔۔ اک ادھوراپن۔۔۔ کوئی بات جو تم سے کہنی ہے۔۔۔ کوئی وعدہ نباہ کا۔۔۔

جاڑوں کی اماوس راتوں میں، جب بچے سو جاتے ہیں تو مجھے اپنے بیڈ روم کی چھت بہت دور نظر آتی ہے۔ طویل راتیں میری آنکھوں سے نیند چھین لیتی ہیں۔ جیون کا جوار بھاٹا، شوکتی لہریں اور دکھ کا ٹھاٹھیں مارتا ساگر۔۔۔

جسے دیکھ کر جیتی تھی وہ اب آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ آلامِ ہستی کی یورش سے دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں۔

کہاں تک تاب لائے ناتواں دل
کہ صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں

موت انسان کی ہو یا رشتوں کی، دُکھ دیتی ہے۔

انسانوں کا مرنا اور رشتوں کا ٹوٹ جانا، زندگی میں خلا پیدا کر دیتا ہے، جو کبھی پُر نہیں ہوتا۔

محبت اور نفرت، دل و دماغ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہیں۔ وہ جن سے میں محبت کرتی ہوں، وہ سدا میرے دل میں بستے ہیں اور وہ، جن سے میں نفرت کرتی ہوں وہ ہمیشہ میرے ذہن پر مسلّط رہتے ہیں۔ میں ان سے چھٹکارا نہیں پا سکتی، یہ صورتِ حال مجھے ادھ موا کر دیتی ہے۔

سوچتی ہوں کہ اگر Depression کا مسئلہ نہ ہوتا تو زندگی یقیناً قدرے بہتر ہوتی۔ اب تو ایسا ہے کہ:

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

اجاڑ، چٹیل، اُداس اور ویران سرزمینِ دل پر چاروں طرف گونجتے سنّاٹے میں میرے خیالات بھٹکتے رہتے ہیں میں چاہتی ہوں کہ زور زور سے چیخوں اور چلاؤں اور میری آنکھ کھل جائے۔۔۔ اور سب ویسا نہ ہو، جیسا کہ ہے۔"

اس کھینچا تانی سے شیما کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر سائیکاٹرسٹ سے مشورہ کرنے کا سوچا، لیکن وہ پریشان تھی کہ ڈاکٹر صاحب کو تمام صورتِ حال سے کیسے آگاہ کرے گی؟

آخر یہ مرحلہ کسی نہ کسی طرح سے طے ہو ہی گیا۔ شیما نے سر نیچے ڈال کر اور نظریں جھکا کر سب کہہ دیا۔ اتنے سالوں کے بعد پہلی بار، اس نے کسی کو اس راز میں شامل کیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگی ہوئی تھی اور پھر وہ میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ ڈاکٹر صاحب اس دوران میں ایک لفظ بھی نہیں بولے، اور نہ ہی انہوں نے شیما کو رونے سے منع کیا تھا۔ شیما جی بھر کر بھڑاس نکال چکی تھی لیکن اب، احساسِ شرمندگی سے وہ ڈاکٹر صاحب کا سامنا نہیں کر پارہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے، اسے بھانپ کر شیما کو تسلّی دی۔

"پروفیسر صاحبہ، آپ قطعی پریشان نہ ہوں۔ یہ باتیں صرف آپ کے اور میرے درمیان رہیں گی۔ ایک سائیکاٹرسٹ کا واسطہ، ایسے کتنے ہی مریضوں سے پڑتا ہے، جو اپنے مسائل اس سے شیئر کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کی اخلاقی ذمّہ داری ہے کہ یہ باتیں صرف اور صرف اسی تک محدود رہیں۔ آپ بے فکر رہیں، میں نے ہمیشہ اس اصول کی پاسداری کی ہے۔ صحیح صورتِ حال سے میری واقفیت، آپ کے علاج میں معاون ثابت ہوگی آپ کہیے میں سن رہا ہوں۔"

''ڈاکٹر صاحب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گزرتے وقت کا مرہم اس زخم کو مندمل کر دیتا لیکن جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے ہیں اسے برداشت کرنا میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے تو بے یقینی کی حالت تھی کہ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟۔۔۔اور ہر بار جب میں خود کو یقین دلاتی ہوں کہ ہاں واقعی ایسا ہوا ہے تو پھر اس کے بارے میں ایسی Details میری آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتی ہیں، جنہیں میں دیکھنا نہیں چاہتی، لیکن ان سے مفر نہیں ہے۔ میرا صدمہ دو چند ہو جاتا ہے۔ یہ میرے لیے انتہائی بے عزتی کا باعث ہے۔ میں خود کو بہت ہلکا محسوس کرتی ہوں۔ اس شخص سے اب میرا تعلق نہیں ہے۔ کبھی تو تھا نا! اس کا یہ انجام تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا یہ حقیقت ہے کہ اپنے پیاروں سے جدا ہونے کا خوف، محبت کرنے والوں کی جان سے لگا رہتا ہے لیکن اس انداز سے؟۔۔۔میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔

اس ذہنی کشمکش سے میری جسمانی صحت بھی متاثر ہو رہی ہے۔ میرے بچّے بہت چھوٹے ہیں۔ میں ان کے لیے صحت مند زندگی جینا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں کہ ان حالات سے نپٹنے میں، آپ میری مدد کریں۔'' شیما نے پُراُمید نظروں سے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی۔۔۔یقیناً'' ڈاکٹر صاحب نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''دیکھیے، ہر مسئلے کا ایک حل ضرور ہوتا ہے جسے کوشش سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مسائل کی بہت سی اقسام ہیں، جو متاثرہ فرد کو آکٹوپس کی طرح اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ ان کی گرفت سے، فرد اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تجزیہ کرنے سے ان کا مداوا کیا جا سکتا ہے۔۔۔اگرچہ کسی حد تک ہی سہی۔ اس سے صورتِ حال تو تبدیل نہیں ہوتی لیکن اس کی سمت، آپ کا رویّہ، آپ کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔''

شیما بہت غور سے ڈاکٹر صاحب، کو سن رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب، بہت دھیرج اور متاثر کن انداز سے بات کر رہے تھے۔

''ایک مضبوط اور مثبت رویّہ، معجزاتی طور پر زندگی میں آسانی لاتا ہے۔ آپ کا یہاں تشریف لانا ہی، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ حالات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت رکھتی ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے بہت تیقّن سے کہا۔

''پروفیسر صاحبہ، کوشش کیجیے کہ آپ تبدیل ہونے والی باتوں اور تبدیل نہ کیے جا سکنے والے معاملات میں فرق محسوس کرنا سیکھ جائیں۔ اس سے آپ کو حالات کو سمجھنے اور ان کا مقابلہ کرنے میں مدد ملے گی۔ آپ نے کبھی ایسا چاہا نہیں تھا، لیکن ایسا ہوا۔۔۔آپ انتہائی صدمے کا شکار ہیں۔۔۔یہ ایک فطری امر ہے۔ انہونی کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔۔۔ لیکن آپ کو اسے برداشت کرنا ہے۔۔۔اپنے بچّوں کے لیے۔۔۔میرا خیال ہے آپ اس انداز سے بہتر سمجھ پائیں گی، لیکن میں اس میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ آپ کو اسے برداشت کرنا ہے۔۔۔اپنے لیے، زندگی جو بار بار نہیں ملتی، ایسے لوگوں پر ضائع کرنے کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی وہ لوگ اس کے حق دار ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب کا ایک ایک لفظ، شیما کو، اپنے ذہن میں جذب ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

''یہ دکھ، گلے میں لٹکتے ہوئے ڈھول کی مانند ہے اور گلے میں پڑا ہوا ڈھول بجانا پڑ جائے تو یوں نہیں کہ اس کے شور سے، اپنے ہی کانوں کے پردے پھٹنے لگیں۔ بلکہ، اِسے، ایسے سُر سے بجائیے کہ آپ اِس کے رِدھم میں کھو کر، اس بوجھ کو کم سے کم محسوس کریں، جو آپ کے کندھوں پر آن پڑا ہے۔''

شیما، سراپا کان بنی ہوئی تھی۔

''آپ پڑھی لکھی ہیں۔ آپ کے پاس جاب ہے۔ آپ کے پاس گیتی اور ویرو ہیں۔ آپ کے ساتھ آئمہ ہے۔ آپ کے گھر میں، آپ سے محبت کرنے اور آپ کا خیال رکھنے والے لوگ ہیں، آپ کے مخلص دوست ہیں۔ یہ سب زندہ رہنے اور خوشی سے زندہ

رہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب یہ سب کتابی باتیں ہیں اور کسی کے لیے ان کو اپنانا دوسری بات ہے۔''

شیما ٹوٹتی جا رہی تھی۔

''یقیناً یہ کتابی باتیں ہیں لیکن کتابی باتیں گپ شپ نہیں ہوتیں اور نہ ہی دیوانے کی بڑ۔ یہ علم کا وہ خزانہ ہیں، جو تجربات کا نچوڑ ہے۔۔۔

پروفیسر شیما میری بات غور سے سنیے، کچھ باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں، ہم چاہیں بھی تو ان کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ آپ کوشش سے ایسا رویہ اپنایئے کہ ان باتوں کو بعینہٖ برداشت کرنے کی ہمت پیدا کر سکیں۔ یہ آسان نہیں ہے۔۔۔ لیکن ممکن ہے۔

اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اگرچہ بہت تکلیف دہ ہیں۔ لیکن کوشش سے انہیں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی آسان نہیں ہے لیکن میں پھر کہوں گا کہ ممکن ہے۔ آپ ایک بلند حوصلہ، سمجھدار اور مثبت سوچ رکھنے والی خاتون ہیں۔ ایک عام عورت سے بہت مختلف۔ عورت صنفِ نازک اس لیے نہیں کہلاتی کہ وہ کمزور ہے۔ بلکہ، اس لیے کہ وہ حسّاس ہے، باریک بیں ہے۔ اگر وہ کمزور ہوتی تو یہ دنیا، جو مرد کی دنیا ہے اس میں Survive نہ کر سکتی۔

آپ دوسروں کو تو تبدیل نہیں کر سکتیں، لیکن خود کو اس کے مطابق بنا سکتی ہیں۔ کمینگی کا جواب، کمینگی سے دے کر نہیں۔ بلکہ نہایت باوقار طریقے سے، دھیرج سے، اپنے ذہن کو اس سے متاثر کیے بغیر۔''

''ڈاکٹر صاحب، فی الحال تو میں خود کو اس قابل نہیں پاتی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ درست کہہ رہے ہیں۔ اس پر عمل کرنا، میرے لیے بہت مشکل ہے۔ اور آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں بلند حوصلہ ہوں؟ معاف کیجیے گا، میرا خیال ہے آپ مجھے سمجھ نہیں پائے۔ اگر میں حوصلہ مند ہوتی تو اپنے شوہر کو اس بات پر برا بھلا کہتی، چیختی چلاتی۔۔۔ اُس عورت کو اِس بات کا مزا چکھاتی۔ لیکن میں تو کچھ بھی نہ کر پائی، چپ چاپ ڈھے گئی۔ یہ بات تو میری

کم حوصلگی کو ہی ظاہر کرتی ہے نا!''

''نہیں!۔۔۔ یقیناً نہیں! یہ تو ایک بالکل مختلف قسم کا ردِّعمل ہے جو کہ ایک پڑھی لکھی، باوقار خاتون ہی اپنا سکتی ہے، جو کہ آپ ہیں۔ ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ آپ کا ایسا ردِّعمل، آپ کو، اپنے عزیزوں، بچّوں اور حلقۂ احباب میں، سوائے اس کے کہ ہلکا کر دیتا اور کچھ نہ ہوتا۔ حالات میں کوئی تبدیلی آنے والی نہیں تھی۔ آپ کے اعتماد کو جو ٹھیس پہنچ چکی ہے، اس کا ازالہ ممکن نہیں اور جس بات کو ہم تبدیل نہیں کر سکتے، اسے قبول کر لینے میں ہی بہتری ہے۔۔۔ اپنے آپ کے لیے۔۔۔ اپنے پیاروں کے لیے۔''

ڈاکٹر صاحب، میری اِتنی ذمہ داریاں ہیں، جنھیں پورا کرنے کے لیے، انھیں وقت دینا ضروری ہے۔ لیکن بعض اوقات میں شتر مرغ کی طرح، ریت میں سَر چھپا کر انھیں بھلانے کی کوشش کرتی ہوں۔ بستر میں منہ چھپائے پڑی رہتی ہوں، کچھ کرنے کو تو کیا؟ منہ باہر نکالنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ لیکن ذہن پر بوجھ ضرور رہتا ہے اور احساسِ ندامت اور پچھتاوا مجھے مزید اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔''

''پروفیسر صاحبہ، یہ بھی اس بیماری کا حصّہ ہے۔ یاد رکھیے کہ جسمانی بیماریوں کی طرح یہ بھی ایک بیماری ہے۔ محض کیفیت نہیں۔ ورنہ عام لوگ تو اسے یوں ہی لیتے ہیں۔

''تمھیں کس بات کا ڈپریشن ہے؟ کس بات کی کمی ہے؟ ہمّت کرو۔'' یہ صحیح ہے کہ ہمّت کی بہت ضرورت ہے، لیکن علاج کے ساتھ ساتھ۔ پڑھے لکھے لوگ اور بعض اوقات تو عام ڈاکٹر صاحبان بھی اسے نہیں سمجھتے۔

(شیما کو نظیف کا ردِّعمل یاد آیا۔)

کچھ لوگ تو واقعی اسے 'مکر' اور 'بہانے بازی' کہتے ہیں۔''

(شیما نے بہت relief محسوس کیا کہ کوئی تو اس کے مسئلے کو سمجھتا ہے۔)

''میں آپ کو ایک مزے کی بات بتاتا ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب نے شگفتگی سے کہا۔

''ایک دِن، گاؤں سے ایک خاتون، اپنے جوان بھائی کو لے کر آئی اور کہنے لگی۔

''ہم آج کل بہت پریشان ہیں۔ بھائی کو 'کھیسی والی بیماری' ہوگئی ہے۔''

(یا اللہ پاک۔۔۔ یہ کونسی بیماری ہے؟ شیما نے سوچا)

''سویرے، بھائی کام پر جانے کی بجائے، چارپائی سے نہیں اُٹھتا، جیسے جیسے، سورج چڑھتا جاتا ہے، کھیسی اس کے منہ پر آتی جاتی ہے۔ سارا دِن اسی طرح منہ ڈھک کر لیٹا رہتا ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ 'مکرُولا' ہے 'نیستی' کا مارا ہوا۔ لیکن ہمارے نمبردار کی بہو بڑی پڑھی ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ دماغ کے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔''

اور علاج کروانے کے بعد اب وہ ٹھیک ہے، کام کرتا ہے۔ وہ اور اس کے گھر والے مجھے بہت دُعائیں دیتے ہیں۔۔۔ اب یوں سمجھئے کہ آپ کو بھی 'کھیسی والی بیماری' ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

شیما نے بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سَر ہلایا۔

پروفیسر صاحبہ! آپ یوں کیجیے کہ آج رات جب بچے سو جائیں اور آپ اکیلی ہوں۔۔۔ اپنی سوچوں کے ساتھ، تو اپنی کیفیت لکھیے، اپنے سارے محسوسات۔۔۔ آپ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گی اور اگلی ملاقات پر مجھے بھی دکھایئے گا۔ مجھے، آپ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔''

شیما نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس رات شیما نے لکھا۔

'یادیں۔۔۔ یادیں۔۔۔ یادیں۔۔۔ دکھ بھری یادیں، جان لیوا یادیں۔۔۔ جیسے اندھیری رات میں بستر میں چھپا کنکر اور جب گزرے دنوں کے جھروکے، یادوں کی قندیل سے

جگمگاتے ہیں تو ابا میاں، اماں اور سرمد میرے سامنے مجسّم ہو جاتے ہیں۔ کسی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ جن لوگوں کی کمی، تم اس قدر محسوس کرتی ہو، اگر وہ تمہیں کہیں مل جائیں تو تمہارے احساسات کیا ہوں گے؟ تو میں نے جواب دیا تھا کہ انتہا درجے کا احساسِ شرمندگی!۔۔۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میں ان لوگوں کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ پاؤں گی۔۔۔ اور اب اتنے سال۔۔۔ اور ساتھ میں احساسِ جرم کا طوق۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ ان کی موت کی ذمّہ دار میں ہوں۔۔۔ وہ میری پریشانی سینے سے لگائے چلے گئے۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔ چین اک پل نہیں۔۔۔ لیکن اس کا کوئی حل بھی تو نہیں۔۔۔

یہ یادیں، میرے دل میں ایک مستقل چُبھن کا باعث ہیں لیکن میں پھر بھی ان کی ممنون ہوں، کیونکہ یہ میرے وجود کا سب سے اہم حصّہ ہیں۔ انہیں کھو کر میں خود بھٹکنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ وہ جو رگِ جاں سے قریب تر تھے، جدا تو ہو گئے۔ لیکن چھوڑ کر نہیں گئے۔ مصروفیت میں مَیں ان کی یاد سے پیچھا چھڑا بھی لیتی ہوں تو وہ خوابوں میں آ جھانکتے ہیں۔

ے میری تمام سرگذشت
کھوئے ہوؤں کی جستجو

۔۔۔ میری اصلیت۔۔۔ میری بنیاد

'دردو سوزِ آرزومندی' اک متاعِ بے بہا ہے۔

یوں تو عام طور پر یادیں زبردستی آتی ہیں اور اسیر کر لیتی ہیں لیکن میں تو خود ان کی چاہت میں گرفتار ہوں، ان کی متلاشی ہوں۔

یہ للک مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ میری ذات کا بنیادی، لازمی اور طاقت ور جذبہ ہے۔ یہ میرے پیاروں کا ماتم ہے۔ گئے ہوؤں کا مرثیہ ہے۔ اک ہوک ہے۔ یہ جدائی کے لمحے، میری ذات سے جدا ہو جانے والے ایک حصّے کا سوگ، وہ حصّہ جو جانے والوں کے ساتھ چلا گیا۔ میں ماضی کو اپنی ذات میں سمولینا چاہتی ہوں۔ اس طرح کہ میری ذات

کے تمام ذرّے اس سے بازیافت ہو جائیں۔

'بچھڑے ہوؤں کے ساتھ گیا جو
ماتم ذات کے اس حصّے کا
للّک ہے ماضی، للّک حال بھی، للّک ہمارا مستقبل بھی
ساری بھوکیں، ساری پیاسیں
یہ بھی للّک ہے
تیز اور تیکھی
بنیادی بھی
خواہش، جذبے، چاہت، سپنے
للّک پتا ہے، للّک ہے ماتا
للّک گئی کل سے لوٹانا
اپنی ذات کے کھوئے ذرّے'

اگر میری ازدواجی زندگی خوشگوار ہوتی تو یہ دکھ، جو یقیناً ناقابلِ برداشت ہے، اسے سہنا میرے لیے قدرے آسان ہوتا۔

'ایہہ گلیاں تینوں سفنا تھیسن (یہ گلیاں تیرا سپنا بن جائیں گی)
ایہہ گلیاں بابل والیاں (یہ بابل کی گلیاں)

اور میرا گھر۔۔۔ جو کبھی 'میرا' گھر نہ بن سکا۔ پھر بھی میں اس کی محبت میں گرفتار ہوں۔۔۔ اس کے ہجر میں برباد ہوں اور میرے دل کے آنگن میں ویرانی کی دھوپ ہے۔۔۔

اور کبھی جو زندگی سے، اپنے رایگاں اشکوں کا حساب مانگوں تو یوں ہوگا کہ

ے سوا لکھ دا وکدا میرا سرہانا (میرا تکیہ سوا لاکھ کا بکتا)
جے ہنجواں دا مُل پیندا (اگر آنسوؤں کا کوئی مول ہوتا)

شیما نے کاغذات سمیٹے، انہیں ایک لفافے میں بند کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن جب کافی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد بھی، نینداس کے قریب نہیں پھٹکی تو اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔

''لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد دھند چھٹنے لگتی ہے۔ یادیں وہیں ہیں، لیکن انداز بدل جاتا ہے۔۔۔ چمکیلی، رنگارنگ، دل خوش کن یادیں۔۔۔ ہر موضوع پر، ہر موقعہ سے متعلق۔۔۔ ہم کتنی باتیں کرتے تھے۔۔۔ کتنا ہنستے تھے۔۔۔ اور پھر زندگی اور زندہ لوگوں میں میری دل چسپی بڑھ جاتی ہے۔ میری آنکھوں کی چمک اور چہرے کی رونق واپس آجاتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک، ان دو کیفیات کے فرق کو چھپا لیتی تھی۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ اب تو میں نہ ہنسنے والوں میں ہوں نہ ہنسانے والوں میں۔ وہ میں، جو کبھی جانِ محفل تھی، اک مدت سے اداسیوں کا شکار ہوگئی ہوں۔

زندگی کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ آپ کے پاس اچھی بری یادوں، کے انبار لگے ہیں لیکن کوئی ایسا نظر نہیں آتا، جو ان میں حصہ دار بن سکے اور جب آپ ایک خوبصورت لمحے کو دہراتے ہوئے، بات ادھوری چھوڑ کر خیالوں کی دنیا میں کھو جائیں تو دوسرا آپ کی بات کو وہیں سے شروع کر دے، جہاں سے آپ نے چھوڑا تھا۔

میں سمجھتی ہوں کہ دکھ اور تنہائی کے سمِ قاتل کا واحد تریاق، کام ہے۔ مصروفیت وہ جو، سب کچھ بھلا دے۔ اس لیے میں نے خود کو بہت مصروف کر لیا ہے۔ میری محنت اور وقت دینے سے، کالج کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ پوری ڈویژن میں اس کی دھوم ہے۔ شام میں بچّوں کے ساتھ گزارتی ہوں۔ ان کے ساتھ کھیلنا، انہیں پڑھانا۔ اللہ رکھی باجی اور نصیباں خالہ سے گپ شپ، چاچا فیروز سے زمینوں سے متعلق آگاہی وغیرہ۔ اکثر شام میں میری دوست نگار، جواب نگار صلاح الدین سے نگار معین بن چکی ہے (اور یوں اپنے نام سے مطمئن ہے) اپنے میاں اور ساس کے ساتھ آجاتی ہے۔ نگار کی ساس، بی جان مجھ سے

اتنا پیار کرتی ہیں کہ ایک انوکھی ٹھنڈک مجھے اپنے حصار میں لے لیتی ہے وہ کہتی ہیں

''جتنی اچھی میری بہو، نگار ہے، اتنی ہی اچھی، اس کی دوست شیما ہے۔''

اس پر نگار، بہت سنجیدگی سے کہتی ہے۔

''بی جان، 'ایک دانشور' نے کہا ہے کہ جتنی اچھی آپ کی بہو ہوگی، اتنی ہی اچھی، اس کی دوست بھی ہوگی کیونکہ

'کند ہم جنس ، باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر ، باز با باز'

اس پر بی جان، بڑے فخر سے کہتی ہیں

''جب میں کسی کو بتاتی ہوں کہ میری بہو، مجھ سے فارسی میں بات کرتی ہے تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔''

ان لوگوں کے آنے کا وقت، میرے لیے مکمل تفریح کا ہوتا ہے۔ گپ شپ، ہنسی مذاق، کپڑوں اور نیل پالش کے شیڈز پر، سیر حاصل بحث کرنے کا وقت۔ میں نے پہننے اوڑھنے کا شوق، دانستہ طور پر بڑھا لیا ہے۔ اب میں ان باتوں میں پناہ چاہتی ہوں، جو پہلے کبھی زندگی میں اتنی دخیل نہ تھیں۔

Put on your dancing shoes and dance away your blues.

(اپنے رقص کرنے کے جوتے پہن لو اور رقص کرتے کرتے، اپنے سارے غم بھلا دو)

ع محورقصِ رندانہ۔۔۔

معین بھائی، بہت خوبصورت گفتگو کرتے ہیں ان کے بیان کردہ لطیفوں کو سن کر، میں اور نگار ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی ہیں۔ ان لوگوں کے آنے پر کھانے کا بھی اہتمام کرتی ہوں۔ مل بیٹھ کر کھانے سے زیادہ کھایا جاتا ہے۔ اس سے تھوڑا وزن بڑھ گیا ہے لیکن میری کولیگز، کے مطابق 'زیادہ گریس فل خاتون، بن گئی ہوں واہ!'

آخر میں شیما نے شہلا کی کہی ہوئی، اپنے حسب حال نظم لکھ دی۔

'گھپ ہنیرے راہ نہ کوئی (گھپ اندھیرے میں راستہ نہیں ملتا)
کالی رات، اماوس ہوئی (کالی رات، اماوس کی رات ہے)
چن میرا کدھرے ہوراے چڑھدا (میرا چاند کہیں اور نکلتا ہے)
میرے ویڑھے لو نہ کوئی (میرے صحن میں کوئی روشنی نہیں ہے)
دل دا پنچھی اڈ اڈ جاوے (دل کا پنچھی اڑ اڑ جاتا ہے)
وچھڑی کونج وانگوں کرلاوے (بچھڑی ہوئی کونج کی طرح کرلا رہا ہے)
سنگی ساتھی نظر نہ آوے (کوئی ساتھی نظر نہیں آتا)
ڈارنوں سار نہ کوئی (قطار کو اس کی کچھ خبر نہیں ہے)
وچ وچھوڑے رات نئیں مکدی (جدائی کی رات ختم نہیں ہوتی)
جیندے جی تے آس نئیں مکدی (جیتے جی آس ختم نہیں ہوتی)
بے قدراں دی تانگھ نئیں مکدی (ناقدروں کا انتظار ختم نہیں ہوتا)
کینوں دسے کوئی (کوئی، کسے بتائے)'

OO

اتوار کی صبح، شیما ذرا دیر سے سو کر اُٹھی۔ وہ رات گئے تک کتاب پڑھتی رہی تھی اور اب اس پر خواب آور ادویات کے اثر سے، ذہنی اور جسمانی کسلمندی طاری تھی۔ چپل گھسیٹتے ہوئے، وہ پچھلے برآمدے میں آئی تو نصیباں خالہ تخت پر بیٹھی تسبیح کر رہی تھیں۔ پاس تازہ توڑی ہوئی موتیے کی کلیاں مہک رہی تھیں۔ شیما کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔۔۔ بالکل اماں والا انداز۔ اس نے بے ساختہ، تخت پر لیٹ کر ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ خالہ ایک ہاتھ سے دانے گراتی رہیں اور دوسرا ہاتھ آہستگی سے شیما کے بالوں میں پھیرنے لگیں۔ شیما نے ویسے ہی آنکھیں بند کر لیں، جیسے بچپن میں اس کی بلی، پیار کرنے پر کر لیا کرتی تھی۔ تھوڑے

فاصلے پر اللہ رکھی جائے نماز پر بیٹھی تھی، وہ اُٹھ کر آئی اور شیما کے چہرے پر کلامِ پاک پھونکا۔

''السلام علیکم باجی، چائے دے دیں، بڑا والا لگ اور وہ بھی ٹرک ڈرائیوروں کی پسند کا، دوسو میل جانے والا۔''

شیما نے بڑے دُلار سے کہا:

''شیما رانی۔۔۔ صبح صبح، خالی پیٹ بڑا لگ چائے کا۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں۔'' نصیباں نے کہا۔

''خالہ کیا کروں؟ صبح آنکھ کھلنے کے بعد جسم تو برا بھلا جاگ جاتا ہے، لیکن ذہن کی کھڑکیاں تو چائے سے ہی کھلتی ہیں۔''

''شیما، یہ گولیاں جو تم کھاتی ہو، ان کا فائدہ تمہیں سمجھ آتا ہو تو الگ بات ہے، مجھے تو نقصان ہی نظر آتا ہے۔''

(ان گولیوں کا جو نقصان مجھے ہوا ہے وہ تو میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔ اب اس نقصان، کو برداشت کرنے کے لیے مجھے ساری عمر کھانا ہوں گی۔)

''اب میں کیا کہوں؟ ڈاکٹر نے بتائی ہیں، ورنہ میں تو کہتی ہوں آہستہ آہستہ کم کر کے چھوڑ دو۔ نشہ ہی ہے نا! پکّا پکّا لگ گیا تو بڑی مشکل ہوگی۔''

نصیباں متفکر تھی۔

''نہیں خالہ، شیما نشہ نہیں کرتی، یہ تو دوائی میں نیند کا اثر شامل ہے۔''

اللہ رکھی نے احتجاج کیا۔

''مجھ اَن پڑھ کو کیا خبر؟ میرا سوہرا تو فیم کی اتنی بڑی گولی کھاتا تھا۔ بس گولی اندر اور دم جلندھر۔۔۔ ساری رات بے سدھ پڑا رہتا۔ اور صبح جھوک میں۔''

اللہ رکھی چائے لے آئی تو شیما سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اللہ رکھی نے بھی کرسی، تخت کے پاس رکھ لی۔

''شیما رانی، بابے کی آنکھیں یہ بڑی بڑی تھیں، ریحانہ کی آنکھیں، اسی جیسی ہیں۔ ایک تو بابے کی آنکھیں موٹی تھیں، اُوپر سے نشے کی وجہ سے ان میں لال ڈورے رہتے تھے۔۔۔ اور بھی اچھی لگتی تھیں۔ میری ہمسائی کی بیٹی تھی چودہ پندرہ سال کی، بانو نام تھا اس کا، بڑی شیطان تھی۔ جب بھی میرے گھر آتی اور بابا چارپائی پر بیٹھا نظر آتا تو ہولے سے میرے کان میں کہتی:

''چاچی، بابا اگر دس بیس سال چھوٹا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا!''

پھر میری ڈانٹ سننے سے پہلے ہی آنکھیں مٹکاتی ہوئی بھاگ جاتی۔''

شیما نے چائے ختم کی تو اس کے چہرے پر واقعتاً بیداری کے آثار نظر آنے لگے۔ اسے متوجہ پا کر نصیباں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''ارشد کا ابا جب چھٹی پر آتا تو اپنے بابے کو جپھی مار کر گانے لگتا۔

ع اِک تیری اکھ کاشنی، دوجا رات دے اننیدرے نے ماریا

(ایک تیری آنکھ خوب صورت ہے، دوسرا رتجگے نے برا حال کر دیا ہے۔)

بابا ہنستا جاتا اور کہتا:

''اُلّو دا کن۔۔۔ پیو سے مشکریاں کرتا ہے۔''

بڑی ہی محبت والا ٹبر تھا۔''

نصیباں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''میں جانتی ہوں شیما، تمہارے اُوپر بہت مشکل وقت ہے۔ جدائی تو بندے کو مار جاتی ہے۔ پر تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ تم ٹھیک نہیں رہو گی تو بچّوں کا خیال کون رکھے گا۔ میں اس عمر میں ارشد کے ابّے کی کمی محسوس کرتی ہوں، تو تیری تو بھری جوانی ہے۔ میرے بچے اپنے گھر بار والے ہیں، پر تیری فصل تو ابھی کچّی ہے۔''

شیما نے ٹھنڈی سانس بھری اور سر جھکا لیا۔

''شیما جب میری منگنی ارشد کے ابّے کے ساتھ ہوئی تو میری سہیلیاں مجھے بہت تنگ کرتی تھیں۔ رجّی کا تو کام ہی اِتنا تھا، مجھے دیکھتے ہی ہولے ہولے گانے لگتی:

ع وسنا فوجی دے، بھانویں بوٹ سنے لت مارے

میری عمر بڑی الہڑ تھی، میں تو ڈری سہمی ہی رہتی تھی۔ پر ارشد کے ابّے کو اللہ جنت میں جگہ دے، اس نے مارنا تو کجا، مجھے کبھی اوکھا تتّا (برا بھلا) بھی نہ کہا۔ اب میں کبھی سوچتی ہوں کہ اگر کچھ تنگی دیتا تو شاید اس کے بعد میرا وقت اِتنا مشکل نہ گزرتا۔ اس کی اتنی اچھی باتیں ہیں یاد کرنے کو کہ اس کی جدائی جری نہیں جاتی۔ اور جب کبھی میرے ہنجو نکل آئیں تو ارشد کی وہ ہٹی بڑی باتیں بناتی ہے۔ کہتی ہے بڈھی کو اس عمر میں عشق کا ہوکا (جنون) ہو گیا ہے۔ بات اتنی ہے شیما رانی کہ کلّی رہ گئی ہوں، جو کچھ بھی کوئی کہے، سب سچ ہے۔''

(اچھی یادیں جینے نہیں دیتیں تو بری یادوں سے کونسا سکون ملتا ہے۔ یہ 'اوکھیاں تتّیاں' تو زندگی میں زہر بھر دیتی ہیں۔)

''اللہ رکھی باجی، آج کیا پکانے کا ارادہ ہے؟''

شیما نے موضوع بدلنے اور دھیان بٹانے کے لیے کہا۔

''شیما بیٹا، ارادہ کیا میں تو پکا بھی چکی ہوں۔ چکن کڑاہی اور آلو کی بھجیا۔۔۔ میں نے رات ہی بچّوں سے پوچھ لیا تھا۔ ان کا تو یہی جواب ہوتا ہے۔''

''یہ بچے بھی تنگ نہیں آتے روزانہ ایک ہی چیز کھا کھا کر۔'' شیما نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہاری پسند کی ماش کی دال بھی بنائی ہے۔''

اللہ رکھی نے پیار سے شیما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کتنا تردّد کرنا پڑتا ہے باجی۔''

''لو، یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے اپنے بچّوں کے کام نہیں کرنے تو کس کے کرنے ہیں؟ آلو میں نے رات ہی اُبال لیے تھے اور کڑاہی بھی منٹوں میں تیار ہو گئی۔''

اللہ رکھی نے خوش دلی سے کہا۔

''اللہ رکھی بڑی پیار والی بچّی ہے۔ کام کرتے تھکتی نہیں۔ ویسے شیما رانی، یہ مرغی تو منٹوں میں گل جاتی ہے۔ پہلے جب یہ فارمی مرغی نہیں ہوتی تھی تو دیسی مرغا پکاتے تھے۔ تب یہ پریشر والی ہانڈی بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو جلدی گلتا ہی نہیں تھا پھر مہمان تو شوربا کھا کر چلا جاتا اور بوٹیاں گلانے میں دو دن اور لگ جاتے تھے۔''

نصیباں نے ہنستے ہوئے کہا۔

OO

''مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ بچوں کی ضد کی وجہ سے مجبور ہوگئی، ورنہ وہ جگا ہیں، جہاں میں کبھی نظیف کے ساتھ، اچھے وقتوں میں آئی تھی، مجھے بہت اُداس کر دیتی ہیں اور جب ماضی کی منڈیر پر یادوں کا دیا جلتا ہے، تو میں بیکل ہو جاتی ہوں۔ یہاں کے لوگ دیار کی شاخ کو تنے سے جدا کر کے، گھروں میں روشنی کے لیے جلاتے ہیں۔ جسے 'دِلی' کہتے ہیں۔ ماسٹر ضیا حسین نے بتایا تھا کہ روایت کے مطابق، یہ شاخ، تنے سے الگ ہو کر، اس کی یاد میں جلتی ہے تو روشنی بکھیرتی ہے۔ میں بھی 'دِلی' ہوں، تنے سے الگ ہو جانے والی شاخ، جو تنے کی یاد میں جل رہی ہے۔ اس کی روشنی سے میرا گردوپیش منوّر ہے۔ اسی روشنی کی محفوظ پناہ میں میرے بچے پرورش پا رہے ہیں۔ لیکن میں خود راکھ ہوئی جاتی ہوں۔

یہ سچ ہے کہ سمندر جلتے ہیں تو بادلوں میں بدل جاتے ہیں اور پھر تپتی زمین پر برکھا برستی ہے۔ ورنہ صحراؤں سے آج تک کس نے پھول چنے ہیں؟'' شیما سوچوں میں گم تھی۔

۔۔۔ پر یہنا کاٹیج میں پھول بھرے پڑے تھے۔ دریا، بالکل اس کے ساتھ لگ کر بہہ رہا تھا۔ گارڈن لائٹس کی روشنی میں پھول چمک رہے تھے۔ پانی بہنے کی آواز اور رومان انگیز خنکی، جسم میں خوشگوار انداز سے، رچتی جا رہی تھی۔ فضا میں انجانی خوشی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

نصیباں، گرم سوٹ پہنے، شال اوڑھے، کرسی پر پاؤں رکھ کر، مرزا پھوپا بنی بیٹھی
تھی۔ایک سات سالہ، صحت مند بچّی، نیلی جینز اور سرخ سویٹر پہنے، پونی جھلاتی ہوئی اس
کے پاس آئی اور باتیں کرنے لگی۔نصیباں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اُدھر دیکھا،
جہاں اس بچّی کے ماں باپ بیٹھے تھے۔یہ نظیف تھا، ملک کا seasoned (پختہ کار)
بیوروکریٹ۔کنپٹی کے سفید بال، اسے اور زیادہ باوقار بنا رہے تھے۔پاس میں اس کی بیوی
بیٹھی تھی گہرے گلے، اور بغیر بازو والی شرٹ پہنے، بے باک قہقہے لگاتی ہوئی۔یہ نظیف کی
وہی ماموں زاد تھی جس کے خواب، شیما کی وجہ سے ادھورے رہ گئے تھے۔نصیباں نے
ایک لمبی سی ہوں۔۔۔ں۔۔۔ں کی اور حسب عادت بچّی کا انٹرویو لینا شروع کیا۔

''تمہاری دادی بھی ساتھ آئی ہیں؟''

بچّی اپنی عمر سے زیادہ ہوشیار تھی، اس نے چٹاخ سے جواب دیا۔

''نہیں، ممّا نے ڈیڈ کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یا تو دادو جائیں گی یا پھر میں۔۔۔
پھر ظاہر ہے ممّا کو ہی آنا تھا۔۔۔'' بچّی کھلکھلائی۔''کیونکہ، ڈیڈ، کبھی بھی ممّا کو dictate
نہیں کر سکتے۔''

تھوڑی دیر کے بعد، شیما کمرے سے باہر آئی تو بچّی بھاگتی ہوئی اس کے پاس گئی۔

''آنٹی، آپ کا نام شیما ہے نا!''

لگتا تھا وہ اسی کے انتظار میں تھی۔شیما نے نظیف پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔

''نہیں۔۔۔میرا نام ادھوری عورت ہے۔۔۔میں انسانی نفسیات نہیں سمجھتی۔۔۔
میں بہت خوش ہوں۔۔۔اور میرے پاؤں ننگے نہیں ہیں۔''

شیما نے بہت عام سے لہجے میں کہا۔

○○○

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے

(چند یادیں)

مشتاق احمد یوسفی

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کو ہم ایک اچھی اور سچی آپ بیتی ان معنوں میں
کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ نے جو کچھ دیکھا، بالخصوص بچپن کی آنکھ سے، اسے اپنے دِلنشیں پیرائے
میں، بغیر کسی رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کے پیش کرتی چلی گئیں۔اسے یادوں اور یاد آوری
کا خوب صورت، سیپیا رنگ کا مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں ان کی یادوں میں Total recall یعنی
جزئیات و کیفیات کی باز آفرینی کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔یہ کتاب اس زمانے کے
مہذب، مڈل کلاس معاشرے کے رسم و رواج، اقدار، ادب آداب اور رہن سہن کے سچے اور
دِلکش Thumb nail Sketch کا مجموعہ ہے۔مصنفہ کے لہجے میں حزن و ملال کی زیریں
لہر بھی محسوس ہوتی ہے جو قاری کے تبسمِ زیرِ لب کو بہت جلد گلوگیر کیفیت میں بدل دیتی ہے۔
والدین اور بھائیوں کی موت کے غم کی تصویر کھینچتے کھینچتے، اچانک وہ اپنے برش
سے ایسا Stroke لگاتی ہیں جو دِل پر پنجے گاڑ دیتا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ format کے اعتبار سے، یہ

ناول یا مختصر افسانوں کی تعریف میں نہیں آتی۔ روایاتی اِصطلاح میں اسے سوانح حیات بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ساری کتاب یادوں پر مشتمل ہے اور ہر یاد اپنا format اور لب ولہجہ ساتھ لاتی ہے۔

کسی بھی کتاب کی بنیادی اور سب سے نمایاں خوبی اس کی مطالعیت ہوتی ہے جو صفحۂ اوّل سے آخری صفحہ تک پڑھنے والے کی دِل چسپی برقرار رکھ سکے 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' اس معیار پر اپنے سادہ اور بے ساختہ اندازِ بیان کے باوجود پوری اُترتی ہے۔

حمید اختر

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کی مصنفہ نے اپنے بچپن کی یادوں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے اور بظاہر معمولی واقعات اس طرح قلم بند کیے ہیں کہ یہ واقعات، متوسط طبقے کے ایک بھرے پُرے خاندان کی روزمرہ زندگی کا جیتا جاگتا عکس بن کر مجسم شکل میں سامنے آتے اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

حسن نثار

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' نہ ناول ہے نہ افسانوں یا افسانچوں کا مجموعہ، یہ ایک عجیب وغریب سی Non-book قسم کی کتاب ہے۔ ایک بچی کے بچپن 'لڑکپن' اور جوانی کی گھریلو قسم کی یادوں پر مشتمل جھلکیوں کا مجموعہ ہے جو آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ چھڑک دیتا ہے۔

جمیل صدیقی

جن خواتین وحضرات نے ۵۰ اور ۶۰ کی دہائی میں سانس لیا ہے۔ ان کے لیے 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' ان کی اپنی اپنی آپ بیتی بن کر اپنی اثر انگیزی دِکھاتی ہے اور دِلوں کو گداز اور آنکھوں کو نم کر دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔